کالی ماتا کے پجاری

محمد ذوالفقار خان غوری

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

کالی کے قدیم مندر کے اندر بڑی بڑی مشعلوں کی روشنی میں کالی دیوی کا بُت اپنی ہیبت ناکی اور دہشت کے ساتھ کھڑا تھا — خون آلود زبان باہر نکلی ہوئی، آنکھوں میں خون، ہاتھوں میں انسانی کھوپڑیاں اور سیاہ کالے رنگ کا بُت — بہت سے لوگ اس کے سامنے حاضر تھے۔ کچھ گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے اور کچھ ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔

پچھمن نے تیزی سے جھک کر کالی دیوی کے ٹھنڈے اور سخت سنگی پیروں کو پکڑ کر ماتھا ٹیکا اور پھر آنکھیں بند کر کے دُعا مانگنے لگا۔ دُعا مانگتے ہوئے اُس کا چہرہ کچھ کم کرخت نظر آ رہا تھا ورنہ اُس کا چہرہ بہت بھیانک اور کرخت تھا۔ اُس کی بڑی بڑی مونچھیں اُس کی قلموں سے

جا رہی تھیں۔ اس کا جسم بھی بڑا تھا اور ہاتھ پاؤں بھی۔ وہ یقیناً ایک طاقتور اور دہشت پھیلانے والا شخص تھا۔ اس کی عمر بیس بائیس برس ہوگی۔

دعا مانگنے کے بعد اس نے کالی ماتا کے پجاری کو ایک نظر دیکھا۔ موٹا، ٹھنگنا، چٹیل چہرے والا پجاری اسے تجسس بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ بھیمن اس کے پاس گیا اور کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے چاندی کا ایک روپیہ نکالا۔ روپیہ ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ پجاری کی طرف بڑھایا۔ پجاری نے خوش دلی سے چاندی کا روپیہ لے کر اپنا ایک ہاتھ بھیمن کے کندھے پر رکھا اور کندھے کو ہلکے سے دبایا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ دونوں کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اور بھیمن نظریں جھکائے کالی کے قدیم مندر سے اُلٹے قدموں باہر نکل آیا۔

کالی کے مندر کے سامنے چھوٹا سا بازار تھا جو ترکاریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس بازار میں ایک چھوٹی سی سرائے بھی تھی جہاں بھیمن نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہیں اس کا گندمی رنگ کا گھوڑا بھی بندھا تھا۔ اپنے گھوڑے کو چارہ کھاتے دیکھ کر وہ خوش ہوا۔ اس نے گھوڑے کو تھپکی دی تو گھوڑا خوشی سے ہنہنا اٹھا۔ بھیمن چند لمحے اس کے پاس رکا پھر اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔

کوٹھڑی میں ایک دیا جل رہا تھا۔ دیواروں کو دیسی تیل سے جلنے والے دیئے کے دھوئیں نے کالا کر رکھا تھا۔ فرش پر اس کا بستر لگا ہوا تھا اور ایک دیوار کے ساتھ ایک گھڑونچی رکھی تھی جس پر ایک گھڑا اور مٹی کا پیالہ پڑا تھا۔ بھیمن نے پیالہ پانی سے لبالب بھرا اور اسے ایک ہی سانس میں ختم کر دیا پھر وہ فرش پر بچھے بستر پر لیٹ گیا۔

"میں نے جو قسم کھائی ہے وہ مجھے پوری کرنی ہے۔" اس نے کروٹ بدلتے ہوئے اپنے آپ سے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ اس کی آواز بھی اس کی طرح کھردری اور کرخت تھی۔

اس نے پھر کروٹ لی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خاصی بے چینی محسوس کر رہا ہے۔ یوں ہی کروٹیں لیتے اور بڑبڑاتے ہوئے وہ سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ چھوٹی سی کوٹھڑی اس کے خراٹوں سے گونجنے لگی۔

*

صوبہ بہار کے شمال میں ایک گاؤں کا نام پھول پور تھا۔ گاؤں کی کل آبادی پانچ چھ سو افراد تھی۔ آبادی کی اکثریت ہندوؤں کی تھی اور وہی اس گاؤں کی اراضی کے مالک تھے۔ مسلمانوں کے بمشکل بیس تیس گھر تھے۔ مسلمانوں کی تعداد سو سوا سو سے زیادہ نہیں تھی۔ گاؤں کے سارے پکے اور اچھے مکان ہندوؤں کے تھے۔ ہندو دکانداری کرتے تھے اور زمینوں کے مالک بھی تھے۔ مسلمان یا تو مزارع تھے یا پھر موچی، بڑھئی اور جولاہے وغیرہ۔ گاؤں کی حدود کے باہر چند گھرانے اور بھی تھے۔ یہ لوگ ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ یہ گاؤں کے اچھوت تھے جنہیں ہندو کبھی منہ نہ لگاتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات سرسری سے تھے لیکن مسلمان ان اچھوتوں سے ذرا ہچال لیتے تھے اور ان کی بات سن بھی لیتے تھے۔ اچھوتوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ کسی ہندو سے خود مخاطب ہو سکیں۔ وہ ہندوؤں کے حکم کے غلام تھے اور ہمیشہ ان سے کچھ فاصلے پر ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر عاجزی سے کھڑے ہوتے تھے۔

پھول پور کا بڑا زمیندار ہری تھا۔ اس کی اچھی خاصی حویلی تھی۔ سب سے زیادہ زمین اسی کی تھی۔ گھوڑے بھی تھے اور خوبصورت کتے بھی۔ گاؤں میں سب سے متمول گھرانہ ہونے کی وجہ سے ہر شخص ہری سے دب کر رہتا تھا۔ وہ لوگوں کا ان داتا بن بیٹھا تھا۔ سود پر قرض بھی دیتا تھا۔ پھول پور کے

نی فیصد مسلمان اس کے مزارعے تھے جو کھیتوں میں ہل چلاتے
ن کے لیے اناج اُگاتے اور فصل کاٹتے اور جب فصل
ٹ چکتی تو ہری اپنی مرضی سے انہیں اناج کا حصہ دیتا۔
سی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے فیصلے کو رد کر سکتا یا
ں کے سامنے اختلاف کر سکتا۔

ہری پلپلے جسم والا ہندو تھا۔ بے تحاشا بڑھی ہوئی
نہ چلتے وقت تھل تھل کرتی تھی۔ اس کا قد چھوٹا تھا اور
نگیں چھوٹی اور کمزور تھیں لیکن سر بہت بڑا تھا۔ وہ سر پہ
سی گہرے رنگ کی پگڑی باندھے مضحکہ خیز دکھائی دیتا
تا۔ اس کے چہرے پہ ہمیشہ رعونت چھائی رہتی جب وہ
یلی سے نکلتا تو دو ایک لٹھ بردار ملازم [illegible]
ساتھ ہوتے تھے۔ لوگ اسے دیکھ کر جھک جاتے اور
ستہ دے دیتے۔ اس کے مزاج کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔
بے وجہ جس پر چاہتا غصہ اتارنے لگتا۔ جسے چاہتا
انٹ دیتا، بے عزت کر دیتا۔ مسلمانوں کو بطورِ خاص ڈانٹنا
ر بے عزت کرنا اس کا مرغوب مشغلہ تھا۔ اپنے مسلمان
زارعوں سے وہ جتنا کام لیتا تھا اس کے بدلے میں کبھی
نہیں اتنا حصہ یا معاوضہ نہیں دیتا تھا۔

چھمن اسی کا بیٹا تھا.... اکلوتا بیٹا!

چھمن کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایسے
پلپلے اور بھدے شخص ہری کا بیٹا ہے۔ وہ اصل میں اپنی ماں
بسنتی پر گیا تھا جو راجپوت ہندو خاندان سے تھی.... بڑی
کڑیل اور طاقت ور.... اب بھی وہ ہٹی کٹی تھی۔ گہرا سانولا
رنگ اور سیدھا اونچا قد تھا۔ ہر کسی کو خوفزدہ رکھنے والا
ہری جو اس کا خاوند تھا ہمیشہ بسنتی سے خوفزدہ ہی رہا۔
بسنتی کا قد بت، چہرہ اور عادات ایسی تھیں کہ ہری شادی
کے پہلے دن سے ہی اس کے نیچے لگ گیا تھا جب کبھی
بسنتی کسی بات پر خفگی کا اظہار کرتی تھی تو ہری کانپنے لگتا اور
پسینے میں نہا جاتا تھا۔ زندگی بھر اس نے کوشش کی تھی کہ
بسنتی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ ایک ہی بیٹا پیدا کرنے
کے بعد ہری کی چیں بول گئی تھی اور بسنتی ابھی تک جوانی
کے آثار اور دل کشی لیے ہوئے تھی۔ وقت نے اس کے
مضبوط اور کڑیل جسم پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا جب کہ ہری
کا وزن بھی بڑھتا تھا اور وہ بدہیئت بھی ہو گیا تھا۔

چھمن اپنے گھوڑے سے اترا اور گھوڑے کو ملازم
کے سپرد کر کے اندر چلا گیا۔ ہری نے اُسے دیکھا۔ اُس کی
نگاہوں سے پتہ چلتا تھا کہ دل [illegible] وہ اپنے بیٹے
سے بھی ڈرتا ہے۔ بیٹے نے اسے جس لاپرواہی سے
پرنام کیا اس سے بھی صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے
باپ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

"کل سے آج نظر پڑے ہو" — ہری نے بیٹے سے
کہا — "رات بھی غائب...."

"کام سے گیا تھا" — بیٹے نے باپ کی بات پوری
نہ ہونے دی اور بولا — "گاؤں سے باہر!"

اس کے بعد نہ چھمن رُکا نہ باپ کو ہمت پڑی کہ وہ
بیٹے سے کچھ پوچھتا۔ چھمن سیدھا اپنی ماں کے کمرے میں
گیا۔ ماں بڑے کرّوفر سے تخت پوش پہ بیٹھی تھی اور ایک
ملازمہ اُس کے پاؤں دبا رہی تھی۔

"[illegible]" — بسنتی نے کہا — "تمھاری پتنی
بڑی پریشان تھی۔"

"اس کا کیا ہے؟" — چھمن نے بے رخی سے درشت
لہجے میں کہا — "رُوپا تو چاہتی ہے کہ میں ہر وقت اس
کے گھٹنے سے لگا بیٹھا رہوں۔"

"لیکن تم رہتے کہاں ہو؟" — بسنتی نے ہنس کر پوچھا
— "کل سے غائب ہو۔"

چھمن نے ملازمہ پر نگاہ ڈالی بسنتی نے ملازمہ سے

کہا کہ وہ چلی جاتے۔

"میں بھیرپور گیا تھا" ملازمہ چلی گئی تو لچھمن نے ماں کو بتایا۔ "کالی کے مندر منّت ماننے کے لیے۔"

بسنتی کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا۔

"منّت؟.... کیسی منّت؟" بسنتی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "اولاد کی خواہش نے تمھیں گمراہ کر دیا ہے۔ بیٹے کی منّت کے لیے کوئی کالی ماتا کے مندر تو نہیں جاتا۔"

"بیٹا.... اولاد!" لچھمن بڑے اطمینان سے اپنی ماں کے پاس تخت پوش پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "ماں.... بیٹا تو میرے لیے ناجو پیدا کرے گی۔"

"لچھمن!" بسنتی نے آہستہ سے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "تمھاری پتنی روپا سچ مچ رُوپ کی دیوی ہے اولاد کا کیا ہے ہو جاتے گی۔ روپا تمھارے بچوں کی ماں ضرور بنے گی۔ تم ناجو کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ تو...."

"میں جانتا ہوں جو تم کہنا چاہتی ہو" تیز طبیعت بیٹے نے ماں کی بات کاٹ دی اور اپنے بڑے بڑے ہاتھ اور بازو لہراتے ہوئے بولا۔ "یہی نا کہ ناجو مسلمان ہے.... مسلمان ہے تو کیا ہوا؟ میں شادی سے پہلے اُس کی شدھی کروں گا۔"

بسنتی چپ رہی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے گہرے آثار آگئے اور وہ پریشانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

"اور رُوپا...." کچھ دیر بعد ماں کہنے لگی۔

"رُوپا، رُوپا" بیٹا چڑ کر بولا۔ "اسے میں گھر سے کب نکال رہا ہوں۔ وہ بھی یہیں رہے گی۔ اُس کی ہر ضرورت پوری ہو گی۔"

بسنتی نے اپنے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ غصے کی وہ کتنا بدصورت اور نفرت انگیز دکھائی دے رہا تھا۔

"لیکن ناجو تم سے کیوں شادی کرنے لگی؟" بسنتی کچھ سوچ کر بولی۔

"میں اُسے شدھی کروں گا پھر شادی بھی ہو جائے گی" لچھمن بولا۔

"مگر کیسے؟"

"وہ ایسے کہ...." وہ رُک رُک کر بولا۔ "کالی ماتا میری مدد کرے گی۔"

وہ تیزی سے اُٹھا۔ اصل میں وہ اپنے ارادے کے بارے میں اپنی اس ماں کو کچھ بتانے کے لیے تیار نہ تھا جس سے وہ کبھی کوئی بات چھپانے کا عادی نہ تھا لیکن اب وہ اپنی ماں کو بھی بے خبر رکھ کر اپنا کام کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

لچھمن کی بیوی رُوپا اپنے کمرے میں تھی۔ وہ واقعی رُوپا تھی.... بہت خوبصورت، نازک سی.... لچھمن اس کے مقابلے میں بھوت دکھائی دیتا تھا۔ وہ میلی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ بال بھی اُلجھے ہوئے تھے۔ اس حال میں بھی وہ ہزاروں میں ایک تھی۔ اپنے پتی کو دیکھ کر وہ فوراً اُٹھی لیکن پتی لچھمن نے جھوٹے مُنہ بھی اس سے نہ پوچھا کہ وہ کس حال میں ہے لچھمن جوتے اُتار بستر پر لیٹ گیا۔

"تھکا ہوا ہوں" لچھمن نے کہا۔ "گرم دودھ لا دو.... دودھ پی کر سوؤں گا۔"

رُوپا سر جھکاتے چلی گئی اور چاندی کے گلاس میں دودھ لے آئی۔ لچھمن نے غٹاغٹ دودھ پیا۔ گلاس اسے پکڑایا اور پھر لیٹ گیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ خراٹے لے رہا تھا۔ بستر کی پائنتی پر بیٹھی رُوپا اُسے دیکھتی، سوچتی اور کُڑھتی رہی۔

یہ اُس کا پتی تھا.... خاوند.... جانوروں سے بدتر جس نے کبھی اس کے نازک جذبات کو سمجھنے کی کوشش

نہیں کی تھی۔ جانوروں کی طرح اُسے سلاتا تھا اور اب بہت دنوں سے اس کی طرف توجہ دینی بھی بند کر دی تھی۔ اُس کی طرف مسکرا کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔ رُدپا مجبور تھی۔ اپنے مذہب کے بندھنوں نے اُسے مجبور کر رکھا تھا کہ اپنے پتی کے سامنے زبان نہ کھولے، شکایت نہ کرے، بے زبان جانور بنی رہے۔ اُس نے جب کبھی لچھمن سے کچھ پوچھا لچھمن نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھا کرو، تمہارا کام میرے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہے" ـــــ یہ پھٹکار سن کر رُدپا کے کان پک گئے تھے۔

کہنے کو تو وہ حویلی کے وارث اور پھول پور کے جانشین کی بیوی تھی لیکن وہ دراصل حکم کی باندی بنا دی گئی تھی اور اس سے توقع کی جاتی تھی کہ سدھائے ہوئے جانور کی طرح اپنے خاوند کے اشاروں پر ناچے ..... بلا چون و چراں کسی شکایت کے بغیر!

*

لچھمن نے کالی دیوی کے سامنے جو منّت مانی تھی۔ اُسے جلد از جلد پورا کرنا چاہتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ کالی دیوی اس منّت کی تکمیل کے بعد اس سے خوش ہو گی اور ناجو خود بخود اس کی گود میں پکے ہوئے پھل کی طرح آگرے گی۔ کالی دیوی کو انسانی خون بہت مرغوب ہے اور لچھمن نے کالی دیوی کے قدموں میں ایک مسلمان کا خون بہانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کالی دیوی کے مندر کے پجاری کے ساتھ اس کا گٹھ جوڑ ہو چکا تھا۔ طے پایا تھا کہ جب لچھمن "قربانی" لے کر آئے گا تو پجاری مندر کو دوسرے یاتریوں سے خالی کرا دے گا اور یوں لچھمن اس مسلمان کا سر کاٹ کر کالی دیوی کے قدموں پر نچھاور کر دے گا۔

لچھمن یہ بھی فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کس مسلمان کی قربانی دینی ہے۔

*

ناجو قدرت کا ایک شاہکار تھی۔ اس کا سراپا بیان کرنا مشکل کام ہے۔ وہ نازک بھی نہیں اور کڑیل بھی نہیں تھی۔ متناسب جسم تھا جو حسن کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس کی چال ڈھال اور گفتار میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور توازن تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پھول پور کے ایک مسلمان مزارعے اسماعیل کے گھر نہیں بلکہ کسی راجے مہاراجے کے ہاں پیدا ہوئی تھی۔ وہ موٹا جھوٹا جیسا لباس بھی پہنتی تھی۔ اس کے جسم پر پھب جاتا تھا۔ وہ بہت سُگھڑ تھی۔ گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی، اپنے چھوٹے بھائی ابراہیم کی دیکھ بھال کرتی جس کی عمر دس برس تھی۔ وہ گھر سے باہر بہت کم نکلتی تھی۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ جہاں اپنے حسن و جمال کی کشش سے آگاہ ہو چکی تھی وہاں یہ بھی جانتی تھی کہ گاؤں میں ہندوؤں کی حکمرانی ہے اور مسلمان بے بس اور مجبور ہیں۔

اُس نے لچھمن کو کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا، تاہم لچھمن کے بارے میں وہ جان گئی تھی کہ وہ اس کی تاک میں رہتا ہے۔ ایک دو بار لچھمن نے راستہ روک کر اس سے بھونڈے انداز میں اظہار محبت کی بھی کوشش کی تھی۔ ناجو نے اس کا ذکر اپنی ماں سے کیا تو اس کی ماں نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ محتاط ہو جائے اور اپنے باپ سے اس کا بالکل ذکر نہ کرے۔ اس سے جھگڑا بڑھ سکتا تھا۔

"تمہارا باپ بڑا غیرت مند ہے" ـــــ ماں نے کہا تھا ـــــ "وہ خود مر جائے گا یا لچھمن کو مار دے گا۔ ہم برباد ہو جائیں گے کہیں کے نہیں رہیں گے۔"

ناجو کے دل میں لچھمن کے لیے نفرت گہری ہو گئی تھی لیکن مجبور تھی۔ کسی نہ کسی کام سے گھر سے باہر نکلنا ہی پڑتا

تھا اور اکثر لچھمن اسے کسی نہ کسی راستے پر گھورتا ہوا کھڑا مل جاتا تھا۔

*

علاقے کا داروغہ پولیس ایڈورڈ دلچسپ انگریز تھا۔ اس کا پورا نام ایڈورڈ ہارنگ تھا۔ سب اسے ایڈورڈ صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ ہندوستان میں آئے اُسے تیس برس ہو چکے تھے اور بہت حد تک وہ ہندوستانی رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ مقامی زبان پر اسے پورا عبور حاصل تھا۔ وہ کھلے ڈھلے مزاج کا ایک چالاک اور زیرک آدمی تھا۔ اکثر گھوڑے پر سوار اپنے دو چار سپاہیوں کے ساتھ علاقے میں گشت کرتا رہتا تھا۔ اس نے مخبروں کا پورے علاقے میں جال بچھا رکھا تھا اور ان مخبروں میں اکثریت مسلمانوں اور اچھوتوں کی تھی کیونکہ علاقے میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور ہندو ہی خوشحال تھے۔ اس لیے جرائم بھی ہندو ہی زیادہ کرتے تھے۔

ایڈورڈ جب بھی پھول پور آتا تو پھول پور کے بڑے زمیندار ہری سے ضرور ملتا تھا۔ ہری اس کی خدمت تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔ انگریز حاکم اور پھر خاص طور پر پولیس کے اعلیٰ افسر سے بنائے رکھنا زمینداروں کے مفاد میں جاتا تھا۔ لچھمن پر ایڈورڈ صاحب کی ایک عرصے سے نظر تھی۔ علاقے کے مخبر لچھمن کے غرور اور غلط برتاؤ کی کئی بار شکایت کر چکے تھے۔ بھیرپور سے بھی ایک مخبر نے اطلاع دی تھی کہ لچھمن کالی کے مندر میں گیا اور وہاں اس نے ایک سرائے میں قیام کیا تھا۔

پھول پور میں داروغہ ایڈورڈ کی ملاقات ہری کے علاوہ لچھمن سے بھی ہوئی۔ ہری دب کر، چالاکی اور مکاری سے بچ بچا کر داروغہ سے ملتا تھا۔ لچھمن کا انداز اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ ایڈورڈ صاحب کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اُسے گاؤدی سمجھتا تھا۔ اس انداز کو ایڈورڈ نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم دیجیے" — لچھمن نے ایڈورڈ سے پوچھا۔

"کسی چیز کی ضرورت نہیں" — ایڈورڈ صاحب نے جواب دیا — "تم سناؤ کیا ہو رہا ہے؟"

"بس زمینداری کے کام کرتا ہوں صاحب!" — لچھمن نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"تم جوانی میں ہی مذہبی آدمی بن گئے ہو" — ایڈورڈ نے کہا — "وہ بھی کالی کے پرستار!"

"ہاں صاحب بہادر!" — لچھمن چونکا پھر بظاہر بے نیازی سے بولا — "میں کالی کے مندر میں ایک منّت ماننے گیا تھا.... اجازت ہے صاحب بہادر؟" — اور وہ اکڑتا ہوا چلا گیا۔

داروغہ ایڈورڈ کو غچہ دینا آسان نہیں تھا وہ ہندوؤں اور ہندوستان کے رسم و رواج اور دیوی دیوتاؤں سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کالی دیوی کے لیے کیسی منّت مانی جاتی ہے۔ لچھمن نے اپنے غرور میں خود ہی اپنا بھانڈہ پھوڑ دیا تھا۔ اب کارروائی کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے پھول پور میں متعین اپنے سپاہیوں کو خفیہ ہدایات دیں۔ مخبروں کو بھی چوکنا کر دیا اور پھول پور سے آگے گشت پر نکل گیا۔

*

لچھمن کھیتوں میں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی تھی اور رات پر سناٹا طاری تھا۔ لچھمن بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کی بیوی روپا اس کے دل سے اُتر چکی تھی اور ناجو کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر چکا تھا۔ ناجو کا باپ اسماعیل

ام مزارعہ نہیں تھا بلکہ وہ ان کی زمینوں کا کاردار (منیجر) تھا۔
ام مزارعے اس کے ماتحت تھے۔ اس کا ہری کی حویلی
ں آنا جانا عام تھا۔ ہری اور بسنتی اسماعیل کا خاص خیال رکھتے
تھے لیکن مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ اسماعیل کو کبھی اپنے
س بیٹھنے نہ دیتے۔ نہ کسی چیز کو چھونے کی اجازت دیتے۔
ہندو ہمیشہ اپنے مفاد کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ اسماعیل
ست اچھا منتظم، محنتی اور ایماندار تھا۔ اسے ناراض کرنا
ری کے مفاد میں نہیں تھا۔ ہری کو البتہ کئی بار یہ احساس
وا تھا کہ اس کی بیوی بسنتی بعض اوقات اسماعیل پر ضرورت
ے زیادہ مہربان ہو جاتی ہے۔ اس خیال سے ہری کا دل
ل اٹھتا تھا لیکن وہ اپنی زور آور بیوی کو کسی بات پر ٹوکنے
جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

لچھمن کو یہ بھی اندازہ تھا کہ ناجو کو وہ اغوا نہیں کر سکتا۔
ں کی آبرو لوٹ کر وہ علاقے کے مسلمانوں کی دشمنی مول لے
حالات خراب کر سکتا ہے۔ وہ تو ناجو کو ہمیشہ کے لیے
پنا بنانے کے خواب دیکھتا تھا اور اسے ہندو کر کے
پنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں گاؤں کے برہمن
سے بھی ضروری معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس نے ناجو کا
ام نہیں لیا تھا۔ تاہم مندر کے پنڈت نے اسے بتایا تھا کہ
خاص رسمیں ادا کر کے کسی مسلمان عورت کو شدھ کیا جا سکتا
ہے اور کسی مسلمان کو ہندو بنا کر لچھمن بڑے پن (ثواب)
کا کام کرے گا۔

علاقے میں کالی ماتا کا مندر جانے کب سے تھا۔ لچھمن
نے کالی ماتا کی ہیبت، دہشت اور طاقت کی ان گنت
کہانیاں سنی تھیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کالی ماتا ہر اس شخص
کی دلی مراد پوری کر دیتی ہے جو اس کے قدموں میں کسی غیر ہندو
کی قربانی دے۔

جب سے اس پر ناجو کے عشق کا بھوت سوار ہوا
تھا اس نے کالی ماتا کو زیادہ ہی یاد کرنا شروع کر دیا تھا اور
سب کچھ سوچ کر اس نے کالی دیوی کے مندر میں جا کر
منت مان لی تھی۔

وہ ناجو کے بھائی ابراہیم کی قربانی دینا چاہتا تھا۔
اس نے سن رکھا تھا کہ جس کسی کا دل جیتنا ہو اگر اس کے
کسی عزیز اور پیارے کی قربانی کالی دیوی کے چرنوں
میں دی جائے تو کالی دیوی بہت خوش ہوتی اور دل کی مراد
پوری کر دیتی ہے۔

وہ اجلی اجلی چاندنی میں درخت کے ساتھ ٹیک لگائے
شاندار سنہرے خواب دیکھ رہا تھا — ناجو اس کی بن گئی
ہے۔ اس کے بے پناہ حسن کا وہ مالک بن گیا ہے۔ وہ اس
کے ہر حکم کی تعمیل کر رہی ہے۔

وہ اٹھا اور اس نے بلند آواز میں کہا — "ہاں، میں
کل رات اپنی منت پوری کر دوں گا۔"

اس کی آواز چند لمحوں کے لیے سناٹے میں گونجی
اور پھر سناٹا چھا گیا۔

*

لچھمن بہت کچھ نہیں جانتا تھا۔
اس کا باپ ہری بھی نہیں جانتا تھا۔

راجپوتوں کے خاندان کی کڑیل اور جوان لڑکی جب
ہری سے بیاہ کر پھول پور آئی تھی تو دیکھنے والوں نے پہلی
نظر میں ہی اس بے جوڑ شادی کو محسوس کر لیا تھا۔ پلپلے
اور زرد جسم والے ہری کے سامنے بسنتی طاقت کا ایک
پہاڑ تھی۔ شادی کے بعد بسنتی کو بھی جلد ہی احساس ہو گیا کہ
اس کا خاوند اس کے جوڑ کا نہیں ہے لیکن وہ کچھ نہیں کر
سکتی تھی۔ اپنی حسرتوں پر کڑھتی رہتی تھی۔ اس گاؤں میں وہ
نئی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے آس پاس کے آنے جانے
والوں کا جائزہ لیا۔

اسماعیل زمیندار کا کاردار تھا.... لوہے کا بنا ہوا مضبوط آدمی .... وہ اس پر فریفتہ ہو گئی۔ آتے جاتے اس سے بات کر لیتی۔ اسے وہ لبھانے کی کوشش کرتی۔ تب اسماعیل کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اپنی مالکن کے اشاروں کو وہ جلد ہی سمجھ گیا تھا اور پھر بسنتی نے ایک دن اسے شکار کر لیا۔ دونوں جوان تھے اور ترغیب کے ان لمحوں کو بسنتی بہت قریب لے آئی تھی۔ ان کے یہ تعلقات زیادہ دیر نہ چل سکے۔ ویسے بھی یہ بہت خطرناک اور چوری چھپے کا کھیل تھا۔ اسماعیل کو بھی اپنی غلطی کا جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا، اس لیے اس نے بہت جلدی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ بسنتی اس کے رویے پر حیران ہوئی۔ لیکن اسماعیل نے اسے دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ وہ اب اس کھیل کو جاری نہیں رکھ سکتا۔

"میں اپنے دل پر گناہ کا بوجھ محسوس کرتا ہوں" —— اس نے کہا تھا۔

وہ جو کبھی موم بن کر پگھل گیا تھا، اب اس نے اپنے آپ کو ایسے پتھر کی طرح سخت بنا لیا، جس میں ترغیب اور ہوس کی جونک نہیں لگ سکتی تھی۔ بسنتی بہت دنوں تک تلملاتی رہی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ ہری سے شکایت کر کے اسماعیل کو ذلیل کرا دے لیکن اپنے اس ارادے پر عمل نہ کر سکی۔

اور پھر لچھمن پیدا ہوا۔

زمیندار ہری کی حویلی میں جشن منایا گیا لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ نومولود اس کا بیٹا نہیں۔ اسماعیل کو بھی یہ علوم نہ ہو سکا کہ لچھمن اس کے اور بسنتی کے تعلقات کی پیداوار ہے۔

پھر اسماعیل کی شادی ہو گئی اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ حویلی میں بسنتی سامنے بھی ہوتی تو اسے یاد نہ آتا کہ کبھی اس کی اس سے رسم و راہ تھی۔ وہ ان دنوں کو اپنے دل سے نکال چکا تھا۔

*

ابراہیم جب گلی کا موڑ مڑا تو اسے لچھمن نے روک لیا۔ دس سال کا ابراہیم بہت پیارا لڑکا تھا۔ اپنے دیہاتی لباس میں بھی وہ دیکھنے والوں کو بہت متاثر کرتا تھا۔ لچھمن کے لیے اس کے دل میں نفرت اور خوف تھا لیکن وہ اس کی بات سنے بغیر آگے نہیں جا سکتا تھا۔

"تمھیں طوطوں سے محبت ہے؟" —— جس حد تک نرم لہجے میں لچھمن بات کر سکتا تھا اس نے اپنے لہجے کو اس حد تک نرم بنا کر پوچھا۔

واقعی ابراہیم کو طوطوں سے بہت محبت تھی۔ اس نے گھر میں ایک طوطا پال رکھا تھا۔

"ہاں" —— اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"میرے ساتھ چلو" —— لچھمن نے پیار سے کہا —— "میں نے تمھارے لیے باتیں کرنے والا ایک طوطا پکڑا ہے"

"سچ؟" —— ابراہیم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، میرے ساتھ چلو" —— لچھمن نے کہا —— "میں تمھیں وہ طوطا دے دوں گا"

طوطے کے لالچ میں ابراہیم لچھمن کے ساتھ چل پڑا۔ شام ہونے والی تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ تاریکی چھا رہی تھی۔ گلیاں سنسان تھیں۔ جب وہ گاؤں سے باہر نکلے تو ابراہیم اچانک رک گیا۔ وہ سہم گیا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" —— اس نے پوچھا۔

"بس وہ سامنے کھیتوں میں ہمارے ڈیرے تک؟" —— لچھمن نے کہا —— "طوطا وہیں ہے"

ابراہیم کھڑا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تاریکی میں اس کے ساتھ جائے یا نہ جائے لیکن طوطے کا خیال اسے کوئی فیصلہ کرنے نہیں دے رہا تھا۔

"چلو" —— لچھمن نے اس کا بازو پکڑ کر کہا —— "ابھی واپس

آجائیں گے.... طوطا پنجرے میں ہے۔ پنجرہ نیا ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔"

لچھمن نے اس کا بازو نہیں چھوڑا اور دونوں چل پڑے۔ ڈیرے پر پہنچ کر لچھمن نے ابراہیم کو چارپائی پر بٹھا دیا۔

"میں اندر سے طوطا لاتا ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں رسّی تھی۔

"آواز نکالی تو جان سے مار دوں گا"۔۔۔ اُس نے خوفناک آواز میں کہا۔

ابراہیم تھر تھر کانپنے لگا۔ لچھمن نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور پھر اس کے بعد وہ پھر ڈیرے کے اندر گیا اور ایک بورا لے کر آیا۔ اس نے بورے کا منہ کھولا اور اس میں ابراہیم کو بند کر کے بورے کا منہ رسّی سے باندھ دیا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر دیکھا۔

اُس کا گھوڑا تیار تھا۔ اُس نے بورے میں بند ابراہیم کو گھوڑے کے اوپر رکھا، خود گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑے کو دوڑانے لگا۔

*

اسماعیل نے سارا گاؤں چھان لیا لیکن اسے اپنے بیٹے ابراہیم کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس کی بیوی اور بیٹی ناجو رو رہی تھیں۔ وہ خود بھی بہت پریشان تھا۔ آخر ابراہیم گیا کہاں؟

وہ گاؤں کی پولیس کے پاس گیا۔ ایک سپاہی نے دوسرے سے کچھ کہا اور وہ سپاہی فوراً وہاں سے کہیں چلا گیا۔ جب تک وہ واپس نہیں آیا۔ اسماعیل کو وہاں روکے رکھا گیا۔ سپاہی نے آکر دوسرے سپاہی سے سرگوشی میں کچھ کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو"۔۔۔ اس سپاہی نے اسماعیل سے کہا۔ "ایڈورڈ صاحب ساتھ والے گاؤں میں ہیں۔ تمھارا اس صاحب بہادر سے ملنا بہت ضروری ہے فکر نہ کرو، تمھارا بیٹا مل جائے گا۔"

اسماعیل پہلے اپنے گھر گیا۔ بیوی اور بیٹی کو بتایا کہ وہ ایڈورڈ صاحب سے ملنے جا رہا ہے۔ انشاءاللہ ابراہیم کو اپنے ساتھ واپس لائے گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اور سپاہی دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار پھول پور کی حدود سے نکل رہے تھے۔

*

ابراہیم بورے میں بند تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ اُس کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ اُس کے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ بہت خوفزدہ تھا۔ دس برس کا بچہ یہ سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ اُس کے ساتھ یہ کیا ہوا ہے۔ اسے کیوں اس طرح باندھا گیا ہے اور اب وہ کہاں لے جایا جا رہا ہے اور کیوں؟ اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہ تھا۔ خوف بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

لچھمن مطمئن اور خوش تھا۔ وہ ابراہیم کو اُڑا لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس کا گھوڑا طاقتور اور تیز رفتار تھا۔ آدھی رات سے پہلے وہ بھیر پور پہنچ سکتا تھا۔ کالی کے مندر کے بڑے پجاری سے بات طے تھی۔ وہ آج منت پوری کر سکتا تھا۔ اُسے سو فیصدی یقین تھا کہ منت پوری ہوتے ہی ناجو خود اُس کے پاس آجائے گی۔

وہ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا جا رہا تھا۔

*

ایڈورڈ صاحب نے سپاہی کی بات سنی۔ لچھمن گاؤں میں موجود نہیں تھا۔ ایڈورڈ نے اسماعیل کی طرف دیکھا۔ اسے تسلی دی۔ گھوڑے بدلے گئے۔ ان کا نیا سفر شروع ہوا۔ ایڈورڈ جانتا تھا کہ اُسے کہاں جانا ہے۔

نصف شب ہونے والی تھی جب چھمن نے گھوڑا سرائے کے سامنے روکا۔ سرائے کے مالک نے اس کے لیے فوراً ایک کوٹھڑی کھول دی۔ بورے میں ابراہیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ بورا اٹھا کر چھمن کوٹھڑی میں لے گیا۔ گھڑے سے دو تین گلاس پانی پیا۔ اس کے بعد وہ باہر نکلا۔ کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے مقفل کیا اور تیز تیز چلنے لگا۔

کالی کے مندر کے باہر کئی لوگ جاگ رہے تھے۔ کچھ اونگھ رہے تھے اور بعض سو رہے تھے۔ وہ مندر کے اندر چلا گیا۔ کالی کی مورتی کے سامنے کئی لوگ پوجا میں مصروف تھے۔ اسے بڑے پنڈت کو تلاش کرنے میں کئی منٹ لگ گئے۔ پنڈت مندر کے کسی اندرونی حصے میں گیا ہوا تھا۔ پنڈت ملا تو چھمن اس کو ایک طرف لے گیا۔ اس سے سرگوشیوں میں بات کی۔ پنڈت کا چہرہ کھل گیا۔ وہ سرگوشیوں میں سر ہلا ہلا کر بات کر رہا تھا۔

چھمن مندر سے باہر نکلا تو پوری طرح مطمئن تھا۔

*

اسمٰعیل بہت پریشان تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ایڈورڈ صاحب اسے کہاں لیے جا رہا ہے۔ اسے کچھ بھی بتایا نہیں گیا تھا اور جب اس نے ایک دو بار پوچھا تو ایڈورڈ صاحب نے نرمی سے کہا تھا۔ "تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔ گھوڑے کی رفتار تیز کرو۔ وقت بہت کم ہے۔"

بھیرپور میں ایڈورڈ صاحب کے مخبر نے اسے اطلاع دی کہ چھمن بھیرپور میں موجود ہے۔ یہ اطلاع بہت اہم تھی۔ جب وہ کالی کے مندر کے قریب پہنچے تو اسمٰعیل کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"تم اس سپاہی کے ساتھ مندر کے باہر ہی رہو گے" —— ایڈورڈ صاحب نے اسمٰعیل سے کہا۔ "تم مسلمان ہو۔ مندر میں تمہارا اندر جانا مناسب نہیں۔"

اسمٰعیل بے بس تھا کہ اس حکم کی تعمیل کرے۔ اس کے خوف اور اندیشے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

*

چھمن وہ بورا مندر کے اندر لا چکا تھا جس میں ابراہیم بند تھا۔

"تم بڑے دروازے کے پاس رہو گے" —— بڑے پنڈت نے اپنے دو پجاریوں سے کہا۔ "جب تک میں نہ کہوں کسی کو اندر نہ آنے دینا۔"

اس کے بعد پنڈت کالی کے بت کے سامنے پوجا کرنے والے لوگوں کے قریب چلا گیا۔

"اب تم لوگ باہر چلے جاؤ" —— پنڈت نے پوجا کرنے والوں سے کہا۔ "کالی میا کو غسل دیا جائے گا۔"

ابراہیم بے ہوش تھا اور بورا مندر کے اندر ایک

کوٹھڑی میں پڑا تھا۔

جب مندر ہر آدمی سے خالی ہو گیا تو مندر کا بڑا دروازہ بند کر دیا گیا۔ مندر کے خالی ہونے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ رات کا سفر ختم ہونے والا تھا۔ آخری پہر تھا۔ مندر کے بڑے پنڈت نے لچھمن کو اشارہ کیا۔ لچھمن بورا اُٹھا کر مندر میں لے آیا۔ اب وہ بے حس و حرکت بورا کالی ماتا کے قدموں میں پڑا تھا۔

بڑا پنڈت ایک تیز اور خوفناک کلہاڑا پکڑے اس پر منتر پڑھ رہا تھا۔ قربانی سے پہلے کی پُراسرار رسم ادا کی جا رہی تھی۔ لچھمن کا بھیانک چہرہ اور بھی بدہیئت دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بڑے پنڈت کے طول پکڑتے ہوئے منتر سے زنج ہونے لگا تھا۔

بالآخر پنڈت نے منتر ختم کیا۔

"اب تم کالی ماتا کے چرنوں میں قربانی دے سکتے ہو"۔۔۔ پنڈت نے لچھمن سے کہا۔

لچھمن نے بورے سے ابراہیم کو نکالا۔ اس کا رنگ پیلا ہو گیا تھا اور وہ ابھی تک بیہوش تھا۔ لچھمن نے بڑے پجاری کی طرف دیکھا۔

"یہ اور بھی اچھا ہے"۔۔۔ بڑے پنڈت نے کہا۔ "آواز نہیں نکالے گا اور تم بھینٹ چڑھا دو گے"۔

بے ہوش ابراہیم کو گھسیٹ کر لچھمن نے اس کا سر کالی ماتا کے پتھر کے قدموں میں رکھ دیا۔ کالی ماتا کی سُرخ لٹکتی زبان، خوفناک آنکھیں، کالا دھوت رنگ اور ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کھوپڑیاں، منظر کو بہت ہیبت ناک بنا رہی تھیں۔ لچھمن نے بڑے پنڈت کے ہاتھ سے کلہاڑا پکڑا۔

اُسی لمحے شور سنائی دیا۔ لچھمن نے کلہاڑا اوپر اٹھایا تاکہ ابراہیم کی گردن پر پوری طاقت سے وار کر سکے۔

باہر سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں اور اسی لمحے پولیس کا انگریز افسر ایڈورڈ صاحب اپنے سپاہیوں کے ساتھ مندر کے اندر داخل ہو گیا۔

لچھمن نے کلہاڑا گرایا نہیں۔ وہ کھڑا رہا، کلہاڑا اس کے سر سے اوپر اٹھائے ہوئے۔ بڑے پنڈت نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن آگے سپاہیوں نے قابو کر لیا۔

*

اس سچے واقعے کا چرچا صوبہ بہار میں مدتوں ہوتا رہا۔ داروغہ ایڈورڈ صاحب نے جو مقدمہ تیار کیا وہ بہت مضبوط تھا۔ اس واردات کی تفتیش اور مقدمے کی کارروائی اور جرح کے دوران بہت سے انکشافات ہوئے جن کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔

یہ راز کہ لچھمن اسماعیل اور بسنتی کے تعلقات کا نتیجہ تھا، عدالت میں سامنے نہیں آیا۔ اس راز کا علم تو داروغہ ایڈورڈ کو اپنی تفتیش کے دوران ہُوا تھا پھر بھی عدالت میں اس کا ذکر نہیں ہُوا کیونکہ ایڈورڈ صاحب اسماعیل کے ہنستے بستے گھرانے کو تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لچھمن کو عمر قید کی سزا ہوئی اور وہ جیل میں ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر چند برسوں میں مر گیا۔ اس کا غرور اور کالی دیوی پر اس کا یقین اس کی موت کا باعث بنا۔

ابراہیم بڑا ہو کر پولیس میں ملازم ہو گیا۔

ہری کا گھرانہ تباہ ہو گیا۔ لچھمن کی موت کے بعد ہری بھی مر گیا۔ جائیداد کا کوئی وارث نہ تھا اور ہندوؤں میں عورت کو خاوند کی جائیداد کا وارث نہیں بنایا جاتا اس لیے ساری جاگیر پر ہری کے رشتے داروں نے قبضہ کر لیا۔ بسنتی کچھ عرصے کے بعد اپنے میکے چلی گئی اور بیوگی کی زندگی بسر کرتی رہی۔

نئے زمینداروں نے بھی اسماعیل ہی کو اپنا کاردار بنائے رکھا۔ ناجو کی شادی بڑی سادگی سے ہوئی۔ مدتوں اس کے حُسن و جمال کا شہرہ رہا۔

ابلیس کے چیلے کی ایک خوفناک کہانی

شیطان کا پجاری

لیو ٹالسٹائی

یوجین کا والد جب فوت ہوا تو وہ اپنی عمر کی چھبیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ وہ درمیانے قد اور مضبوط بدن کا توانا نوجوان تھا۔ اس کی بینائی کمزور تھی اور چشمہ مسلسل استعمال میں لاتا تھا۔ اس کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور دلکشی تھی۔ معاشرے میں اسے اچھی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس سے ملنے جلنے والے لوگ اسے دل سے چاہتے اور پسند کرتے تھے۔

یوجین کے پیشِ نظر ایک درخشندہ مستقبل تھا۔ اس نے پیٹرزبرگ کی یونیورسٹی سے قانون کا امتحان اچھے نمبروں میں پاس کیا تھا۔ اس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اس کے تعلقات امرا کے طبقے سے استوار ہو گئے تھے۔ اسی دوران اس کا والد فوت ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد پتہ چلا کہ وہ قرض کے بوجھ تلے بری طرح دبا ہوا تھا۔ اتنا قرضہ

واجب الادا تھا کہ جب یوجین نے اپنے قانونی مشیر سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ بہتر ہے کہ تم جائداد سے دست کش ہو جاؤ۔ یوجین اس قانونی مشورے پر عمل درآمد کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا مگر جب ایک ہمدرد ہمسائے سے مشورہ کیا گیا تو وہ از رہِ ہمدردی کہنے لگا:

"یوجین جائداد سے دستبردار کیوں ہوتے ہو؟ تمہیں چاہیے اس کے بجائے تن دہی اور استقلال سے اس کا موزوں انتظام کرو۔ اگر تم اس میں کامیاب ہو جاؤ تو تمہاری جائداد بھی بچ جائے گی اور تمہارے والد کا قرضہ بھی ادا ہو جائے گا۔"

یوجین نے پڑوسی کا مشورہ قبول کر لیا اور جائداد اور والد کے کارخانے کے انتظام میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس کا والد کوئی اچھا منتظم ثابت نہ ہوا تھا۔ یوجین کا دادا اس

معاملے میں بڑا دانا تھا۔ یوجین نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلے گا چنانچہ اس نے بڑی جانفشانی سے جائداد اور کارخانے کا انتظام لیا۔ اس کے جنگل کا کچھ حصہ تو فروخت کر دیا مگر باقی جائداد کو اس نے تباہ ہونے سے بچا لیا۔

اس کا کاروبار بڑی تیزی سے چلنے لگا لیکن اس کے دل میں بھی جوانی کی اُمنگیں اور ارمان موجزن تھے۔ وہ جب نوجوان جوڑوں کو دیکھتا تھا۔ تو یہ خواہش اس کے دل میں کروٹیں لیتی تھی کہ میں ان کی طرح عورتوں سے راہ و رسم پیدا کروں۔ گو وہ عیش پرست نہ تھا لیکن زاہدِ خشک بھی نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جسمانی اور ذہنی تندرستی کے لیے عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا بڑا ضروری ہے۔ اگر وہ پیٹرز برگ جیسے بڑے شہر میں ہوتا تو اس قسم کے تعلقات کے بڑے مواقع مل سکتے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ ایک گاؤں میں پڑا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے گاؤں کی کسی عورت سے تعلقات استوار کرے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو بڑا پریشان اور مجبور محسوس کرتا تھا۔ وہ سوچتا میں کس عورت کے پاس جاؤں؛ اس تک کس طرح رسائی حاصل کروں؟ تعلقات کس طرح بڑھاؤں۔ کس معتبر شخص کے ذریعے یہ کام نکالوں؛ جب اُسے ان سوالات کا جواب نہ ملتا تو وہ اور بھی پریشان اور مضطرب ہو کر رہ جاتا۔

ایک دن اتفاقاً سیر گشتی کرتا ہوا وہ اپنے چوکیدار دانیال کے جھونپڑے کے سامنے جا پہنچا اور اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں دانیال نے اسے بتایا کہ ایک مرتبہ اس نے ایک صاحب کے لیے جو شکار کھیلنے یہاں آئے تھے ...... ایک حسین عورت کا انتظام کیا تھا۔

یوجین دل میں بڑا خوش ہوا۔ اسے یوں معلوم ہونے لگا کہ عورت کا مشکل مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اس نے دانیال سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور جب وہ راضی ہو گیا تو یوجین کہنے لگا: "دیکھو دانیال مجھے دل بہلانے کے لیے ایک عورت چاہیے خواہ اس کا تعلق کسی طبقے سے کیوں نہ ہو۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ وہ بدصورت نہ ہو۔ بلکہ صفائی پسند، حسین اور تندرست و توانا ہو۔"

دانیال کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا: "سٹیپانیڈا کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا؟ وہ حسین ہے، سلیقہ مند ہے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس کا خاوند گاؤں میں نہیں بلکہ شہر میں رہتا ہے۔"

یوجین نے جواب دیا: "ہاں ہاں وہ ٹھیک رہے گی۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ دن بھر وہ بیخودی کے عالم میں سٹیپانیڈا کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ دل میں کہتا اب کیا کروں؟ اسے کس طرح ملوں؟ دیہاتی عورت ہے پتہ نہیں وہ کس قسم کی ہے۔

دانیال نے دونوں کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔ وہ سفید براق لباس پہنے اور سر پر سُرخ رومال باندھے اسے ایک باغ میں ملی۔ وہ ننگے پاؤں آئی تھی اور بڑی حسین لگتی تھی۔ اس میں ایک خاص قسم کی کشش تھی۔ یوجین کو یوں معلوم ہونے لگا کہ وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ باغ میں کچھ دیر رہے اور جب وہ جانے لگی تو یوجین نے اسے ایک روبل دیا۔

اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوجین کی پریشانی مفقود ہو گئی۔ اس کا ذہن پرسکون ہو گیا اور وہ مطمئن ہو گیا۔

اپنے والد کے قرض خواہوں کی فہرست کے پیشِ نظر اس نے اپنے ذاتی اخراجات میں کافی کمی کر دی۔ نوکروں کی تعداد گھٹا دی اور بڑی کفایت شعاری سے خرچ کرنے لگا اس کی والدہ بڑی فضول خرچ تھی۔ اسے اس کی کنجوسی پسند نہ آئی۔

یوجین نوجوان تھا اور شادی کے خواب دیکھا کرتا تھا لیکن اس کے لیے وہ یہ ضروری نہ سمجھتا تھا کہ لڑکی رئیس زادی ہو بلکہ اس کے برعکس اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ میری ہونے والی بیوی پرخلوص محبت کرنے والی ہو۔ اسے دولت کی مطلق

خواہش نہ تھی۔ اس کے سامنے کئی لڑکیاں تھیں مگر وہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ ان میں سے کس کو شادی کا پیغام دوں۔

دریں اثنا سٹیپانیڈا سے اس کے تعلقات بار بار استوار ہونے لگے۔ حالانکہ وہ ایسا کرنا نہ چاہتا تھا۔ جب کبھی دونوں ملتے تو یوجین دل میں کہتا کہ آئندہ اس عورت سے نہ ملوں گا مگر چند منٹ گزر جاتے تو وہ بے چین ہونے لگتا اور اس سے ملے بغیر نہ رہتا۔ اس نے اس کے متعلق کبھی بھی نہ سوچا کہ ان کے یہ تعلقات آخر کیا رنگ اختیار کر لیں گے۔ وہ دل کو سمجھاتا کہ شادی ہو لینے دو۔ یہ تعلقات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

کچھ عرصہ بعد وہ شہر گیا۔ وہاں اس کی ملاقات ایک حسینہ لزا سے ہوئی اور ان میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے اور سٹیپانیڈا سے اس کے تعلقات منقطع کر لیے۔

شادی کے بعد لزا امید سے ہو گئی لیکن اتفاق سے ایک دن اس کا پاؤں پھسل گیا اور بچہ ضائع ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیچاری بیمار ہو گئی اور اس کے تندرست ہونے میں کافی وقت لگا۔

یوجین اس نئی صورتِ حال سے سخت پریشان ہو گیا مگر جب اس کی بیوی صحت یاب ہو گئی تو حالات ٹھیک ہو گئے اور اس کی پریشانی بھی جاتی رہی۔ اور سال کے اختتام پر لزا دوبارہ امید سے ہو گئی۔ اس کے علاوہ جائداد کی نیلامی کا خوف بھی دور ہو گیا۔

یوجین کا یہ معمول بن گیا کہ وہ روزانہ تڑکے اٹھتا اور سیر کو نکل جاتا۔ کھیتوں اور کارخانے کو دیکھ کر دس بجے کے قریب گھر لوٹتا اور ناشتہ کرتا۔ اس کی بیوی لزا اس کے آرام و آسائش کا بڑا خیال رکھتی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ باہر نکل جاتا پھر شام کو جب وہ لوٹتا تو دونوں اکٹھے چائے پیتے اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتے۔ اگر کوئی مہمان آتے تو وہ بھی شریک ہو جاتے۔

اتنے میں مقدس اتوار کا مذہبی تہوار آ پہنچا۔ لزا نے چاہا کہ سارے گھر کی صفائی کرا دی جائے۔ اس کام کے لیے اس نے جن دو عورتوں کو منتخب کیا۔ ان میں ایک سٹیپانیڈا بھی تھی۔

یوجین نے لزا سے شادی کرنے کے بعد سٹیپانیڈا سے کوئی ملاقات نہ کی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سٹیپانیڈا نے اس عرصے میں ایک اور شخص سے ملنا جلنا شروع کر دیا تھا۔ یوجین جب گھر آیا تو اس کی نظریں سٹیپانیڈا کے چہرے پر پڑیں۔ اس نے سر پر سرخ رومال باندھ رکھا تھا اور دونوں آستینیں چڑھائے کمرے کا فرش دھو رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کی طرف نہ دیکھے لیکن کوشش کے باوجود وہ اسے دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ اس کی نظریں بدستور اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ اس نے دل میں سوچا "آخر میں اسے کیوں دیکھ رہا ہوں"۔ وہ دل کڑا کر کے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ معاً اس نے پلٹ کر دیکھا وہ کم بخت بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے بے چینی سی محسوس کی اور وہ دل میں کہنے لگا: "میرے اللہ۔ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ سٹیپانیڈا کیوں میرے دل میں سمائی جا رہی ہے۔ لزا نے دیکھ لیا تو وہ کیا کہے گی"؟

وہ خوفزدہ ہو گیا۔ چائے کے وقت لزا نے دیکھا کہ یوجین پریشان اور مضطرب سا ہے۔ وہ بولی: "کیا بات ہے میری جان تم مجھے پریشان لگتے ہو کہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ تو نہیں ہو گیا"؟

یوجین کو ایسے سوال کی ہرگز توقع نہ تھی۔ وہ گھبرا کر کہنے لگا: "کچھ نہیں، لزا کچھ بھی نہیں"۔

یہ سن کر لزا اور بھی سوچ میں پڑ گئی۔

یہاں سے اُٹھ کر یوجین مطالعے کے کمرے میں گیا۔ اس نے کوئی کتاب پڑھنے یا کچھ لکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ پھر وہ مسلسل سگریٹ پیتا چلا گیا۔

شادی کے بعد یوجین کے دل میں لزا کے سوا کسی عورت کا خیال نہ آیا تھا۔ مگر آج مدت کے بعد سٹیپا نیڈا پھر اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس نے سوچا یہ کیا بات ہے کہیں اس کی طرف مائل ہو رہا ہوں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی روح اس کے لیے بے چین ہے۔ اس نے چاہا کہ اس خیال کو دل سے نکال دے۔ اس نے طبیعت کو سنبھالا اور دل پر جبر کر کے ایک خط لکھا۔ پھر اصطبل کی طرف جانے کے لیے باہر نکلا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور گیا تھا کہ سٹیپا نیڈا بہ صد ناز و ادا چلتی ہوئی قریب سے گزری۔ وہ گھبرا گیا اور آگے نکل گیا۔

دوسرے دن مقدس اتوار کا تہوار تھا۔ گاؤں کی قدیم رسم تھی کہ اس دن دیہاتی عورتیں جنگل اور کھیتوں میں جانے سے پہلے گاؤں کے بڑے زمیندار کے دروازے پر پہنچ کر اس کے سامنے گاتی اور رقص کرتی تھیں۔ چنانچہ اس دن بھی عورتیں رنگا رنگ لباس پہنے ہوئے آئیں اور یوجین کے مکان کے باہر ناچنے اور گانے لگیں۔ یوجین نے چاہا کہ وہ باہر نہ نکلے لیکن اس کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا۔ عورتیں اپنے گاؤں کے بڑے زمیندار کو گا گا کر باہر بلانے لگیں۔ چنانچہ یہ دیکھ کر اس کی بیوی لزا نے بھی اسے باہر بلایا۔ آخر وہ باہر آ گیا۔ لزا نے ایک عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا "دیکھو پیارے وہ سُرخ رومال والی عورت کتنی خوبصورتی سے ناچ رہی ہے۔"

یوجین نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ سٹیپا نیڈا تھی۔ وہ پریشان ہو گیا اور دل میں کہنے لگا،

"یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی!"

یوجین گھبرا گیا۔ اور مکان کے اندر چلا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ لیکن پھر کسی جذبے سے مغلوب ہو کر وہ کھڑکی میں آ گیا اور لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر سٹیپا نیڈا کو رقص کرتے دیکھنے لگا اور جب وہ رقص ختم کر کے چل دی تو یوجین مکان سے باہر آیا اور اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ وہ اس کے قریب پہنچنے ہی والا تھا کہ کسی شخص نے اس کا نام لے کر پکارا وہ رُک گیا اتنے میں سٹیپا نیڈا اپنے گھر پہنچ گئی۔

جب وہ گھر لوٹا تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے وہ کسی جرم کا ارتکاب کر کے آیا ہے۔ اس کے ساتھ اسے اس بات کا بہت زیادہ احساس ہونے لگا کہ اس نے ایک عورت کے ہاتھوں شکست کھائی ہے۔ اسے یہ غم بھی ستانے لگا کہ وہ شیطان کے قبضے میں ہے آزاد نہیں۔ اسی لیے تو وہ شیطانی کاموں پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسے یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ آج تو میں حسن اتفاق سے بچ گیا ہوں لیکن کسی نہ کسی دن میں ضرور برباد ہو جاؤں گا۔ وہ دل سے کہنے لگا: "مجھے کیا ہو گیا ہے! اب میں کیا کروں گا! کیا اس شیطانی مرض کا کوئی علاج نہیں ہے؟ کیا میں اسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤں گا؟"

اس نے بڑے اعتماد سے اپنے دل سے کہا: "بس اس کے متعلق کچھ نہ سوچو!" لیکن اس سے کچھ نہ بنا اور وہ بار بار سٹیپا نیڈا کے متعلق خیالات میں غرق رہنے لگا۔ وہ دل سے کہتا: "کیا کروں کیا نہ کروں، آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ کیا میں گاؤں چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں؟ یا اسے گاؤں سے نکال دوں؟ یہ ٹھیک ہے، میں اسے گاؤں سے باہر بھجوا دیتا ہوں اور اس کے خاوند کو کچھ رقم دے کر کہتا ہوں کہ میاں گاؤں سے نکل جاؤ اور اپنی بیوی کو بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔"

جب اس نے اپنی یہ تجویز اپنے منتظم کے سامنے پیش کی تو وہ حیرت سے کہنے لگا: "مگر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ وہ کہاں جائے؟ کیا پودا اپنی جڑوں سے جدا کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس بے چاری نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا ہے؟ لیکن

وہ کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟ آپ ذرا سوچیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں اس قسم کے واقعات اکثر ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

یوجین نے جواب دیا: "میں سخت پریشان ہوں۔ میرے دل و دماغ پر ایک خوف ہر گھڑی مسلط رہتا ہے۔ میں سخت مصیبت میں مبتلا ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے میرے دل و دماغ اور روح پر قبضہ جما لیا ہے ـــــ تم کوشش کرو میرے سر سے مصیبت ٹل جائے گی۔"

مگر اس مصیبت نے نہ ٹلنا تھا نہ ٹلی۔ مقدس اتوار کے تہوار کو اس کی بیوی لزا کا پاؤں ایک مرتبہ پھر پھسلا۔ اب کے اسے اچھی خاصی چوٹ لگی۔ وہ چونکہ پھر امید سے تھی۔ اس لیے یوجین اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے لزا کا طبی معائنہ کیا اور اسے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں لزا کا بچہ صحیح سلامت ہے۔ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔"

یوجین لزا کے سرہانے بیٹھا اس کی تیمارداری میں مصروف رہتا۔ لزا اسے بار بار کہتی کہ وہ کام پر جائے۔ کیونکہ گھر کے مسائل کے علاوہ دیگر مسائل بھی اس کی توجہ کے محتاج ہیں لیکن یوجین کی حالت یہ تھی کہ وہ گھر سے باہر نکلنے سے ڈر گھبراتا تھا۔ اسے ہر دم یہ خوف دامنگیر رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں گھر سے باہر نکلوں اور شیپانیڈا اسے پھر نظر آ جائے۔

حقیقت میں وہ ہر دم اس کے دل و دماغ پر مسلط تھی۔ اس لیے وہ خوفزدہ تھا کہ کہیں میں پھر اس سے پہلے کے سے تعلقات استوار نہ کر بیٹھوں اور کہیں غیر ارادی طور پر وہ پھر اُن راستوں پر چل کر اس کا تعاقب نہ کرنے لگے جن پر سے وہ گزرا کرتی تھی۔

لیکن جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے اور وہ ہو کر رہا، یوجین نے کوشش بسیار کے باوجود وہاں جانا شروع کر دیا جہاں شیپانیڈا گاؤں کی دوسری عورتوں کے ہمراہ گھاس لینے جایا کرتی تھی ہر روز ہی وہ دل سے یہ عہد کرتا کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کروں گا۔ لیکن وہ وہاں جا کر اس کی ایک جھلک دیکھنے سے ہرگز باز نہ رہ سکتا تھا اس لیے وہ ہر روز وہاں ضرور جاتا اور جھاڑیوں میں چھپ کر اسے دیکھا کرتا۔ اسے معلوم ہونے لگا کہ اس کی رُوح کلی طور پر شیپانیڈا کے قبضے میں چلی گئی ہے۔

اسے شک ہونے لگا کہ کہیں میں دیوانہ تو نہیں ہو گیا اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ میں ایک غلط راستے پر جا رہا ہوں جو شیطانی راستہ ہے لیکن وہ اپنے تئیں بے بس محسوس کرتا تھا۔ وہ بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا: "میرے اللہ مجھے اس امتحان میں نہ ڈال۔ مجھے اس آزمائش سے بچا لے میں اسے صرف آج کے دن دیکھوں گا۔ پھر کبھی اسے دیکھنے کا نام تک نہ لوں گا۔"

لیکن یہ سب کچھ بے سود تھا، گو اس نے اسے دل سے بھلا دینے کی سر توڑ کوشش کی اس نے ریاضت کی، روزے بھی رکھے۔ اپنے آپ پر لعنتیں بھی بھیجیں۔ مگر اُدھر دوپہر ہوتی اِدھر اس کے قدم شیپانیڈا کی تلاش میں اُٹھنے لگتے۔

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اور گھر کا ماحول یوجین کو بڑا یاس انگیز معلوم ہو رہا تھا کہ شیپانیڈا کا خیال اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو گیا۔ اس نے برساتی پہنی اور باہر نکل گیا۔ ابھی وہ فیکٹری کی طرف جانے ہی لگا تھا کہ شیپانیڈا پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا: "کہاں جا رہی ہو تم؟"

"میں؟ میں تو اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کی تلاش میں ہوں۔ آپ ایسے موسم میں کہاں جا رہے ہیں؟" یہ کہہ کر وہ بڑے نازو انداز سے مسکرانے لگی۔

"آؤ ذرا اُس شیڈ میں چلیں!"

اس نے یہ کہہ تو دیا لیکن اسے یوں معلوم ہوا کہ یہ فقرہ

اس نے نہیں بلکہ کسی اور طاقت نے اس سے کہلوایا ہے۔

دونوں شیڈ کی طرف بڑھنے لگے تھے کہ اتنے میں ملازم نے آواز دی: "حضور بیگم صاحبہ آپ کو یاد کر رہی ہیں!"

وہ وہیں سے واپس ہو گیا اور کہنے لگا: "اللہ نے آج دوسری مرتبہ مجھے شیطان کے چنگل میں جانے سے بچایا ہے۔"

وہ اپنی بیوی سے ملا۔ ملنے کے بعد یہ خواہش پھر اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی کہ شیپا نیڈا اسے مل جائے۔ چنانچہ وہ گھر سے نکل کر سیدھا شیڈ کی طرف گیا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت دکھ ہوا کہ شیپا نیڈا وہاں نہیں تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اتنے اچھے موسم میں وہ اس کے پہلو میں ہوتی تو اچھا ہوتا ___ لیکن پتہ نہیں وہ شیڈ میں آئی بھی تھی یا نہیں۔ میں عجب احمق ہوں کہ اس کا انتظار کر رہا ہوں، آخر وہ میرے پاس آئے بھی کیوں؟

اتنا کہہ کر وہ شیڈ سے باہر نکلا۔ اسے زمین پر پاؤں کے نشانات دیکھ کر اس بات کا پورا پورا یقین ہو گیا کہ وہ شیڈ میں ضرور آئی تھی اور انتظار کر کے چلی گئی تھی۔ وہ بڑا مایوس ہوا لیکن اس سے دوبارہ ملنے کا خیال دل میں لیے گھر کو لوٹ آیا۔

لزا اب اس کے لیے پریشان رہنے لگی تھی۔ اس کی محبت اور پریشانی دیکھ کر یوجین کہتا: "میرے گھر کا ماحول کتنا پاکیزہ اور خوشگوار ہے۔ مگر آہ میری روح پر شیطان کا قبضہ ہے!"

اس نے اپنی اس پریشان حالی کے متعلق دوسروں سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ تمہارے لیے یہ بہتر ہے کہ کہیں باہر چلے جاؤ اور سکونِ قلب حاصل کرو۔ چنانچہ وہ گاؤں کے اس ماحول کو چھوڑ کر کریمیا چلا گیا۔ جہاں کے خوشگوار موسم نے اس کی صحت پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ وہ پورے دو ماہ تک وہاں مقیم رہے۔ آخر جب اپنے گاؤں واپس آئے تو یوجین کا ذہن نہایت پُرسکون ہو چکا تھا۔ ان کے ہاں ایک پیاری بچی پیدا ہوئی۔ اس نے خود کو آزاد محسوس کیا۔ یوں معلوم ہوا کہ وہ شیطان کے چنگل سے نجات حاصل کر چکا ہے۔ اور شیپا نیڈا اس کے دل و دماغ سے یکسر اُتر چکی ہے۔

شیپا نیڈا نے اب کسی اور کو پھانس لیا تھا!

:0:0:0:

بات پتے کی

گاؤں کا مکھیا انتہائی شدید بیمار تھا۔ اس کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے چنانچہ مندر کے پنڈت نے پڑوسی ہونے کے ناتے اس کی عیادت کرنا ضروری سمجھی۔ مکھیا پنڈت کو دیکھتے ہی رونے لگا: "بھگوان سے دعا کرو مہاراج! اگر میں بچ گیا تو مندر کی مرمت کے لیے پانچ ہزار روپے دان کروں گا۔"

پنڈت نے فوراً دعا کر لیا، اور چند ہفتوں بعد مکھیا واقعی صحت یاب ہو گیا، لیکن اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔ پھر ایک روز جب پنڈت نے اسے گھیر کر وعدہ یاد دلایا تو وہ مسکرا کر بولا: "تم میرے وعدے ہی سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں علالت کے باعث پاگل سا ہو گیا تھا۔"

ابلیس کے چیلے کی ایک خوفناک کہانی
شیطان کا پجاری
لیو ٹالسٹائی

نفسیات کے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ یہ واہمہ تھا لیکن میں اسے واہمہ کیوں کر کہوں؟ میں کمرے میں اکیلی تھی اور کسی مرد کی انگلیاں میرے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔ وہ مرد مجھے نظر نہیں آ سکتا تھا کیونکہ وہ بدروح تھا۔ اسے مرے ہوئے ایک سو برس گذر گئے تھے۔ اس کی روح آئی تو میرا کمرہ سرد ہو گیا تھا۔ کواڑ بند تھے اور میں نے اس کی ہنسی کی دبی دبی آواز سنی تھی۔ میں گنوار اور ان پڑھ تو نہیں، ڈگری یافتہ استانی ہوں۔ میں یہ واقعہ لکھنے سے اس لیے گریز کرتی رہی کہ پڑھنے والے مجھے پاگل نہ سمجھ لیں۔ مگر اب یہ راز اگل دینا چاہتی ہوں کہ میں نے اس بدروح سے شادی کر لی تھی۔

میرا جیتا جاگتا منگیتر فوج میں تھا اور تین برسوں سے جرمنی میں تھا۔ اس کا نام لیری ہے اور اب میں اس کی بیوی ہوں۔ میں اس کی غیر حاضری میں اس کی منگنی کی انگوٹھی پہنے رکھتی تھی۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ بے لوث، پاک اور والہانہ محبت۔

میں ایک سکول میں پڑھایا کرتی تھی اور شادی کے لیے خاصے پیسے جمع کر لیے تھے۔ لیری کے خط آتے رہتے تھے۔ اس کے واپس آنے میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا۔ میں اس انتظار میں تھی کہ وہ آئے اور ہم شادی کر لیں۔ دنیا میں لیری کے سوا میرا کوئی نہ تھا۔ ماں باپ بچپن میں مر چکے تھے۔

میں نے شہر سے دور دیہاتی علاقے میں کرائے کا مکان لینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ شہر کے شور و شر اور مصنوعی زندگی سے طبیعت اکتا گئی تھی۔ کرائے کے مکانوں کے ایک ایجنٹ نے شہر سے دس میل دور میرے لیے پرانا سا ایک مکان دیکھ لیا اور مجھ سے بات کر کے مالک مکان سے معاملہ کر لیا۔ میں مکان دیکھنے کے لیے وہاں پہنچی۔ مالک مکان، مکان کو فروخت بھی کرنا چاہتا تھا لیکن میں ابھی کرائے پر رہنا چاہتی تھی۔ مکان کا جو کرایہ بتایا گیا وہ مضحکہ خیز حد تک کم تھا۔ میں نے سنا تو ہنسی نکل گئی۔ ایجنٹ نے کہا کہ گاؤں کے مکانوں کے کرائے اس سے بھی کم ہوا کرتے ہیں۔ شہر کو چھوڑ کر یہاں کون رہنے آتا ہے؟ لیکن ایجنٹ کو معلوم نہ تھا کہ میں شہر سے بھاگ کر اس چپ چاپ سی فضا اور معصوم سے ماحول میں پناہ لینے آئی ہوں۔ اس مکان کے قریب تر جو مکان تھا وہ سو ڈیڑھ سو گز دور تھا۔ میں یہ مکان لیری کے لیے لے رہی تھی۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ ہم شادی کر کے تصنع اور ہنگاموں سے بہت دور رہنا چاہتے تھے۔

لیری دیہات میں ہی جنا پلا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس ماحول کو بہت پسند کرے گا۔ میں نے تو عمر شہر میں گزاری تھی۔ وہ شہر کا ایک تاریک گوشہ تھا۔ میری عمر تین برس کی تھی جب ماں مر گئی اور باپ کہیں لاپتہ ہو گیا اور میں ماں باپ کے پیار سے محروم ہو گئی۔ مجھے خالہ نے گود لے لیا تھا۔ خالہ خاموشی پسند عورت تھی۔ مجھے بھی زیادہ بولنے نہیں دیا کرتی تھی۔ اس نے مجھے بڑے پیار سے پالا، تعلیم دلائی اور مجھ میں کتابیں پڑھتے رہنے کی عادت ڈال دی۔ مجھے قدیم زمانے کی پُراسرار کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے ایک کتاب میں اسی قسم کے مکان کے متعلق ایک کہانی پڑھی تھی جو مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ یہ کہانی بھی پُراسرار تھی۔ مجھے جب ایجنٹ نے یہ مکان دکھایا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہانی اسی مکان کے متعلق تھی۔ شاید اس کہانی کا اثر تھا کہ مجھے یہ مکان جانا پہچانا لگا۔ جیسے میں اس مکان میں کبھی رہ چکی ہوں۔

ایجنٹ نے مکان کا تالا کھولا اور چابی مجھے دے کر جانے کہاں چلا گیا۔ میں اندر چلی گئی۔ باہر سے یہ مکان جس قدر اچھا لگا تھا اندر سے دیکھ کر اتنی ہی مایوسی ہوئی۔ دیواریں اور فرش گرد آلود تھے۔ فرنیچر بوسیدہ اور در و دیوار زمانۂ قدیم کی اداس اداس کہانیاں سنا رہے تھے۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔ "ان میں سے کوئی بھی چیز یہاں کی ملکیت نہیں ہے۔ جانے کون رکھ گیا ہے۔"

میں چونک اٹھی اور سہم گئی۔ کیونکہ میں نے کمرے میں کسی مرد کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنی اور ساتھ ہی مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سوچا، ایجنٹ ہو گا لیکن وہاں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ ہنسی کی گونج ابھی تک کمرے میں جھنک رہی تھی۔ یہ وہم نہیں تھا۔ تاہم میں نے اپنے دل کو تسلی دے کر سنبھال لیا کہ قدیم مکانوں میں ایسی آوازیں اکثر سنائی دیتی ہیں جو دراصل انسانی نہیں ہوتیں۔ ہو سکتا ہے کسی کونے کھدرے میں کوئی بلی یا کتیا بچوں سے کھیل رہی ہو۔ برآمدے میں لکڑی کا زینہ تھا۔ میں بالائی کمرے میں چلی گئی۔ اوپر دو بڑے کمرے اور ایک سٹور روم تھا جس میں کچھ کوڑا کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ میں نیچے اتر آئی۔ تب میں نے مکان کو غور سے دیکھا۔ فرش پرانے زمانے کی خوبصورت ٹائلوں کا تھا۔ انگیٹھی نہایت خوبصورت اور دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑوں پر بیل بوٹے کھدے ہوئے تھے۔ چھت پر بھی گلکاری کی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے یہ مکان بڑے پیار سے یا کسی کے پیار کی خاطر تعمیر کیا تھا۔ ہر چیز سے یہاں کے رہنے والوں کی خوش ذوقی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہی مکان جو چند لمحے پہلے اداس اداس سا نظر آیا، اب شگفتہ اور ہنستا مسکراتا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تبدیلی کیوں آئی تھی —— ؟ میرے پاس آج بھی اس کا کوئی جواب نہیں۔

مکان کی یہ قدیم قسم کی دل کشی مجھے حسن و عشق کی وادیوں میں لے گئی۔ مجھے بھی تو لیری سے محبت تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسی مکان

میں رہوں گی اور ٹیری کے لیے اسے اور زیادہ دل کش بناؤں گی۔ اتنے میں ایجنٹ اندر آیا اور بولا — "میں چاہتا ہوں کہ آپ پھر سوچ لیں۔ میں آپ کو شہر میں تھوڑے کرائے پر اچھا مکان دلوا سکتا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے" — اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ مکان ایک سو سال پرانا ہے اور بہت عرصہ خالی رہا ہے۔

میں نے اس کی بات نہ مانی اور اس مکان میں منتقل ہو گئی اور دوسرے روز نیلامی سے ایک پرانا صوفہ سیٹ خرید لائی۔ ٹیری اپنی تنخواہ میں سے ہر مہینے خاصے پیسے بھیج دیا کرتا تھا جو میں ازدواجی زندگی کے لیے الگ رکھ دیتی تھی۔ میرے پاس اپنے ایک ہزار ڈالر تھے جو خالہ نے پچھلے سال مرتے وقت میرے لیے چھوڑے تھے۔ میں نے مکان کے اندر دیواروں اور کواڑوں پر رنگ روغن شروع کرا دیا۔ پرانے پردے بھی خرید لائی۔ پھر میں پرانے فرنیچر کی تلاش کرنے لگی۔ نئی چیزیں خریدنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس مکان سے مجھے روحانی سا لگاؤ پیدا ہونے لگا۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے میں ایک صدی پہلے کی مخلوق ہوں اور موجودہ دنیا کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں اس مکان کو سجانے لگی اور روز روز کی تفصیلات ٹیری کو لکھنے لگی مگر ٹیری کا خط آیا تو اس میں خفگی کا اظہار تھا۔ اس نے لکھا کہ اس قسم کے پرانے مکان پر اتنے پیسے خرچ کرنا عقلمندی نہیں۔ میں تھوڑے عرصے تک واپس آجاؤں گا لیکن میں ایسے پرانے مکان میں نہیں رہوں گا۔

ٹیری کا یہ خط دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا۔ یہ خط پڑھتے وقت میں نے محسوس کیا جیسے یہ کسی ایسے آدمی کا خط ہے جس کے ساتھ میرا کوئی گہرا تعلق نہیں۔ میں نے ٹیری کو خط لکھا کہ میں اسی مکان میں رہوں گی۔ میں نے غصے کے عالم میں لفافہ بند کیا تو عین اس وقت دروازے کے کواڑوں میں جنبش ہوئی۔ معاً بعد میں نے اپنے کندھے پر کسی مرد کا ہاتھ محسوس کیا جو پیار سے میرے کندھے کو تھپتھپا رہا تھا۔

رگوں میں خون جم گیا۔ خوف سے حلق خشک ہو گیا۔ میری رگ رگ میں سردی کی لہر سرایت کر گئی۔ کمرہ بھی سرد ہو گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے گھوم کے دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا لیکن اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا تھا۔ میں بھاگ کر باہر نکلی، باہر بھی کوئی نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے ٹیری سے روحانی محبت ہے اور اس وقت میں اسی کے خیال میں گم تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میرے تصورات کا کرشمہ ہو۔ میں نے ٹیری کا ہاتھ تصور میں اپنے کندھے پر محسوس کیا ہو گا۔ میں مضطرب تو بہت ہوئی لیکن ٹیری کی محبت اور اس کے تصورات نے مجھے سنبھال لیا۔

رات اطمینان سے گزر گئی۔ صبح ناشتہ کر کے میں شہر کی طرف چل پڑی۔ میں مکان کے لیے چند اور چیزیں خریدنا چاہتی تھی۔ راستے میں ایک دکان تھی۔ میں دکان میں چلی گئی۔ باتوں باتوں میں دکاندار نے مجھے اپنی بلی کے بچے دکھائے۔ بڑے خوبصورت بچے تھے۔ اس نے ایک بچہ مجھے دے دیا اور کہنے لگا — "آپ اتنے بڑے مکان میں تنہا رہتی ہیں، یہ بچہ آپ کا اچھا ساتھی ثابت ہو گا" — میں بچے کو لے آئی۔

میں شہر گئی۔ کچھ چیزیں خریدیں اور واپس آ گئی۔ میرے مکان سے ذرا دور ایک اور مکان تھا۔ سوچا ان لوگوں سے بھی راہ و رسم پیدا کر لوں۔ وہاں گئی تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ میرے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ وہ میاں بیوی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ چند ایک رسمی باتوں کے بعد بڑھیا نے مجھے کہا کہ سنا ہے تم پرانا فرنیچر خریدتی پھر رہی ہو۔ ہمارے گھر میں ایک بہت پرانی میز ہے۔ کوئی سو سال پرانی ہو گی لیکن ہے بہت مضبوط۔ اس زمانے کی دل کشی اب بھی اس میں موجود ہے چاہو تو خرید لو۔

میں نے میز خرید لی۔ اس کا رنگ روغن پھیکا پڑ چکا تھا لیکن ساخت میں ایک صدی پہلے کا ذوق نمایاں تھا۔ مجھے اس میز میں یہی خوبی اچھی لگی تھی۔ بڑھیا نے میز میرے حوالے کرتے ہوئے کہا — "اس مکان سے جتنی جلدی نکل جاؤ، بہتر ہے۔ تم شاید تھوڑا کرایہ دیکھ کر یہاں آ گئی ہو۔ لیکن یہ مکان اچھا نہیں" — میں نے اسے حیرت زدہ ہو کے دیکھا تو اس نے کہا — "یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ یہاں کوئی کرایہ دار زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ تم اکیلی ہو کہیں ایسا نہ ہو..."

مجھے ڈر جانا چاہیئے تھا۔ مجھے پہلے بھی خبردار کیا جا چکا تھا لیکن مجھے ذرہ بھر خوف محسوس نہ ہوا۔ حالانکہ میں مکان کی آسیب زدگی کی ایک علامت دیکھ بھی چکی تھی لیکن مجھے تو اس مکان سے محبت سی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس بڑھیا کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بڑھیا نے میز میرے کمرے میں بھجوا دی۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں نے کھانا تیار کیا۔ کھایا۔ بلی کے بچے کو دودھ پلایا اور سکول کی لائبریری سے لائی ہوئی ایک کتاب پڑھنے بیٹھ گئی۔ بلی کا بچہ میری گود میں سو گیا۔ میں بہت دیر پڑھتی رہی جب میں نے دیکھی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں صوفے پر بیٹھی تھی کتاب صوفے پر رکھ دی۔ سوچا کہ اتنی دیر تک نہیں جاگنا چاہیئے تھا۔ اتنے میں کمرے کی فضا یک لخت سرد ہو گئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ ہوا تو کہیں سے بھی نہیں آ رہی تھی۔ معاً یہ سردی میری رگوں میں سرایت کر گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سردی کچھ انوکھی سی تھی۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ میرے قریب صوفے پر کوئی انسان آ کے بیٹھ گیا ہے۔ میں نے صوفے کے دبتے ہوئے سپرنگوں اور صوفے کے دھنسنے کی ہلکی سی آواز بھی سنی۔ خوف کی یخ بستہ لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔

بلی کے بچے نے بدک کر میرے پہلو کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر خوف کا تاثر نمایاں ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اسے کوئی انسان یا کوئی اور چیز نظر آ رہی ہے۔ اس نے ڈر کر عجیب سی آواز نکالی اور اچھل کر میری گود سے فرش پر جا پڑا۔ وہاں سے بدکا اور بھاگ کر دروازے سے ٹکرایا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور خوفزدگی کے عالم میں کواڑ پر پنجے مارنے لگا۔

میں نے جا کر دروازہ کھولا تو بلی کا بچہ بجلی کی سرعت سے باہر نکلا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں باہر کے اندھیرے میں جھانکتی رہی۔ مجھے جرأت نہیں ہو رہی تھی کہ گھوم کر کمرے میں دیکھوں۔ معلوم نہیں وہ کیسی خوفناک چیز تھی جو صوفے پر آ بیٹھی تھی۔ میرے لیے ایک ہی راہ فرار تھی کہ گھر سے بھاگ کر اندھیرے میں غائب ہو جاؤں۔ کسی ہمسائے کے ہاں رات گزاروں یا شہر کسی ہوٹل میں چلی جاؤں لیکن خیال آیا کہ اگر کمرے میں کوئی بدروح یا جن بھوت ہے تو وہ مجھے راستے میں روک لے گا۔

میں نے حوصلہ کیا اور تھر تھر کانپتے جسم کو بڑی مشکل سے کمرے کی طرف گھمایا۔ دیکھا، کمرے میں کوئی نہ تھا۔ میں مکان کے تمام کمروں میں گھوم آئی۔ ہر ایک بتی جلا کر دیکھا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل صبح اس مکان سے نکل جاؤں گی اور شہر میں جا رہوں گی۔ کوئی شک نہ رہا کہ یہ مکان بدروحوں کا مسکن ہے۔ دل کو جھوٹی سچی تسلیاں دے کر میں سونے کے لیے لیٹ گئی لیکن نیند نہ آئی۔ میں رات کی آوازیں سنتی رہی۔ ان میں جھینگروں کی آوازیں بھی تھیں اور مینڈکوں کی بھی۔ کبھی کوئی گیدڑ چیخ اٹھتا تھا اور کبھی دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ میرے ارد گرد جنگل جاگ رہا تھا اور میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے بتی جلتی رہنے دی اور بہت دیر بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ دن کی روشنی نے میرے سہمے ہوئے دل کو تھام لیا اور رات کا خوف بہت کم ہو گیا۔ میں نے ناشتہ تیار کیا اور کھا پی لیا۔ باہر نکل کر گرد و پیش کا منظر دیکھا تو رات کے ارادے کہ میں یہ مکان چھوڑ دوں گی، دم توڑنے لگے۔ اس قدر دلکش اور روح افزا ماحول شہر میں خواب میں بھی نظر آنا محال تھا۔ مگر رات کا عجیب یہ واقعہ یاد آیا کہ میرے قریب صوفے پر کوئی بیٹھ گیا تھا اور بلی کا بچہ ڈر کر بھاگ گیا تھا تو دل ڈوبنے لگا۔ میں نے بدروحوں کی کہانیوں پر کبھی یقین نہیں کیا تھا لیکن مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ رات کا واقعہ محض واہمہ تھا۔ صوفے کی آواز بتاتی تھی کہ وہ کوئی تنومند انسان تھا۔

میں نے مکان کو چھوڑ ہی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں مالک مکان کے گھر چلی گئی اور اس کی بیوی سے کہا کہ میں مکان خالی کر رہی ہوں۔ میں نے اسے رات کی واردات نہ سنائی۔ سوچا کہ وہ مجھے توہم پرست گنوار نہ سمجھ لے۔ میں نے بہانہ پیش کیا کہ میرا منگیتر واپس آ رہا ہے اور وہ شہر میں رہنا چاہتا ہے۔

مکان کی مالکہ بولی ——— معلوم ہوتا ہے تمہیں کسی نے ڈرا دیا ہے

...ں مکان میں بد روحیں رہتی ہیں۔ لوگوں نے اس مکان کے متعلق اس
...سم کے من گھڑت قصے مشہور کر رکھے ہیں۔

میں نے اسے بتادیا کہ فلاں بڑھیا نے مجھے کہا تھا کہ میں اس
...کان سے نکل جاؤں۔

"سنو لڑکی!" مالکن بولی۔ "تم مکان خالی کرنا چاہو تو کر دو لیکن میں
...تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ لوگوں نے اس کے متعلق بدروحوں کے
...قصے کس طرح تخلیق کیے ہیں۔ میں اور میرا خاوند پندرہ برس اس مکان
...میں رہے ہیں۔ ہمیں کبھی کوئی بدروح نظر نہیں آئی تھی۔ قصہ یوں ہے
کہ ایک سو سال گذرے ایک آدمی جوناتھن برل نے اس مکان کی
تعمیر کے لیے زمین خریدی تھی۔ اس نے ابھی مکان بنانا شروع نہیں
...کیا تھا کہ ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جوناتھن وطن پرست انسان
...تھا، وہ جنگ پر چلا گیا۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اسے اپنی منگیتر سے بہت
...محبت تھی اور وہ لڑکی بھی اسے اسی طرح چاہتی تھی۔ جوناتھن اپنی
...منگیتر کے لیے یہ مکان بنوانا چاہتا تھا لیکن وہ خانہ جنگی میں شریک ہو
...گیا۔ ماتم یہ ہوا کہ اس کی غیر حاضری میں لڑکی نے کسی اور سے شادی
...کر لی اور جانے کہاں غائب ہو گئی.....

...جب جوناتھن واپس آیا تو اس لڑکی کو غائب پایا جس کے لیے
...وہ یہ سا مکان بنانا چاہتا تھا۔ اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے
...مکان بنانا شروع کر دیا۔ وہ ہر لمحہ معماروں کے سر پر کھڑا رہتا اور اپنی
...نگرانی میں تعمیر کراتا رہا۔ اس کی تعمیر میں اس نے دو برس صرف کیے اور
...مکان کی ہر چیز کو نہایت دل کش بنایا۔ اس دور کے لوگ سناتے تھے
...کہ مکان کے ایک ایک نقش، ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر
...میں بے وفا منگیتر کی محبت کو سمو رہا تھا۔ بعض اوقات کوئی یار
...دوست اس سے پوچھ بیٹھتا کہ اب کون سی لڑکی کو اس خوبصورت
...مکان میں لا کر بساؤ گے؟ تو وہ ہر کسی کو ایک ہی جواب دیتا کہ وہ ایک
...دن خود ہی آ جائے گی.....

وہ مکان بنواتا رہا اور مکان کی تکمیل دو برسوں میں ہوئی۔ اس
...مکان کے سامنے باغیچہ بنوایا اور نایاب قسم کے پھولدار پودے
اور سرخ گلاب اگا کر اسے انتہائی دل کش باغیچہ بنا دیا۔"

مکان کی مالکن کہانی سنا رہی تھی اور میرے تصور میں ایک
خوبرو، جواں سال اور اداس سے مرد کی تصویر ابھرتی آ رہی تھی۔ مجھے
یقین کی حد تک محسوس ہونے لگا کہ میں اس آدمی سے اچھی طرح واقف
ہوں اور میں نے اسے کئی بار دیکھا ہے۔ جوناتھن کا نام کچھ ایسا لگا
جیسے یہ نام ایک مدت سے میرے دل میں رچا بسا ہوا ہے۔ گو یہ
کہانی ایک صدی پرانی تھی۔ پھر بھی میں ذہن پر زور دینے لگی کہ میں
نے جوناتھن کو کہاں دیکھا تھا۔ میں نے مالکن سے پوچھا۔ "وہ بوڑھا
ہو کے مر گیا ہو گا۔ کب مرا تھا۔ اس نے شادی کی تھی؟"

"نہیں!" اس نے کہا۔ "وہ جوانی میں ہی مر گیا تھا۔ ایک حکایت
یہ ہے کہ وہ کہیں لاپتہ ہو گیا تھا لیکن میری دادی وثوق سے سنایا کرتی
تھی کہ اس پر بجلی گری تھی۔ اس نے جوناتھن کی جلی ہوئی لاش اپنی
آنکھوں دیکھی تھی۔ رات کا وقت تھا بڑی زور کا طوفان آیا تھا۔ کہتے ہیں
ایسا طوفان کبھی نہیں آیا تھا۔ آندھی اور بارش بہت تیز تھی اور بجلی رہ رہ
کر کڑک اور چمک رہی تھی۔ جوناتھن برآمدے میں کھڑا تھا کہ اس پر بجلی گری
اور وہ جل کر مر گیا..... اس کے بعد کئی لوگ اس مکان میں رہے لیکن
کوئی بھی زیادہ عرصے کے لیے نہ ٹھہر سکا۔ بہت مدت تک یہ مکان
خالی پڑا رہا۔ آخر ہم نے جوناتھن کے وارثوں کو تلاش کر کے ان سے
یہ مکان خرید لیا۔ ہم پندرہ سال اس میں رہے اور کسی بھی لمحہ شک نہ
گذرا کہ یہاں کوئی بدروح رہتی ہے۔ لوگوں نے جوناتھن کی محبت
کی کہانی میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے یہ قصہ گھڑ لیا ہے کہ جوناتھن کی
روح اب بھی اپنی منگیتر کو تلاش کرنے کے لیے اس مکان میں آیا کرتی
ہے..... تا" مالکن نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر یہ بات سچ ہوتی تو میں تم جیسی
جواں سال لڑکی کو کبھی یہاں رہنے نہ دیتی۔"

میں نے پھر بھی مالکن کو نہ بتایا کہ میں نے اس کی روح کو مکان
میں محسوس کیا ہے۔ جانے دل میں کیا آئی کہ میں نے مالکن کی بات مان
لی اور مکان چھوڑنے کا فیصلہ بدل ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی جوناتھن
میرے اعصاب پر سوار ہو گیا۔ رہ رہ کے خیال آتا کہ وہ اپنی بے وفا

اور فریب کار منگیتر کو ڈھونڈتا مر گیا۔ مجھے اس کے ساتھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی جس کا تعلق میری روح کے ساتھ تھا۔ میں مالکن کے گھر سے اٹھی اور شہر چلی گئی۔ شہر کی گہما گہمی کو دیکھ کر مجھے رات کا واقعہ یاد آ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو فریب دینے کی بہت کوشش کی کہ وہ محض واہمہ تھا لیکن میری کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ کوئی انسان یقیناً میرے صوفے پر بیٹھا تھا اور اس سے پہلے کسی نے بلاشک و شبہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں نے پھر ارادہ کر لیا کہ میں اس مکان کو چھوڑ کر شہر میں آ جاؤں گی۔

مجھے یونیورسٹی کی لائبریری سے ایک دو کتابیں لینی تھیں۔ میں یونیورسٹی چلی گئی۔ سکول میں ان دنوں چھٹیاں تھیں۔ لائبریرین سے باتیں ہونے لگیں تو اس نے یونیورسٹی کے عجائب گھر کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے یہ عجائب گھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لائبریرین نے بتایا کہ عجائب گھر کھلا ہے، میں جا کے دیکھ لوں۔ یہ آثارِ قدیمہ کے مضمون کے طلبہ کے لیے کبھی کبھی کھولا جاتا تھا۔

میں بالائی منزل میں عجائب گھر میں چلی گئی۔ سو سو صدیوں پرانی تہذیب مختلف اشیاء کے روپ میں بکھری ہوئی تھی۔ میں تصویروں کی گیلری میں گئی تو مجھے خانہ جنگی کے وقت کی سو سال پرانی تصویر دیوار سے آویزاں نظر آئی۔ یہ خاصی بڑی تصویر تھی جس میں بارہ جوان سال آدمی وردیاں پہنے کھڑے تھے۔ یہ خانہ جنگی کے جنگجو تھے۔ تصویر کے نیچے سب کے نام لکھے تھے۔ میں نام پڑھنے لگی تو ایک نام پہ رک گئی۔ نام تھا۔ جوناتھن برل —— میرے جسم نے جھرجھری لی۔ یہ تھا وہ جوناتھن جس نے اپنی منگیتر کے لیے اس قدر خوبصورت مکان بنایا تھا اور اب میں اس میں رہ رہی تھی۔

میں نے تصویر پر نظریں جما دیں۔ وہ سب سے زیادہ جاذبِ نگاہ آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں تک رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہی اس کی منگیتر تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی، بنی نوعِ انسان کی محبت، اپنے ملک کی محبت، اپنی منگیتر کی محبت —— وہ محبت کا خوبرو پیکر لگتا تھا۔ میں وہاں سے ہٹنے لگی تو تصویر کی آنکھیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں رک گئی اور بے بس سا ہو کے تصویر سے سرگوشی میں کہا — "جوناتھن! اگر تم میرے منتظر تھے تو میں آ گئی ہوں" —— معاً میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑتی محسوس کی اور میرا جسم تھرتھر کانپ کر ساکن ہو گیا۔

"میں اس شخص کو جانتی ہوں" میرے دل سے آواز آئی "میں اس خوبرو آدمی کی سانسوں کی تپش سے بھی واقف ہوں" میرے ہونٹوں سے سرگوشی پھسل گئی۔ اگر یہ مرد اس مکان میں آتا ہے تو میں اس کی بھٹکی ہوئی روح سے کبھی نہیں ڈروں گی۔ میں اس کا انتظار کروں گی —— اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں نے یہ مکان اسی آدمی کے لیے کرائے پر لیا ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں آج رات اس کا انتظار کروں گی۔

میرے خیالوں میں یہ انقلاب کیوں آیا تھا؟ کیا یہ میرے جذبات کی شدت تھی؟ کون سے جذبات کی شدت؟ —— مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اتنا ہی یاد ہے کہ میرے ذہن اور دل سے اپنے منگیتر لیری کا نام دھل گیا تھا جیسے لیری کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اگر اس کا کوئی وجود تھا تو اس کا نام لیری نہیں جوناتھن تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو شاید میں پاگل ہو گئی تھی اور اگر ایسا نہیں تھا تو بھی میں پاگل ہو گئی تھی۔

میں جانے کتنی دیر جوناتھن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہیں کھڑی رہی۔ لوگ اسے واہمہ کہیں گے لیکن میں نے تصویر کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھی جو آئی اور غائب ہو گئی۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ چمک اٹھیں۔ میں ان آنکھوں کا سامنا نہ کر سکی اور وہاں سے تیز قدم آ گئی۔ گاؤں کی طرف جاتے ذہن میں ایک ہی جنون تھا کہ میں آج رات جوناتھن کو دیکھوں گی۔ کل رات وہی میرے قریب صوفے پر آ بیٹھا تھا اور اس سے پہلے اسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

لیکن وہ اس رات نہ آیا۔ دوسری رات بھی نہ آیا۔ میں رات بہت دیر تک کروں۔ برآمدوں اور باغیچے میں گھومتی رہی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جوناتھن آیا بھی تو وہ اس کی بدروح ہو گی لیکن اب میرے دل میں خوف کی جگہ والہانہ محبت تھی۔

تین ہفتے لنڈ گئے۔ ان تین ہفتوں میں مکان طلسم ہوشربا کی طرح میرے اعصاب پر سوار ہو گیا اور مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ مکان میرے ہی لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ میں جب کھڑکی کھول کر سبز پوش پہاڑیوں کا نظارہ کرتی تو مجھے یقین ہونے لگتا کہ جوناتھن کو معلوم تھا کہ مجھے ہری بھری پہاڑیاں اچھی لگتی ہیں۔ اسی لیے اس نے اس طرف دو کھڑکیاں بنوائی تھیں۔

اس دوران جرمنی سے ٹیری کے تین خط آئے تھے اور میں نے بے خیالی میں ہر خط کا جواب دے دیا لیکن خط لکھ کر کچھ بھی یاد نہ رہا کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ میں شاید ہر خط میں اس مکان کی تعریف کرتی تھی۔ کیونکہ ٹیری نے چوتھے خط میں لکھا کہ معلوم ہوتا ہے یہ مکان تمہارے دل میں بری طرح سما گیا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ میں اس مکان میں نہیں رہ سکوں گا۔ میں جلدی آ رہا ہوں۔ آ کر فیصلہ کروں گا۔

ٹیری کا یہ خط دیکھ کر مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ ٹیری کی شکل و صورت کیسی ہے۔ یوں لگا جیسے میں نے اسے کہیں راہ جاتے دیکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ میں جلدی آ رہا ہوں۔ میں سوچنے لگی کہ وہ کیوں آ رہا ہے؟ اسے میرے پاس آنے کی کیا جلدی ہے؟ میں نے ذہن پر زور دے کر ٹیری کی شکل و صورت کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے چہرے کے خطوط جوناتھن کی تصویر بنتے چلے گئے۔

جوناتھن کو ایک نظر دیکھنے کے لیے میری بے چینی روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ٹیری سے مجھے کس قدر محبت ہوا کرتی تھی۔ میں نے کتنے ارمانوں سے اس سے منگنی کی تھی۔ اس کی منگنی کی انگوٹھی اب بھی میری انگلی میں تھی مگر ٹیری کا نام دل سے محو ہو گیا تھا اور اس کی جگہ جوناتھن نے لے لی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ جوناتھن بد روح ہے۔ جیتا جاگتا انسان نہیں پھر بھی میں اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہوتی جا رہی تھی، اور یہ خیال دل میں پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا کہ جوناتھن میرا ہمجولی ہے۔

چند ہی روز ہوتے نفسیات کے ایک ڈاکٹر نے میری اس ذہنی کیفیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے جو میرے لیے قابلِ فہم ہوتے ہوئے بھی بے معنی سا لگتا ہے۔ یہ تو خیر بعد کی بات ہے۔ میں اس مکان کا ذکر کر رہی تھی۔ میں ایک شام اس ایک صدی پرانے مکان کے بڑے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی کہ کھڑکی کے سامنے جا رکی۔ کھڑکی کے کواڑ پر نظر پڑی تو ایک جگہ کھدے ہوئے حروف نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو لکھا تھا جوناتھن — یہ شاید اس نے خود ایک سو سال پہلے چاقو کی نوک سے لکھا تھا۔ میں چاقو لے آئی اور اس نام کے ساتھ اپنا نام کھود ڈالا۔ میں نے بلند آواز سے کہا — "کیوں جوناتھن! تمہارے ساتھ میرا نام کیسا لگتا ہے؟"

کمرے میں مردانہ ہنسی کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ یہ واہمہ نہیں تھا۔ نہ یہ میرے تصور کا کرشمہ تھا۔ ہنسی کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔ جیسے کمرے میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔ میں نے سرعت سے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ ہنسی کی ہلکی ہلکی گونج کمرے میں بھنک رہی تھی۔ کمرہ سرد ہو گیا تھا۔ میں جسم کے اندر بھی ویسی ہی انوکھی سی سردی محسوس کرنے لگی۔ چلتے قدم رک گئے تھے۔ میں نے خلاؤں میں گھورا۔ میری نگاہوں نے کمرے کا گوشہ گوشہ چھان مارا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ کمرے میں خنکی کی جو لہر آئی تھی وہ یک لخت ختم ہو گئی۔ دروازے کے کواڑ ہلے اور بند ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ کمرے میں کوئی آ کے نکل گیا تھا۔

"واپس آ جاؤ جوناتھن!" میں نے بلند آواز سے التجا کی لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ کمرے میں پہلے کا سا سکوت تھا۔ معاً یوں لگا جیسے کوئی طاقت مجھے باہر نکلنے کو دھکیل رہی ہو۔ میں نے شاید پیٹھ پر کسی کے ہاتھ کا ہلکا سا اور پیارا سا دھکا بھی محسوس کیا تھا۔

میں کمرے سے نکلی۔ برآمدے کی سیڑھیوں تک گئی تو دیکھا کہ وہاں گلاب کا تازہ پھول پڑا تھا۔ میں نے پھول اٹھا لیا اور ذہن پر زور دیا کہ یہ پھول میں نے تو نہیں توڑا تھا۔ میرے سوا یہاں کوئی آتا بھی نہ تھا۔ بچے بھی نہیں تھے۔ پھر یہ پھول کس نے توڑ کر میری راہ میں رکھا ہے۔ میں سمجھ گئی جوناتھن آیا تھا۔ وہی کمرے میں آ کر نکل گیا تھا۔ یہ اسی کی روح تھی جو مجھے پھول دے گئی ہے۔

میں نے پھول کو چوم کر کہا — "شکریہ جوناتھن!" — اس کے

ساتھ ہی میرے بال یوں ہلے جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے اڑے ہوں
لیکن ہوا کے اس جھونکے کو میں نے چہرے اور جسم کے کسی اور حصے پر
محسوس نہیں کیا تھا۔ میں نے ماتھے پر پڑے بالوں کو اپنے ہاتھ سے
پیچھے کیا تو میرا ہاتھ ایک مردانہ ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ میں دم بخود ہو گئی۔ انسانی
انگلیاں میرے بالوں میں رینگ رہی تھیں۔ میں نے ریڑھ کی ہڈی میں
یخ بستہ لہر محسوس کی۔ میں نے غلطی کی کہ اپنا ہاتھ سر تک لے گئی۔ ورنہ یہ
طلسم کچھ دیر اور قائم رہتا۔ میں نے جوں ہی اپنا ہاتھ سر پہ رکھا۔ ان غیر مرئی
انگلیوں کا لمس ختم ہو گیا۔ میں نے گھوم کے دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میں
اکیلی تھی۔ تنِ تنہا!

میں کمرے میں چلی گئی اور وہ رات بھی گزر گئی۔ اس روز کے
بعد مجھے بلند آواز سے بولنے کی عادت ہو گئی۔ شاید یہ تنہائی کا اثر تھا
کہ میں کچھ سوچتی بھی تھی تو بلند آواز سے سوچتی تھی۔

میں نے دوسرے روز اس میز کو دیکھا جو میں نے اس عورت
سے خریدی تھی۔ اس نے یہ بتایا تھا کہ یہ ایک سو سال پرانی میز ہے۔
جانے مجھے کیوں یقین ہونے لگا کہ یہ میز اسی مکان سے گئی تھی اور اس
کا پہلا خریدار جوناتھن تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کا پھیکا پھیکا روغن اتار
دوں اور اسے از سر نو پالش کر دوں۔ میں روغن کو چھری سے رگڑنے لگی
اور بلند آواز سے کہا ــــ "یہ تمہاری میز تھی۔ جوناتھن! دیکھو میں اسے
پھر چمکا دوں گی۔ تم دیکھ رہے ہو نا؟ تم نے یہ میرے لیے ہی خریدی
تھی نا؟"

کمرے میں اسی پراسرار خنکی کی لہر دوڑ گئی پھر یہ لہر میرے وجود میں
سرایت کر گئی۔ کواڑ ذرا سے ہلے اور کمرہ پھر معمول پر آ گیا۔ میں نے بلند
آواز سے کہا ــــ "آجاؤ جوناتھن! اب نہ جایا کرو۔ تم نے سو سال میرا انتظار
کیا ہے۔ میں آئی تو تم چلے گئے" ــــ میں ہنس پڑی اور پیار بھرے لہجے
میں بولی ــــ "تم نے میری بلی کو بھی ڈرا کر بھگا دیا ہے۔"

کمرے کی فضا میں بے چینی سی پیدا ہوئی۔ جیسے آندھی کا تند جھونکا
گھوم گیا ہو۔ باہر تو ہلکی ہلکی ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ میں نے کمرے میں
ہر سو جھانکا۔ تند جھونکے کے باوجود کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے
ساکن تھے۔ میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر میز کا روغن اتارنے لگی۔ میز کے
دو دراز تھے۔ ایک تو کھل گیا لیکن دوسرا نہ کھل سکا۔ بہت مضبوطی سے
بند تھا۔ میں نے ٹھونک ٹھونک کر اسے کھول ہی لیا۔ معلوم ہوتا تھا
جیسے یہ ایک سو سال سے بند ہو۔ اس دراز میں دو پیلے پیلے کاغذ کے
ساتھ کتاب کے سائز کا ایک ڈبہ پڑا تھا۔ میں نے ڈبہ کھولا تو اس میں شادی
کی ایک بیش قیمت انگوٹھی اور دو تصویریں تھیں ــــ ایک تصویر جوناتھن
کی تھی اور دوسری میری تھی۔ اپنی تصویر دیکھ کر مجھے ڈر جانا چاہیے تھا
لیکن میرے دل میں خوف کی بجائے محبت کا طوفان اٹھ آیا۔

وہ تصویر یقیناً میری تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لباس ایک سو
سال پرانے فیشن کا تھا اور بال بھی اسی دور کے انداز سے بنے ہوئے
تھے۔ میں تصویر کو دیکھ رہی تھی کہ میں نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا
لمس اور بوجھ محسوس کیا۔ ہاتھ آہستہ آہستہ سرکتا میری گردن تک آ گیا۔ گردن
کے گرد بکھرے ہوئے بال پیچھے ہٹ گئے اور وہ ہاتھ میری گردن کو
سہلانے لگا۔ انگوٹھی میرے بائیں ہاتھ میں تھی۔ یہ ہاتھ آپ ہی آپ میرے
دائیں ہاتھ کی طرف بڑھا۔ دایاں ہاتھ از خود اوپر اٹھ گیا اور بائیں ہاتھ نے
میری اپنی کوششوں کے باوجود انگوٹھی دائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنا دی۔

"میں نے ٹھیک کہا تھا جوناتھن!" میں نے بلند آواز سے کہا۔ "یہ
میز تمہاری ہے۔"

برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی پھر دروازے
پر دستک ہوئی۔ میں نے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا ــــ "جوناتھن آ گیا۔"
ــــ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا کہ ڈاکیہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لفافہ
تھا کہنے لگا ــــ "یہ ایکسپریس لیٹر ہے۔ اس لیے بے وقت آیا ہوں" ــــ
اور وہ خط دے کر چلا گیا۔

مایوسی اور غصے نے مجھے بے حال کر دیا۔ میں نے غصے سے
لفافہ کھولا۔ یہ ٹیری کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا ــــ "تمہارے پچھلے دو
تین خط اس قدر مہمل اور بے معنی ہیں۔ جیسے تم نے نیند میں لکھے ہوں یا
شاید تمہارا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ بعض فقرے ایسے ہیں جن سے پتہ
چلتا ہے کہ تم خوابوں کی دنیا میں جی رہی ہو۔ مجھے تمہارے متعلق پریشانی

ہونے لگی ہے۔ اس ویرانے سے نکل کر شہر جا کے رہو اور لوگوں میں اٹھو بیٹھو۔ میں چند دنوں تک واپس آرہا ہوں۔" خط میں نے بے دلی سے پھینک دیا اور آئینہ دیکھا تو دھند سی چھا گئی۔ اس دھند میں سے ایک سایہ سا گذر گیا اور دھند چھٹ گئی۔ میرا عکس پھر نکھر آیا۔ میرے آنسو نکل آئے میں نے رندھیائی ہوئی التجا کی — "جوناتھن! سامنے آجاؤ۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ایک بار، ایک ثانیے کے لیے سامنے آجاؤ" — کمرے میں مجھے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ دروازے کے کواڑ کھٹکے۔ کمرے میں خنکی کی لہر آئی اور گذر گئی۔ میری مایوسی اور بڑھ گئی۔

میں دوسرے دن باغیچے میں ٹہل رہی تھی کہ میرا دایاں بازو خود ہی ذرا اوپر اٹھا اور ایک ہاتھ نے اسے تھام لیا۔ میں نے چونک کے دیکھا۔ میں اکیلی تھی لیکن میرے دائیں بازو کے ساتھ کسی مرد کا بازو لگا ہوا تھا۔ پھر میری انگلیاں مردانہ انگلیوں میں الجھ گئیں۔ باغیچے سے ایک کتا گذر رہا تھا۔ وہ رک گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ بڑی زور سے بھونکا اور یوں بدک کر بھاگ گیا جیسے کسی نے اسے پتھر مار دیا ہو مجھے یقین ہو گیا کہ میرے ساتھ جوناتھن کی روح یا بدروح ٹہل رہی ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ بدروحیں کتوں اور بلیوں کو نظر آجاتی ہیں۔

میں اسی کیفیت میں ٹہلتی رہی۔ میرا جسم سرد ہوتا چلا گیا۔ میں نے کہا "جوناتھن! مجھے اپنی صورت دکھا دو" — جواب میں مجھے اس کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ معاً میرا اٹھا ہوا بازو میرے پہلو سے آلگا اور مجھے دور ہٹتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے رک کے دیکھا۔ ہوا ساکن تھی پھر بھی گلاب کا پودا بڑے زور سے ہلا اور ایک پھول ٹہنی سے ٹوٹ کر گرا۔ میں نے لپک کر پھول اٹھا لیا۔ جوناتھن کی روح جا چکی تھی۔

اس سے اگلی صبح میں گہری نیند سو رہی تھی کہ آنکھ کھل گئی۔ کسی کی انگلیاں میرے بالوں میں رینگتی میرے گالوں کو مس کرنے لگیں اور ہونٹوں پر آئیں تو لمس ختم ہو گیا۔ میں اٹھ بیٹھی اور خلا میں گھورنے لگی۔ کمرہ سرد تھا۔ پھر یک لخت پہلے کی طرح گرم ہو گیا حسب معمول دروازے کے کواڑوں کو جنبش ہوئی اور کواڑ ساکن ہو گئے۔

دن کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے چائے تیار کی۔ باہر کی فضا میں آندھی کے آثار ابھرنے لگے۔ ہوا تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ اس وقت یاد آیا کہ جوناتھن طوفان میں مرا تھا۔ اس پر بجلی گری تھی۔ آج بھی طوفان کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں دعائیں کرنے لگی کہ ویسا ہی طوفان آئے جیسے طوفان میں جوناتھن مرا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ طوفان میں آئے گا۔

دروازے پر بڑی زور سے دستک ہوئی۔ میرے دل سے آواز اٹھی — "وہ آگیا!"

میں نے بھاگ کے دروازہ کھولا تو دل ڈوب گیا۔ میرے سامنے ٹیری کھڑا تھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر کہا — "کیوں؟ ڈر گئی؟ میں نے لکھا نہیں تھا کہ میں آرہا ہوں؟"

میں نے خوشی کا اظہار کرنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن میں مایوسی کو نہ دبا سکی۔ ٹیری اندر آیا اور نفرت آلود نگاہوں سے کمرے کی ہر چیز کا جائزہ لگا کر کہنے لگا — "حیران ہوں تم اس صدیوں پرانے مکان میں کس طرح رہ رہی ہو۔ فوراً سامان باندھو اور شہر چلو" —

اس نے میرے جواب اور ردِ عمل کا انتظار کیے بغیر کہا — "اور یہ فرنیچر — معلوم ہوتا ہے کسی عجائب گھر سے اٹھا لائی ہو" — اس نے میز کو ٹھوکر مار کر کہا — "لعنت ہے اس ایندھن پر۔ یہ میز جلانے کے کام آسکتی ہے" — اس نے میرا ہاتھ پیار سے تھام کر کہا — "ڈینی! تم میری بیوی بننے والی ہو۔ میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

مجھے غصہ آگیا جیسے کوئی اجنبی آدمی مجھے زبردستی اپنی بیوی بنا رہا ہو۔ حالانکہ وہ میرا منگیتر تھا اور مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ میں نے تین برس اس کے انتظار میں گذار دیئے تھے لیکن جوناتھن کی روح یا بدروح نے ٹیری کو میرے لیے اجنبی بنا دیا تھا۔ میں نے خود سر ہو کے کہا — "جو جگہ تمہیں اچھی نہیں لگتی وہ مجھے عزیز ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔"

"میں تمہیں ابھی لے جاؤں گا" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی" میں نے فیصلۃً کہا "تم ابھی چلے جاؤ۔ میں ایک ہفتے بعد آسکوں گی۔"

ہوتے ہوتے بات بڑھ گئی اور ٹیری کے لہجے میں خاوندوں کا

تحملانہ انداز ترش ہو گیا۔ وہ کہہ بیٹھا۔ "میں تمہاری مرضی کا پابند نہیں رہ سکتا۔ میں تمہیں شہر لے جاؤں گا۔"

میں نے اس کی منگنی کی انگوٹھی اتاری اور اس کی طرف بڑھا دی۔ "یہ رہی تمہاری آزادی۔ میں تمہیں اپنا پابند نہیں رکھنا چاہتی۔ اپنی انگوٹھی واپس لے لو اور ابھی چلے جاؤ۔"

ٹیری کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے مجھے حیرت زدہ ہو کے دیکھا۔ اس نے انگوٹھی لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عین اس وقت کمرے میں سردی کی پراسرار لہر دوڑ گئی۔ ٹیری چونکا اور کمرے میں ہر سُو دیکھنے لگا۔ دروازے کے کواڑ کھٹکے۔ ٹیری نہ سمجھ سکا کہ یہ سب کیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ جوناتھن کی روح کمرے میں آگئی ہے۔ اس روح نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں نے انگوٹھی ٹیری کی طرف پھینک کر کہا۔ "ٹیری جاؤ۔ یہاں سے نکل جاؤ۔ میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں، کوئی بندھن نہیں۔"

وہ آخر مرد تھا اپنی توہین برداشت نہ کر سکا۔ اس نے جھک کر انگوٹھی اٹھائی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا اور کمرے سے نکل گیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ ٹیری نے جرمنی میں تین برس میرے لیے پیسہ بچایا اور میرے لیے حسین خواب تخلیق کیے تھے لیکن اس روز مجھے اس پر غصہ آگیا۔ جوناتھن کی روح آئی تھی۔ اگر ٹیری نہ ہوتا تو شاید وہ مجھے نظر آجاتی۔

میں نے دوسرے ہاتھ کی انگلی کو دیکھا جس میں میں نے جوناتھن کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ میں نے اس ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ میں تھاما اور آنکھیں بند کر کے کہا۔ "جوناتھن! تمہاری اس انگوٹھی کے ساتھ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر تمہیں اپنا خاوند قبول کرتی ہوں۔"

کمرہ بھونچال کے شدید جھٹکے سے ہل گیا۔ پھر ساکن ہو گیا۔ دروازے کے کواڑوں کو ایک بار پھر جنبش ہوئی۔ باہر کی ہوا اور تند ہو گئی۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔ "جوناتھن! اب آجاؤ۔" اور میں خواماں خواماں سونے والے کمرے میں چلی گئی۔ میں تو اب بدروحوں سے زیادہ کی مخلوق بنتی جا رہی تھی۔

رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ میں دلہن کے روپ میں جوناتھن کا انتظار کر رہی تھی۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر اس کی بیوی بن چکی تھی۔ میرے کان باہر کی آوازوں پہ لگے ہوئے تھے۔ میں اس کے قدموں کی چاپ سننا چاہتی تھی۔ ذرا دیر بعد چاپ سنائی دی لیکن یہ انسانی قدموں نہیں بلکہ بارش کی تھی۔ بارش برسنے لگی تھی جو ذرا سی دیر میں تیز ہو گئی میں نے بتی بجھا دی اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ جوناتھن کی روح ضرور آئے گی اور اس نے مجھے اپنی بیوی بنا لیا ہے۔ میرے شعور میں یہ حقیقت بالکل نہ آئی کہ میں زندہ ہوں اور وہ مرے ہوئے آدمی کی روح ہے۔

بجلی بڑی زور سے چمکی۔ ساتھ ہی بجلی کے دھماکے نے مکان کو ہلا دیا۔ تند ہواؤں کی چیخیں اور زیادہ بلند اور کرخت ہو گئیں۔ میرا دل مسرت سے اچھلنے لگا کیونکہ جوناتھن ایک سو برس پہلے اسی قسم کے طوفان میں ہلاک ہوا تھا۔ اس پر بجلی گری تھی۔ آج بھی بجلی چمک رہی تھی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ زمانہ ایک سو برس پیچھے چلا گیا ہے یا یہ طوفان ایک سو برس پہلے کا ہے جو جوناتھن کو واپس لا رہا ہے۔

بارش تیز تر اور آندھی تند تر ہو گئی۔ بجلی رہ رہ کر چمکنے اور کڑکنے لگی۔ مکان سیلابی دریا میں بہتی کشتی کی طرح ڈول رہا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔ "جوناتھن! آجاؤ۔" میری پکار کے جواب میں بجلی اس قدر شدت سے کڑکی کہ میں نے چیخ مار کر ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ اندھیرا کمرہ بجلی کی چمک سے روشن ہوا اور پھر اندھیرا ہو گیا۔ بجلی کے اس دھماکے نے مکان کو بنیادوں تک ہلا ڈالا اور مجھے کچھ ایسی تڑاخ تڑاخ کی دبی دبی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے کہیں آگ لگی ہوئی ہو اور لکڑیاں جل رہی ہوں۔

طوفان قیامت خیز ہوتا گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اندھیرے میں یوں محسوس ہوا جیسے کمرہ دھوئیں سے بھر رہا ہو۔ میں نے لپک کر بتی کا بٹن دبایا لیکن روشنی نہ ہوئی۔ بجلی کی رو کٹ چکی تھی۔ میں دوسرے کمرے میں آئی تو اس کمرے کو دھوئیں سے بھرا ہوا پایا۔ قریب ہی کہیں۔ برآمدے یا کسی کمرے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس وقت میں حقیقت کی طرف لوٹنے لگی لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ اتنے میں مجھے

...شعلوں کے بھوت ناچتے نظر آئے۔ میں کچھ سمجھنے
...رہی تھی کہ مکان بڑی زور سے ہلا اور بھیانک گڑگڑ
...سنائی دی۔ جیسے مکان کا کوئی حصہ گر پڑا ہو شعلے اور زیادہ بلند
...لگے۔ اس کے ساتھ ہی بارش یک لخت ختم ہو گئی مگر ہوا تیز تھی۔

میں سیڑھیوں کی طرف بھاگی تو معلوم ہوا کہ میں شعلوں میں گھر
...میں بالائی منزل میں تھی۔ نکلنے کی اور کوئی راہ نہیں تھی۔ ہوا
...شعلوں کو تیزی سے پھیلا رہی تھی۔ پھر یوں بھیانک آواز
...جیسے زمین و آسمان تہہ و بالا ہو گئے ہوں۔ شعلے لپکتے رہے اور میری
...کھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا گیا۔ شاید میں گر پڑی تھی اور چھت
...حصہ بھی مجھ پر گرا تھا۔ بے ہوش ہوتے ہوتے مجھے کسی کی مانوس
...سنائی دی ... حوصلہ کرو۔ میں آ گیا ہوں۔ میں تمہیں مرنے
نہیں دوں گا۔ کوئی مجھے اٹھا رہا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔

ہوش آیا تو سب سے پہلے جس پر نظر پڑی وہ لیری تھا۔ وہ میرے
سامنے بیٹھا تھا اور میں ہسپتال میں پڑی تھی۔ میرے دونوں بازو پٹیوں
میں جکڑے ہوئے تھے ماتھے پر ٹھنڈی پٹی رکھی تھی۔ جسم کا انگ انگ
دکھ رہا تھا۔ لیری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر بھی جب میں نے آنکھیں
کھولیں تو اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ جب طوفان
شدید ہو گیا تو وہ اس خیال سے شہر سے میرے مکان کی طرف بھاگ
نکلا کہ میں اس قیامت خیز طوفان میں ڈر رہی ہوں گی۔ جب وہ مکان سے
ایک آدھ میل دور ہی تھا تو مکان کے ایک حصے پر بجلی گری۔ باورچی خانے
میں مٹی کے تیل کا کنستر پڑا ہوا ہو گا جو جل اٹھا۔ قریب لکڑی کا زینہ تھا اس
نے آگ پکڑ لی۔ ہوا کی تیزی کی وجہ سے آگ بہت تیزی سے پھیل گئی۔

جب لیری مکان تک پہنچا میرے پڑوسی بھی پہنچ چکے تھے آدھا
مکان ان کے سامنے گرا۔ دو آدمی جن میں لیری بھی تھا، پچھواڑے سے
سیڑھی لگا کر اوپر پہنچے اور کھڑکی سے کود کر اندر گئے۔ لیری نے مجھے
...فرش پر پڑا دیکھ لیا اور اٹھا لیا۔ سب نے بڑی مشکل سے مجھے جلتے
مکان سے نکالا۔

چند دنوں بعد میرے زخم ٹھیک ہو گئے۔ کچھ دنوں تک دماغ
بے ٹھکانہ رہا اور دل پریشان۔ میں نے جوناتھن کی روح ...
میں دفن کر کے لیری سے شادی کر لی مگر ذہنی حالت بگڑتی چلی گئی ...
ایک روز میں نے لیری کو ساری بات بتا دی۔ وہ مجھے نفسیات کے
ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بچپن سے لے کر مکان
جلنے تک کے حالات پوچھے پھر کئی روز طرح طرح کے سوالوں سے
مجھے پریشان رکھا۔ آخر اس نے تشخیص کی کہ یہ اعصاب ... ہے جس
کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں تین برس لیری کے انتظار میں بیقرار اور تنہا رہی۔
دوسرے یہ کہ خالہ نے مجھے خاموشی پسند بنائے رکھا اور مجھے تنہائی کی
دنیا میں قید کر دیا۔ تیسرے یہ کہ میں قدیم زمانے کے واقعات اور کہانیاں
زیادہ پڑھتی رہی۔ ان وجوہات اور خارجی اثرات کی بنا پر میری ذہنی
کیفیت میں ایسا خلا پیدا ہو گیا جسے جوناتھن کی ایک سو سالہ پرانی کہانی
نے محسوس واقعہ کی صورت میں پورا کر دیا۔

سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں تین برس کی عمر میں ماں باپ
کی محبت اور شفقت سے محروم ہو گئی تھی۔ نتیجۃً ایک ... سینے
کا ابھرا ہوا جوناتھن میرے ڈرتے ہوئے ماں باپ کی علامت بن گیا۔

اس ڈاکٹر نے مجھے قائل کر لیا کہ اس مکان میں کوئی بھوت نہیں
تھی نہ روحیں واپس آیا کرتی ہیں۔ یہ محض اعصاب زدگی ... کی
افراتفری اور جذباتی گھٹن کا کرشمہ تھا۔

میں نے ڈاکٹر کی تشخیص کو تسلیم کر لیا ہے لیکن لیری کو دیکھتی
ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے یہ لیری نہیں جوناتھن ہے جو ایک سو برس بعد
واپس آ گیا ہے۔

جوناتھن کا ایک صدی پرانا مکان جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ مکان
اب جلے ہوئے کھنڈر ہیں۔ میں اب بھی کبھی کبھی نفسیات اور بھوت
کے درمیان بھٹک جاتی ہوں لیکن لیری کی محبت مجھے سنبھال لیتی ہے
جوناتھن کو اس کی منگیتر دھوکا دے گئی تھی۔ میں لیری کو دھوکا نہیں
دوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سو سال بعد اس کی روح بھی ...
بھٹکتی پھرے۔

میرا وجود تقسیم ہو چکا تھا۔۔۔ ایک انسان اور دوسرا بھیڑیا، شائستگی اور درندگی۔ میں مر رہا ہوں، میں بھیڑیا نہیں انسان ہوں۔"

انسان یا بھیڑیا

ابو عدیل

تین

جو ان تینوں دو دو دن کے وقفے سے قتل ہو گئے تو میرا سر چکرا گیا۔ ایک ہی بار تین تفتیشیں سنبھالنا بڑا مشکل ہوتا ہے اور یہ مشکل صرف اُسے پیش آتی ہے جو سچے دل سے تفتیش کرنا چاہے ورنہ آج کل ایک ایک تھانے میں ایک ایک سو قتل، ڈکیتی، قفل شکنی اور چوری چکاری کے کیس رجسٹر کیے ہوتے ہیں اور تھانے کا عملہ اس طرح بے نیاز نظر آتا ہے جیسے اللہ نے ان کی سب مشکلیں آسان کر دی ہوں۔

قتل کی ان تین وارداتوں کی تفتیش سنانے سے پہلے میں آپ سے ایک نازیبا بات پوچھنا چاہتا ہوں —— وہ آپ حسین عورت کسے کہتے ہیں؟ —— مجھے معلوم ہے کہ آپ کا جواب کیا ہوگا۔ "رنگ گورا، قد بوٹا، آنکھیں موٹی موٹی، عمر سولہ سترہ سال، زلفیں لمبی اور پیچدار، ہونٹ گلاب کی پتیاں، دانت چمکتے موتی اور گال کشمیری سیب کی طرح" —— شہروں میں حسن کو کسی اور طرح پرکھتے ہیں لڑکی بال کٹوا کر، منک منک کر میموں کی طرح انگریزی میں اُردو بولے اور ہر طرح سے بے حیا ہو تو اسے "بے حد حسین" سمجھا جاتا ہے۔ دیہات والوں کا معیار ذرا مختلف ہے۔ شاعر اور افسانہ نویس الفاظ میں حسن

کرتے ہیں وہ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔ شاید آپ نے دیکھا ہو۔
البتہ میری رائے یہ ہے کہ ہر کسی کی اپنی پسند ہوتی ہے لیکن آپ نے
ایسی عورت کبھی دیکھی ہوگی یا شاید کبھی بھی نہ دیکھی ہو جسے دیکھ کر آپ
بجلی کی کرنٹ کا جھٹکا محسوس کریں۔ چلتے چلتے رُک جائیں اور اس سوچ
میں غرق ہو جائیں کہ اس عورت میں کیا ہے جس نے مجھے جکڑ لیا ہے۔

ایسی ایک عورت میں نے دیکھی تھی۔ اس کا رنگ گورا نہیں تھا۔
قد لمبا نہیں تھا۔ آنکھیں موٹی موٹی نہیں تھیں۔ عمر سولہ سترہ سال نہیں
تھی۔ زلفیں لمبی اور پیچدار نہیں تھیں۔ ہونٹ گلاب کی پتیاں نہیں
تھے اور گال کشمیر کے سیب کی طرح نہیں تھے البتہ دانت چمکتے موتی معلوم
ہوتے۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ وہ دیہاتن تھی جسے میں نے پہلی بار دیکھا
تو اس نے بالوں میں کنگھی نہیں کی ہوئی تھی اور منہ بھی نہیں دھویا تھا۔
اس کے جسم سے مویشیوں کے گوبر اور اپنے پسینے کی بدبو آرہی تھی
مگر میں نے اسے دیکھا تو میری تھانیداری کانپ گئی تھی۔ میں سچ کہتا
ہوں کہ اگر شاعر اور افسانہ نویس اس عورت کو دیکھ لیتے تو اپنی نظمیں
اور افسانے پھاڑ کر کوئی اور دھندا شروع کر دیتے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ بوڑھے احمد یار خان نے یہ کیا جوانوں
کی طرح خرافات شروع کر دی ہے مگر صاحب۔ وہ عورت یاد آتی ہے
تو میں بہت دیر گم سم بیٹھا رہتا ہوں۔ دراصل مجھ جیسے جذباتی آدمی کو
تھانیدار ہونا ہی نہیں چاہیے تھا ——— تو آؤ صاحب، آپ کو
پہلے کہانی سنا دیتا ہوں پھر بتاؤں گا کہ گورے رنگ کی عورت حسین
ہوتی ہے یا سانولے رنگ کی، اور حسن ہوتا کیا ہے۔ میں حسب معمول
اس کہانی کے اشخاص اور گاؤں کے نام فرضی استعمال کروں گا کیونکہ
ہو سکتا ہے ان تین خاندانوں کے افراد پاکستان میں موجود ہوں۔ میں
گڑھے مُردے اکھاڑتے ہوئے کسی خاندان کی نشاندہی کر کے اس
کی توہین کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ اللہ سب کو عزت اور آبرو عطا کرے۔

وہ ہندوستان کے ایک دیہاتی علاقے کا تھانہ تھا۔ وہاں
مسلمان دیہاتی، خاندانی دشمنیوں کی بنا پر، پانی لگانے کی باری پر، بیاہ
شادیوں اور رشتے ناطوں کی ناچاقیوں پر ایک دوسرے کا خون بہاتے
رہتے تھے۔ اس زمرے میں قتل کی جو وارداتیں ہوتی تھیں ان کی تفتیش
میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ اس تھانے کا چارج لینے کے فوراً
بعد، میں نے علاقے میں مخبروں کا جال بچھا دیا اور ہر اس مسلمان اور
سکھ خاندان کی دشمنیوں، پچھلی لڑائیوں اور ان کے آئندہ ارادوں کی
ہسٹری اپنے پاس محفوظ کر لی جن کے ہاں لڑائی جھگڑے اور خون خرابے
ہوتے رہتے تھے۔ وہاں کے عادی لٹھ بازوں اور فسادیوں کی
فہرست بھی تیار کر لی۔ پولیس کے خوشامدیوں اور دو طرفہ مخبری کرنے
والوں کے نام بھی لکھ لیے۔ چھ مہینوں میں میرے پاس دشمنی کے
زمرے کی کچھ وارداتیں آئیں جن کی تفتیش میں میری فراہم کی ہوئی
معلومات نے بہت مدد کی اور میں نے تھانے میں بیٹھے بیٹھے پوری
کامیابی سے مقدمے قائم کر لیے۔

ساتویں مہینے کے دوران ایک روز میں تھانے کے برآمدے
میں بیٹھا تھا کہ مجھے چند آدمی آتے نظر آئے۔ چار کے کندھوں پر چارپائی
تھی۔ چارپائی پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل الشیر سنگھ
سے کہا ——— "لو الشیرے، آج مسلمانوں نے ایک اور آدمی پھڑکا دیا
ہے" ——— میں اُن لوگوں کو دیکھ کر انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا
تھا۔ وہ معمولی سی قسم کے دیہاتی تھے۔ وہ تھانے کے احاطے میں آگئے۔
میں نے وہیں سے پوچھا "زندہ ہے یا مر گیا ہے؟" ——— سب
سے آگے آگے جو آدمی آرہا تھا اس نے جواب دیا ——— "مر گیا ہے چوہدری
صاحب" ——— اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ اس کا باپ
تھا۔ انہوں نے چارپائی برآمدے میں رکھ دی۔

لاش کے منہ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ جوان آدمی تھا۔ چہرے کا
رنگ گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ ناک سے خون نکل کر اوپر والے ہونٹ پر جم
گیا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا ——— "بڑا ہی تیز زہر دیا
ہے" ——— اس کے باپ نے روہانسی آواز میں کہا "ہاں چوہدری
صاحب، زہر دیا ہے"

"کس نے؟"

باپ نے سر ہلایا کہ معلوم نہیں اور وہ پھر دھاڑیں مارنے

لگا۔ مقتول اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ان لوگوں سے جو معلومات ملیں ان سے پتہ چلا کہ یہ غریب سا گھرانہ ہے۔ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں نہ کسی پر شک ہے نہ شک کی کوئی وجہ ہے۔ وہ صبح روزمرہ کی طرح کھیتوں پر گیا اور تقریباً بارہ بجے اس حالت میں واپس آیا کہ اس نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا سینے پر۔ آنکھیں باہر آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں داخل ہوا تو صحن میں گر پڑا۔ ناک سے خون نکل رہا تھا۔ اُٹھاتے اُٹھاتے مر گیا۔ لوگ آ گئے۔ سب نے کہا کہ تھانے لے جاؤ۔ اسے کسی نے زہر دیا ہے۔ مقتول کا نام قدیر تھا۔ اس کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ ابھی آٹھ مہینے ہوئے تھے۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے قدیر کے باپ نے بتایا کہ میاں بیوی میں کوئی ناچاقی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ سسرال کے ساتھ بھی تعلقات ٹھیک تھے۔ بیوی کے چال چلن پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ قدیر کی ماں چھ سال ہوئے مر گئی تھی۔ اس کی ایک بہن تھی۔ عمر بیس سال کے قریب۔ غیر شادی شدہ تھی۔

"ضروری نہیں کہ میاں بیوی آپس میں لڑیں تو ہی ناچاقی کا پتہ چلتا ہے۔" میں نے قدیر کے باپ کو الگ بٹھا کر کہا۔ "بعض اوقات میاں بیوی ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں لیکن کسی کو پتہ تک نہیں چلتا۔ اچھی طرح غور کرو اور مجھے بتاؤ کہ شادی کے بعد قدیر یا اس کی بیوی میں تم نے کوئی تبدیلی دیکھی تھی؟"

بوڑھے نے بہت سوچا۔ میں نے اسے سوچنے میں مدد دی۔ نُقطے دیئے تو اس نے کہا۔ "شادی کے ایک ماہ بعد قدیر چُپ چُپ رہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہنسی مذاق بھی کیا کرتا تھا لیکن ایک ہی مہینہ گزرا تو قدیر میں پہلے والی ہنسی نہیں رہی تھی۔"

"اور اس کی بیوی طبیعت کی کیسی ہے؟"

"جس طرح دیہات کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔" باپ نے جواب دیا۔ "اس میں کوئی شوخی نہیں۔ گھر کا کام کاج دلچسپی سے کرتی ہے۔ کھیتوں میں بھی جاتی ہے۔ قدیر کی بہن کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔"

میں اس کی ہر ایک بات پہ اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے پہلے کسی کہانی میں آپ کو بتایا تھا کہ دیہات کے لوگ کسی قیمت پر تسلیم نہیں کرتے کہ ان کی بیٹی یا بہو یا ان کا بیٹا یا داماد بدچلن ہے۔ اپنے شادی شدہ بیٹوں کی ازدواجی زندگی کے متعلق وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ اس کی بیوی اسے بہت چاہتی ہے۔ یہ کوئی باپ برداشت نہیں کرتا کہ اس کے بیٹے کے متعلق یہ مشہور ہو جائے کہ اسے اس کی بیوی ناپسند کرتی ہے۔ قدیر کے کیس میں مجھے یہی شک ہو رہا تھا۔ میں نے تفتیش کی جو زمین اپنے ذہن میں بنائی وہ یہ تھی کہ اسے بیوی نے زہر دیا ہے یا بیوی کے ایما پر اس کے آشنا نے یا قدیر نے خود زہر کھایا ہے۔ خودکشی کی وجہ اس کی اپنی بیوی کی بدچلنی بھی ہو سکتی تھی اور اپنی جوان بہن کی بدچلنی بھی۔ بدچلن بہن یا بیوی کو دیہاتی زندہ نہیں رہنے دیا کرتے لیکن بعض شریف خاوند یا بھائی اپنے آپ کو ختم کر لیا کرتے ہیں۔

کیس رجسٹر کیا۔ کاغذات تیار کیے اور لاش انہی لوگوں سے اُٹھا کر گیارہ میل دُور قصبے کے سول ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ اپنے مخبروں کے جال کو بیدار کیا۔ انہیں ضروری ہدایات بھیجیں۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی جب میں مقتول کے گاؤں میں داخل ہوا۔ لوگ مجھے مقتول کے گھر تک لے گئے۔ میں نے تمام غیر متعلقہ لوگوں کو گھر کے اندر جانے سے روک دیا۔ اپنے دونوں کانسٹیبلوں کو بھی باہر ہی کھڑا رہنے کو کہا اور میں اکیلا اندر گیا۔ اندر گاؤں کی عورتیں ماتم کے لیے جمع تھیں۔ میں نے سب کو نکال دیا۔ گھر میں قدیر کے باپ کے علاوہ دو لڑکیاں رہ گئیں۔ ایک بلاشک و شبہ قدیر کی بہن تھی مگر دوسری کو دیکھا تو میں نے اپنے وجود میں بجلی کا دھچکا محسوس کیا۔

پھر اس طرح ہوا جیسے بہت ہی تیزی سے میرے سر سے پاؤں تک بجلی کی کرنٹ گزر کر زمین میں چلی گئی ہو۔ میں بالکل بیان نہیں کر سکتا کہ اس میں کیا کشش تھی۔ میں پوری بے شرمی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ اس عورت کی خاطر اگر مجھے کسی آدمی کو قتل کرنے کی ضرورت پڑتی تو میں قتل کر گزرتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ تفتیش میں مجھے کہیں اور بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ قتل کا باعث یہی عورت ہے۔ اگر یہ واردات خودکشی

نہ ہے تو اس کا باعث بھی یہی عورت ہے۔ قدیر کی بہن کو میں نے بہت ہی گہری نظروں سے دیکھا۔ اپنے تجربے کی روشنی میں اس کی چال ڈھال کو پرکھا۔ وہ جوان تھی۔ شکل کی بری نہیں تھی لیکن دیکھنے سے اس پر بدچلنی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم میں صرف دیکھنے سے اسے اچھے چلن کا سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتا تھا۔

قدیر کی بیوی کو میں نے اندر بلا لیا۔ میں صحن میں بیٹھنے کی بجائے کمرے میں جا بیٹھا تھا۔ مقتول کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے پوچھا ——— "چوہدری صاحب، دودھ پئیں گے یا چائے؟ آپ رات کی روٹی یہیں کھائیں گے۔ میں غریب آدمی ہوں قبول کرلینا۔ گھر میں مرغیاں ہیں" ——— میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر نیچے کیے اور کہا کہ میں ماتم والے گھر بیٹھا ہوں۔ مرنے والے کا ابھی جنازہ بھی نہیں پڑھا گیا۔ مجھے گناہگار [illegible] میں اگر ساری رات یہاں بیٹھا رہا تو بھی کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں۔ پیاس لگی تو پانی مانگ لوں گا ——— اللہ مجھے معاف کرے۔ کبھی کھانے پینے کا لالچ نہیں کیا تھا۔ روپے پیسے کا کوئی لالچ نہ تھا۔ اللہ نے اس کا مجھے صلہ دے دیا ہے۔ آج سر اونچا کرکے بات کرسکتا ہوں اور اس سال تو خدا نے ایک معجزہ دکھایا ہے۔ میری اراضی کا علاقہ پانی میں ڈوب گیا ہے لیکن میری اراضی پانی سے صاف بچی ہوئی ہے۔ اگر دیکھیں تو آپ حیران ہوں گے۔ فصل کا ایک پودا ضائع نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ نے مجھے نیک نیتی کا انعام دیا ہے۔

قدیر کی بیوی اندر آئی۔ میں نے قدیر کے باپ کو باہر بھیج دیا۔ میں نے اس عورت کو بہت ہی غور سے دیکھا۔ اس نے دو تین دنوں سے کنگھی نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا جو کالا بھی نہیں تھا، گندمی بھی نہیں تھا۔ جوانی کے خون کا جوش چہرے پر صاف نظر آتا تھا۔ اس کی جو کشش تھی وہ اس کی آنکھوں میں تھی یا ناک کی ساخت میں یا شاید دونوں نے مل کر اس کے چہرے کو پُراسرار حسن دیا تھا۔ سر کی گولائی اور پیشانی کی ساخت کی اپنی ایک دلکشی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی بناوٹ ایسی تھی کہ ہونٹوں کے کونوں پر مسکراہٹ نظر آتی تھی۔ پھر اس کی گردن کی لمبائی تھی اور خدا نے اسے جو قد بُت دیا تھا وہ نہ لمبا تھا نہ چھوٹا۔ عجیب طرح کا موزوں قد تھا۔ چال ایسی جو میں نے کم ہی کسی عورت میں دیکھی ہوگی۔ اس کے بکھرے ہوئے بے ترتیب بال مجھے بہت ہی اچھے لگ رہے تھے۔ اس کی عمر تئیس سال کے لگ بھگ تھی۔

میں اس سے کوئی ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہتا تھا جس سے اسے شک ہوتا کہ میں اس پر شبہ کر رہا ہوں۔ میں نے پوچھا "تمہارے خاوند کو زہر دینے والا کون ہوسکتا ہے؟" ——— اس نے آہستہ سے کہا "اللہ جانتا ہے۔ مجھے کسی پر شبہ نہیں" ——— میں نے اس کے الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کے انداز کو غور سے دیکھا۔ مجھے کچھ بے تعلق سی نظر آئی جیسے اسے اس کا اتنا افسوس نہیں جتنا ایک بیوی کو ہونا چاہیے۔

میں نے قدیر کے باپ سے باتوں میں پوچھا تھا کہ جب قدیر مر گیا تو سب سے پہلے کس نے کہا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے؟ اس نے جواب دیا تھا ——— "سب سے پہلے قدیر کی بیوی نے کہا تھا" ——— پھر میں نے اسے کہا تھا کہ قدیر کی بیوی کے الفاظ کیا تھے؟ باپ نے بتایا تھا کہ قدیر کو ہم نے اٹھا کر چارپائی پر پھینکا تو اس کی بیوی نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ مار کر کہا تھا ——— "ہائے، اسے تو کوئی زہر دے گیا ہے"۔ میں نے یہ الفاظ خاص طور پر ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ ملنے سے پہلے ہی تفتیش شروع کردی تھی کیونکہ مقتول کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے کوئی تیز زہر دیا گیا ہے۔ میں نے پہلے بھی ایسی لاشیں دیکھی تھیں۔

میں نے قدیر کی بیوی سے پوچھا ——— "تم نے کبھی زہر سے مرا ہوا آدمی دیکھا ہے؟"

"کبھی نہیں"

"پھر تم نے قدیر کو دیکھتے ہی کیوں کہا تھا کہ اسے کوئی زہر دے گیا ہے؟"

وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکی۔ گھبرا گئی۔ میں نے ذرا حوصلہ دیا تو اس نے کہا ——— "اسے کوئی بیماری تو تھی نہیں۔ کھیتوں میں گیا تو بالکل

ٹھیک تھا۔ مجھے صرف زہر کا شک تھا۔ میں نے کہہ دیا۔"
میں نے اسے اس نقطے پر گھیرنے کی کوشش نہ کی۔ میرے دل میں شک بیٹھ گیا کہ اس لڑکی کو علم تھا کہ آج اس کے خاوند کو زہر دیا جائے گا۔ ورنہ وہ یہ کہتی کہ اسے کسی نے مارا پیٹا ہے یا سانپ نے ڈس لیا ہے یا اسے اچانک اندر سے کوئی تکلیف اٹھی ہے یا وہ کچھ بھی نہ کہتی۔ یوں وثوق سے رائے نہ دیتی۔ میں نے اسے اپنے جال سے نکل جانے دیا اور کہا۔ "تمہارا خیال ٹھیک تھا۔ میں نے بھی اسے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے" ―― اس کے چہرے پر جو گھبراہٹ آگیا تھا وہ دُور ہو گیا۔ میں نے اسے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "دیکھو۔ تم گھبراؤ نہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تم پر شک کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم عورت ذات ہو اور مسلمان ہو، تم تھانے اور کچہری نہ چڑھو۔ اسی لیے تمہارے گھر آگیا ہوں ورنہ تمہیں تھانے بُلا لیتا۔ میں یہ باتیں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے اس آدمی کا پتہ چل جائے جس نے تمہیں اس عمر میں بیوہ کر دیا ہے" ―― اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "جس طرح اس کی لکھی تھی پوری ہو گئی۔"
"قدیر صبح کیا کھا کر گیا تھا؟"
"صبح صرف دُودھ پیا کرتا تھا" اس نے جواب دیا۔ "آج بھی دُودھ پی کر گیا تھا۔"
"دُودھ اسے کس نے دیا تھا؟"
"اس کی بہن نے ڈال دیا تھا۔"
"دوپہر کی روٹی کس وقت کھاتا تھا؟"
"کبھی کھیتوں میں کبھی گھر میں۔" اس نے جواب دیا۔ "جس روز گھر کھانی ہوتی تھی کہہ جایا کرتا تھا کہ آج روٹی نہ لانا گھر آجاؤں گا۔"
"کھیتوں میں روٹی تم لے جاتی ہو یا اس کی بہن؟"
"ہمیشہ میں ہی لے جاتی ہوں۔"
"آج بھی تم گئی تھیں؟"
"نہیں" اس نے جواب دیا۔ "آج تو روٹی گئی ہی نہیں۔ کہہ گیا تھا کہ گھر آکر کھاؤں گا لیکن وہ اس حال میں واپس آیا۔"
"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خالی پیٹ تھا۔"
"ہاں۔ خالی پیٹ ہی ہو گا" اس نے جواب دیا۔ "اس نے روٹی نہیں کھائی تھی۔"
"قدیر کی بہن کیسی لڑکی ہے؟"
اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سوال اس نے پسند نہیں کیا۔ میں نے اس کے چہرے میں تبدیلی بھی دیکھی۔ میں نے اسے کہا ―― "میرا پوچھنے سے مطلب یہ ہے کہ بعض بھائی خراب بہنوں کی وجہ سے مارے جاتے ہیں یا اپنے آپ کو مار لیتے ہیں۔"
"یہ لڑکی خراب نہیں ہے" اس نے کہا ―― "اگر میں کوئی ایسی بات دیکھتی تو اسے میں اپنے ہاتھوں ختم کر دیتی۔"
میں نے اسے باہر بھیج کر قدیر کی بہن کو بلایا۔ وہ ڈر اور شرم کی وجہ سے بول ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے اس کے باپ کو اندر بلا کر اس کے پاس بٹھا دیا اور دونوں سے وہی باتیں پوچھیں جو قدیر کی بیوی سے پوچھی تھیں۔ انہوں نے وہی جواب دیئے جو میں سن چکا تھا۔ مقتول کو دُودھ بہن نے ڈال کر دیا تھا۔ اس میں سے اس نے باپ کو بھی دودھ دیا تھا۔ قدیر کے لیے روٹی نہیں گئی تھی۔ قدیر کی بیوی کے خلاف دونوں نے کوئی بات نہ کی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان کے دل میں اس کے خلاف ذرا سی بھی کوئی بات ہے تو نکل آئے لیکن کوئی شکایت سامنے نہ آئی۔
میں جب تھانے میں پہنچا تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آ چکی تھی اور لاش ہسپتال سے گاؤں کے لوگ لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ موت زہر سے واقع ہوئی ہے۔ لیکن پیٹ کی جو کیفیت بیان کی گئی تھی وہ قدیر کی بیوی، بہن اور باپ کو جھٹلا رہی تھی۔ رات کو مخبر نے آکر بتایا کہ قدیر کی بہن کا چال چلن صاف ہے۔ قدیر کی بیوی کے متعلق یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ خراب تھی یا کسی کے ساتھ اس کے در پردہ چھپے کے تعلقات تھے لیکن شک ضرور تھا۔ وہ اپنے خاوند کے گھر سے ناراض تھی۔ جب جی چاہتا اپنے گاؤں چلی جاتی تھی لیکن قدیر کا باپ اور بہن اس سے خوش تھے۔ قدیر کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بیوی سے خوش تھا یا نہیں۔

دوسرے دن صبح صبح مقتول کے گھر چلا گیا۔ مجھے جانے کی
ضرورت نہیں تھی۔ ان سب کو تھانے بلا سکتا تھا لیکن میری کوشش یہ
تھی کہ ان لڑکیوں کو تھانے سے بچاتے رکھوں۔ میں پوسٹ مارٹم رپورٹ
ملنے سے پہلے وہاں گیا تھا۔ میں نے قدیر کے باپ کو اندر بلایا اور اس
سے پوچھا ——— "کل قدیر نے دن کی روٹی کہاں سے کھائی تھی؟" ———
اس نے جواب دیا ——— "اس کی روٹی نہیں گئی تھی" ——— میں نے
قدیر کی بہن کو بلایا اور اس کے باپ کے سامنے یہی سوال پوچھا۔ اس
نے بھی یہی جواب دیا۔ میں نے قدیر کی بہن سے کہا ——— "اچھی طرح
سوچ کر بتاؤ کہ کل قدیر کے گھر آنے تک اس کی بیوی باہر گئی تھی؟" ———
اس نے سوچ کر جواب دیا ——— "ہاں گئی تھی۔ یہ نہیں پتہ کہ کہاں گئی تھی۔"
"کتنی دیر بعد واپس آئی تھی؟"
"تھوڑی دیر بعد ہی آ گئی تھی۔" قدیر کی بہن نے جواب دیا۔
"جب وہ گئی تھی تو اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی؟"
"میں نے یہ نہیں دیکھا۔"
"اس وقت روٹی پک چکی تھی؟"
"ہاں پک چکی تھی۔"
"کس نے پکائی تھی؟"
"میں نے۔"
"قدیر کی بیوی نے روٹی تمہارے ساتھ کھائی تھی یا اکیلے؟"
"اس نے واپس آکر اکیلے ہی کھائی تھی۔"
"کبھی ایسا ہوا ہے کہ قدیر نے کھیتوں میں کسی اور کے ساتھ روٹی
کھائی ہو؟"
"ہاں ہو سکتا ہے۔" اس کے باپ نے جواب دیا۔ "لیکن میں
نہیں جانتا کہ کل اس نے کسی کے ساتھ روٹی کھائی تھی یا نہیں۔"
میں نے قدیر کی بیوی کو بلایا۔ وہ اندر آئی تو میں نے باپ اور
بیٹی کو باہر بھیج دیا۔ میں نے اس سے پوچھا ——— "کل تم روٹی کھانے
کے بعد کہاں گئی تھیں؟" ——— اس نے ایک گھر بتایا۔ میں نے
پوچھا کہ وہاں بہت دیر بیٹھی رہیں؟
"جی۔"
"گاؤں سے باہر تم اس گھر میں جانے سے پہلے گئی تھیں یا
بعد میں؟"
اس نے گھبرا کر جواب دیا ——— "میں گاؤں سے باہر نہیں گئی تھی۔"
"دیکھو لڑکی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ———
"کل کی بات کچھ اور تھی۔ آج بات کچھ اور ہو گئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی
مسلمان عورت کو تھانے نہ بلاؤں۔ میں اب بھی یہی چاہتا ہوں میری قسم
نہ توڑو۔" میں نے کچھ سوچ کر اپنا ہاتھ آگے کیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
لے کر دبایا۔ اس نے چونک کر میرے منہ کی طرف دیکھا۔ اس کا سانولا
رنگ سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ایسی چمک آ گئی کہ میں زیادہ دیر
اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ
سے نکال لیا جو میرے لیے نئی بات تھی ورنہ جو عورتیں پولیس کی لپیٹ
میں آ جاتی تھیں وہ تھانیداروں کے اشاروں پر ناچا کرتی تھیں مگر اس
عورت نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں سامنا نہ کر سکا میں مسکرایا۔
میں نے جو کچھ سوچ کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا میرا وہ خیال غلط نکلا۔ وہ
بدکار نہیں تھی۔ لیکن ایسا جھوٹ بول چکی تھی کہ اس پر شک پختہ ہو گیا تھا۔
میں جب مسکرایا تو اس نے کہا ——— "آپ کس چکر میں ہیں تھانیدار
جی؟...... مجھ پر شک ہے تو مجھے باندھ لو، ہتھکڑیاں لگا لو۔ میرے
جسم کو اس طرح پھر ہاتھ نہ لگانا" ——— میں ابھی چپ ہی تھا کہ اس
نے کہا ——— "ہاں پوچھو کیا پوچھتے ہو؟"
میرے تجربے نے مجھے بتایا کہ یہ عورت بدکار نہیں۔ خاوند
کے علاوہ کسی اور کو چاہتی ہے اور اس کے ساتھ اس کا دوستانہ
ہیر رانجھے والا ہے۔ یہ عام قسم کے ناجائز تعلقات والا معاملہ نہیں
اور تیسری بات یہ کہ یہ عورت قتل کر سکتی ہے۔ اب مجھے چوتھی بات کا
یقین کرنا تھا کہ اس نے اپنے خاوند کو خود زہر دیا ہے یا اپنے آشنا
سے دلوایا ہے۔
"میں کسی اور چکر میں نہیں پڑا۔ تم تسلی رکھو۔" میں نے اسے
کہا اور پوچھا ——— "مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم نے قدیر کو کھیتوں میں

رات کی روٹی کھلائی تھی یا تازہ۔"

"کب؟"

"کل۔"

"کل اس کے لیے روٹی نہیں گئی تھی۔"

میں نے باہر سے اپنے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے اس گھر کی کسی عورت سے یہ پوچھنے کے لیے بھیج دیا کہ قدیر کی بیوی کل اس کے گھر کتنی دیر بیٹھی رہی تھی۔ میں نے یہ ہدایت اسے الگ کر کے دی تھی۔ اندر آ کر میں نے قدیر کی بیوی سے پوچھا —— "اس کے پیٹ میں روٹی کہاں سے آئی تھی؟"

"میں کیا جانوں؟"

ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ معدے میں غیر ہضم شدہ گندم کی روٹی تھی جس میں زہر کی آمیزش پائی گئی۔ روٹی ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ پہلے معدے میں گئی تھی۔ قدیر کی بیوی کہ رہی تھی کہ مقتول نے روٹی کھائی ہی نہیں تھی —— میں نے اس خوبصورت عورت کو باتوں میں لگائے رکھا۔ اسے ڈرایا دھمکایا بالکل نہیں۔ اشاروں اشاروں میں اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ جذبات سے اندھے ہو کر بیویاں آشناؤں سے مل کر خاوندوں کو مروا دیتی ہیں مگر ان کا حشر بہت ہی برا ہوتا ہے۔ کبھی کوئی عورت بچ کے نہیں گئی۔ وہ شاید میرے اشارے سمجھ رہی تھی۔

کانسٹیبل آگیا۔ میں نے باہر جا کر اس سے رپورٹ لی۔ اس گھر سے اسے پتہ چلا تھا کہ کل قدیر کی بیوی تھوڑی سی دیر کے لیے وہاں گئی تھی۔ اتنی دیر وہاں نہیں رہی جتنی وہ بتا رہی تھی۔ یہ اس کا دوسرا جھوٹ تھا۔ پولیس والے اس صورت میں یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ مشتبہ کو، وہ عورت ہو یا مرد، تھانے لے جاتے ہیں۔ رات بھر جگائے رکھتے ہیں۔ طرح طرح کی اذیتیں دیتے ہیں جیسا انگریز تھرڈ ڈگری کہا کرتے تھے۔ لیکن میں اس کے خلاف تھا۔ میں مشتبہ کو کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ اس عورت کو بھی میں نے یہ تاثر دے کر آنا اور جانے دیا کہ میرا شک رفع ہو گیا ہے۔ میں جانے کے لیے اٹھا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "میری نیت پر شبہ نہ کرنا۔ پولیس کو بہت سی ایسی حرکتیں کرنی پڑتی ہیں جو دوسروں [کو] اچھی نہیں لگتیں۔ اگر میری نیت خراب ہوتی تو میں تمہیں تھانے بلا[تا]"

وہ پہلی بار مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں جادو کا اثر تھا۔

میں وہاں سے نکل کر گاؤں کے باہر چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ قدیر کو روٹی کس نے کھلائی ہے۔ میں کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ کئی [آدمی] کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ سب سے پوچھا کہ کل قدیر کس جگہ [کام] کر رہا تھا۔ کسی نے بھی صحیح جواب نہ دیا۔ میں چلتا گیا اور ایک درخت کے نیچے مجھے دو کتے مرے ہوئے نظر آئے۔ قریب گیا تو ادھر اُدھر پانچ چڑیاں مری ہوئی دیکھیں اور وہیں ایک گلہری بھی مری پڑی تھی۔ زمین کچی تھی۔ وہاں صاف نشان تھے۔ دو تین آدمی وہاں بیٹھے رہے تھے۔ وہاں دو قسم کے کھرے (پاؤں کے نشان) تھے۔ ایک ننگے پاؤں کے جو کھیت سے درخت تک گئے تھے اور ایک جوتی والے جو وہاں تک آئے بھی تھے اور گئے بھی تھے مگر گاؤں کی طرف نہیں گئے تھے۔ یہ کھرے اور مرے ہوئے پرندے بتا رہے تھے کہ مقتول کو یہاں زہر دیا گیا ہے اور زہر دینے والا کوئی مرد ہے جو گاؤں کی طرف سے نہیں آیا تھا۔ زہر کھلا کر ادھر ہی چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔

میں نے گاؤں سے دو گھوڑے منگوائے۔ دونوں گھوڑے ایک کانسٹیبل کو دے کر ایک بوڑھے کھوجی کی طرف بھیج دیا۔ معاملہ صاف تھا۔ قدیر کو اس درخت کے نیچے روٹی کھلائی گئی تھی۔ بچے ہوئے ٹکڑے وہیں پھینک دیئے گئے جو کتوں، چڑیوں اور گلہری نے کھائے اور سب مر گئے۔ یہ آدمی قدیر کی بیوی کا دوست ہو سکتا تھا۔ کھوجی وہاں سے کوئی تین میل دور رہتا تھا۔ ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد کانسٹیبل اسے گھوڑے پر بٹھا کر لے آیا۔ میرے کہنے پر وہ زمین پر جھک گیا۔ ننگے پاؤں کا کھرا دیکھ کر اس نے بتایا کہ یہ آدمی اس کھیت سے کام کرتے کرتے درخت تک آیا تھا۔ کھوجی نے درخت سے دس بارہ قدم دور رک کر کہا —— "یہاں اس نے ایک آدمی کے ساتھ رک کر باتیں کیں یا ہاتھ ملایا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے۔ پھر اکٹھے چلے اور یہاں (درخت کے نیچے) بیٹھ گئے۔ پھر ننگے پاؤں والا واپس

کھیت میں چلا گیا اور جوتی والا اُس طرف چلا گیا تھا۔ بوڑھا کھوجی جوتی والے کھُرے پر چل پڑا۔ کچھ دُور جا کر اس نے کہا۔ "یہاں رُک کر اس نے پیچھے دیکھا اور آگے چل پڑا تھا ۔۔۔۔۔ پھر کچھ دُور آگے جا کر اس نے کہا۔ "یہاں بھی وہ رُکا ہوا ہے اور پیچھے کو گھوما ہے۔"

اگر آپ کسی کھوجی کو کھُرا اُٹھاتے دیکھیں، اس کے ساتھ ساتھ چلیں، اس کی باتیں سُنیں تو آپ ایسا محسوس کرنے لگیں گے جیسے آپ کسی جن کی باتیں سن رہے ہیں۔ بعض جگہوں پر ہم اور آپ کو کوئی نشان نظر نہیں آئے گا لیکن کھوجی کو سب کچھ نظر آ رہا ہو گا۔ کھوجیوں کی باتیں بڑی پُراسرار ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے کھوجی نے ایک جگہ رُک کر کہا۔ "وہ یہاں کھڑا جوتی اُتار کر جھاڑ رہا ہے۔ جُوتی میں شاید کنکری آ گئی ہے۔ یہاں وہ پھر رُک گیا ہے" ۔۔۔۔۔ یہ باتیں بعض لوگوں کو ڈرا دیتی ہیں اور کھوجی پُراسرار کی مانند نظر آنے لگتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس فن کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ اب تو یہ فن دم توڑ رہا ہے۔ یہ کھوجی سکاٹ لینڈ یارڈ کے طرح فوق الانسانی کرامات کر سکتے ہیں۔

ہمیں کھوجی ڈیڑھ میل دُور لے گیا اور آگے ریلوے لائن آ گئی۔ کھوجی نے بتایا کہ وہ لائن پر چڑھ گیا ہے۔ آگے کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کدھر گیا کیونکہ وہ ریلوے لائن کے درمیان چلتا گیا ہو گا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ راستے میں کھوجی کے کہنے کے مطابق رُک کر پیچھے جو گھوم رہا ہے وہ دیکھتا ہو گا کہ قدیر زہر کھا کر ابھی کھڑا ہے یا گر پڑا ہے۔ قدیر کے پیٹ میں جو روٹی تھی وہ اسی آدمی نے اسے کھلائی تھی اور اس کا قدیر کی بیوی کو علم تھا۔

کھوجی کو میں نے یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ یہ کھُرا اپنی آنکھوں میں رکھے۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اسے گھوڑے پر گاؤں چھوڑ آئے۔ میں تھانے چلا گیا۔ تھکن سے بُرا حال تھا۔ میں نہا رہا تھا تو دماغ میں ایک بات آئی۔ میں نے یہ معلوم نہیں کیا تھا کہ قدیر کی بیوی جس گھر میں گئی تھی اور کہتی تھی کہ وہاں بہت دیر رہی ہوں، اس گھر میں کوئی جوان آدمی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے وہی اس کا دوست ہو اور وہ دیکھنے گئی ہو کہ وہ قدیر کو زہر دینے چلا گیا ہے یا نہیں۔ میں نے اگلے دن کے لیے یہ بات نوٹ کر لی۔ مگر اگلا دن چڑھا تو میرے لیے ایک اور مصیبت آ گئی۔ نمبردار اور چوکیدار اطلاع لے کر تھانے آئے کہ رحمت نام کا ایک جوان آدمی جس کی عمر چوبیس یا پچیس سال تھی، رات کو گاڑی کے نیچے آ کر کٹ گیا ہے۔ لاش وہیں لائن پر پڑی ہے۔ میں نے پہلے تو اس حادثے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ یہ مین لائن تھی۔ بڑی تیز رفتار گاڑیاں گزرتی رہتی تھیں۔ یہ آدمی کسی گاڑی کی لپیٹ میں آ گیا ہو گا یا اس نے خودکشی کی ہو گی۔ بہرحال فوری طور پر وہاں پہنچنا ضروری تھا۔

جا کر دیکھا۔ لاش کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ کمر سے اُوپر والا دھڑ لائن کے درمیان پڑا تھا اور نیچے والا دھڑ لائن سے باہر۔ گاڑی کے پہیے کمر کو کاٹتے گزر گئے تھے۔ مگر جسے میں حادثہ یا خودکشی سمجھ رہا تھا وہ قتل کی واردات تھی۔ وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور مرنے والے کے گھر کی عورتیں اور مرد رو رہے تھے۔ فوری طور پر مجھے جو معلومات لوگوں سے اور مقتول کے لواحقین سے ملیں وہ یہ تھیں۔ اس کا نام رحمت علی تھا۔ غیر شادی شدہ تھا۔ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا جو قدیر کی بیوی کا میکہ گاؤں تھا۔ یہ گاؤں قدیر کے گاؤں سے تقریباً دو میل دُور تھا۔ رحمت رات کا کھانا کھا کر گھر سے نکلا۔ رات بھر غیر حاضر رہا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ کسی نے اس کے گھر والوں کو اطلاع دی کہ رحمت کی لاش ریلوے لائن پر کٹی پڑی ہے۔ لاش جہاں پڑی تھی وہ جگہ قدیر کے گاؤں سے نصف میل یا پون میل دُور تھی۔ رحمت کے باپ نے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ رحمت نے خودکشی کی ہے، مجھے یہ وجہ بتائی کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے ساتھ ہم کر رہے تھے مگر اس نے یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے بوڑھے کو ابھی یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ اس کے بیٹے نے خودکشی نہیں کی۔

میں نے لاش کے دونوں ٹکڑے چارپائی پر ڈلوائے۔ اس نے کُرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ بھی کچلا گیا تھا۔ بُری طرح پھٹا تھا۔ اس کی پہلو والی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے ایک ریشمی رومال نکلا۔ اس کے کونے میں گانٹھ دی ہوئی تھی۔ میں نے گانٹھ کھولی تو اس میں

سے کسی عورت کے چند ایک بال گول گچھے کی صورت میں برآمد ہوتے۔
شہروں میں مقتولوں یا خودکشی کرنے والوں کی جیبوں سے محبت کے
خطوط یا لڑکیوں کی تصویریں نکلتی ہیں اور دیہات میں جو ناکام عاشق
مرتے ہیں ان کی پاس لڑکیوں کی دی ہوئی عجیب عجیب سی نشانیاں ہوتی
ہیں۔ رحمت جس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اس کے متعلق
کوئی نہیں جانتا تھا۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ قدیر کی بیوی اسی گاؤں
کی رہنے والی ہے۔ پولیس والوں کی ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے۔
میں نے سوچا کہ قدیر کی بیوی کہیں رحمت کو ہی تو نہیں چاہتی تھی؟
مگر یہ خیال بھی آیا کہ قدیر تو مر چکا ہے پھر رحمت کو کس نے قتل کیا؟
شاید وہ کسی دوسری لڑکی کو چاہتا ہوگا۔ وہ چونکہ رات بھر غیر حاضر رہا
تھا اس لیے میں نے کھوجی کی ضرورت محسوس کی۔ میں نے اسی
وقت کانسٹیبل کو اسی بوڑھے کھوجی کو لانے کے لیے بھیج دیا جس
نے کل کھیتوں میں کھرا اٹھایا تھا میرا ارادہ یہ تھا کہ وہ رحمت کے
گاؤں کے باہر اس کا کھرا ڈھونڈے اور معلوم کرے کہ وہ کہاں کہاں
گیا تھا۔ کھوجیوں کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ رحمت کے پاؤں
میں جوتی تھی۔ اسے مٹی پر رکھ کر کھرے کی ساخت دیکھی جا سکتی تھی۔
ایک مشکل خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ دیہات کے سینکڑوں لوگ لاش
دیکھنے کے لیے آ گئے تھے انہوں نے ریلوے لائن کے ساتھ
ساتھ دور تک کوئی کھرا سلامت نہیں رہنے دیا تھا۔ کھوجی نے لاش
کی جوتی لے کر لاش کو غور سے دیکھا پھر تماشائیوں کے ہجوم میں کسی
ایسے جوان آدمی کو ڈھونڈنے لگا جس کا قد بت اور جسم رحمت جیسا
ہو۔ جب وہ لوگوں کو غور سے دیکھ رہا تھا تو لوگ وہاں سے کھسکنے
لگے۔ میں نے سب کو روکا اور سمجھایا۔ کھوجی کو ایک آدمی نظر آ گیا۔
اسے رحمت کی جوتیاں پہنائی گئیں۔ اتفاق سے اسے جوتی فٹ
آ گئی۔ اس کا جسم رحمت سے ملتا جلتا تھا۔ کھوجی نے لوگوں کو پیچھے
ہٹا کر اس آدمی کو گیلی زمین پر چند قدم چلایا پھر اس سے جوتی اتروا
لی۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر کھروں کو دیکھا۔ ہجوم پر سناٹا طاری تھا۔
کھوجی جادوگروں کی مانند نظر آ رہا تھا۔

اس نے کھروں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے
بڑی تیزی سے جھک کر کھرے کو دیکھا اور اچانک اس نے زور
سے زمین پر ہاتھ مارا۔ وہ اچھل کر اٹھا اور میرے قریب آ کر بولا۔
"یہ کھرا کل سے میری آنکھوں میں ہے۔ یہ وہی کھرا
ہے جو میں کھیتوں سے اٹھا کر ریلوے لائن تک لایا تھا۔"
کھوجیوں کے کمالات جس کسی نے دیکھے ہیں وہ جانتا ہے
کہ کھوجی اگر کوئی کھرا ایک بار دیکھ لیں تو کئی کئی سال اسے نہیں بھولتے
مشکل یہ ہے کہ کھوجیوں کی شہادت کو عدالت تسلیم نہیں کرتی۔ وہ
صرف پولیس کی تفتیش میں مددگار ہوتے ہیں۔ جب اس بوڑھے
نے کہا کہ یہ کھرا اس نے کل دیکھا تھا تو میں نے اس کی راے کو
فوراً تسلیم کر لیا۔ مجھے یہ خوشی ہوئی کہ قدیر کا قاتل مل گیا ہے لیکن اب
سوال یہ پیدا ہو گیا کہ اس قاتل کو کس نے قتل کیا ہے؟ وہ یقیناً قتل ہوا
تھا۔ لائن پر خون بالکل نہیں تھا۔ گردن پر جمے ہوئے خون کی گہری
لال اور نیلی لکیریں بتا رہی تھیں کہ اس کا گلا گھونٹ کر مارا گیا پھر لائن
پر پھینکا گیا ہے۔
پوسٹ مارٹم رپورٹ نے تصدیق کر دی۔ رحمت کا گلا کسی نے
ہاتھوں سے گھونٹا تھا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق موت رات کے
پہلے پہر واقع ہوئی تھی اور لاش پر سے گاڑی کم و بیش چار گھنٹے بعد
گزری تھی۔ میں نے مقتول کے باپ سے کوئی دو گھنٹے صرف کر کے
یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس لڑکی کو چاہتا ہے؟ اس کا دشمن
کون تھا؟ مگر باپ کو کچھ بھی علم نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ رحمت کبھی کبھی
رات کو گاؤں سے باہر چلا جاتا اور بہت دیر سے واپس آتا تھا۔ میں
نے اس سے پوچھا ــــــ "قدیر کی بیوی تمہارے گاؤں کی رہنے
والی ہے۔ اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"
"کوئی ایک سال ہوا رحمت نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ اس
لڑکی کا رشتہ میرے لیے مانگو۔" رحمت کے باپ نے کہا۔ "لیکن
ہم باہر کی ذات کا رشتہ نہ لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ ماں نے اسے
صاف کہہ دیا تھا کہ اپنی ذات برادری کی کسی لڑکی کا نام لو۔ اس نے

کہا تھا کہ میں تمہارا رشتہ قبول نہیں کروں گا۔"

"تم نے رشتہ ڈھونڈا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"دو رشتے تلاش کیے تھے۔" اس نے کہا۔ "مگر اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

"تو کیا یہ صحیح ہے کہ وہ قدیر کی بیوی کے ساتھ ہی شادی کرنا چاہتا تھا؟"

"اس نے صرف ایک ہی بار ماں سے کہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اس کے بعد اس نے اس لڑکی کا نام نہیں لیا۔ پھر اس لڑکی کی شادی قدیر سے ہو گئی۔"

"قدیر کی بیوی جب میکے آتی تھی تو وہ ان کے گھر جاتا تھا؟"

بوڑھے نے سوچ کر جواب دیا۔ "میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ گاؤں میں کبھی بات نہیں اٹھی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ رحمت نے خودکشی کی ہے؟"

"ہاں جی۔" باپ نے کہا۔ "وہ اندھا تو نہیں تھا کہ گاڑی کے نیچے آ گیا۔"

میں نے آگے ہو کر آہستہ سے کہا۔ "تمہارے بیٹے کو قتل کیا گیا ہے۔"

وہ بدک کر بولا۔ "قتل؟ میرے بیٹے کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"ہاں۔ قتل کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "گلا گھونٹ کر مارا، پھر لائنوں پر پھینکا ہے۔ تمہیں کسی پر شک ہے تو بتا دو۔"

"نہیں۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "میری خونی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔"

"تمہاری نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "رحمت کی تھی۔ اٹھو، تمہارے گاؤں تک چلتا ہوں۔"

میں اس کے گاؤں میں گیا اور رحمت کی ماں اور دونوں بہنوں کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔ "قدیر کی بیوی جب میکے آتی ہے تو تمہارے گھر آیا کرتی ہے؟"

"ہمارے گھر تو وہ سب سے زیادہ آتی ہے۔" ایک بہن نے جواب دیا۔ "بہت ہنسوڑ ہے۔ پورا پورا دن ہمیں گزارتی ہے۔"

"رحمت کے لیے روٹی کھیتوں میں جاتی تھی یا گھر آ کے کھایا کرتا تھا؟"

"وہ کھیتوں پر جاتا ہی کہاں تھا۔" اس کی ماں نے جواب دیا۔ "بیکار پھرتا رہتا تھا۔"

"تین چار دن گزرے وہ روٹی اپنے ساتھ کیوں لے گیا تھا؟"

وہ سب حیران سی ہو گئیں۔ میرا سوال ہی ایسا تھا۔ میں نے پھر پوچھا۔ "وہ کہیں باہر گیا تھا؟"

"ہاں ۔۔۔" ایک بہن نے جواب دیا۔ "کہتا تھا کہ میں شام کو آؤں گا۔ روٹی ساتھ دے دو۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ گیا کہاں تھا؟"

"نہیں بتا کر تھوڑے ہی جاتا ہے۔" ماں نے کہا۔ "صبح گیا اور شام کو آ گیا۔"

یہ تو اب یقین ہو گیا تھا کہ قدیر کو زہر دینے والا رحمت ہے۔ کھوجی نے قدیر کے کھیت کے پاس درخت کے نیچے جو کھرا دیکھا تھا وہ اسی کا تھا اور اب یہ سراغ بھی مل گیا تھا کہ رحمت قدیر کی بیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ لڑکی بھی اسے چاہتی تھی۔ اس کے خاوند قدیر کو رحمت نے زہر اس لیے دیا ہو گا کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ شادی کر سکے مگر سوال یہ تھا کہ رحمت کا گلا گھونٹ کر اسے ریلوے لائن پر کس نے پھینکا؟ کیا قدیر کے کسی رشتہ دار کو علم تھا کہ قدیر کا قاتل رحمت ہے اور اس نے رحمت سے خون کا بدلہ لیا ہے؟ اور کیا قدیر کی بیوی کے تعلقات کسی اور آدمی کے ساتھ بھی تھے جس نے رحمت کو رقابت میں قتل کیا ہے؛ اور رحمت کی جیب سے جو رومال اور بالوں کا گچھا برآمد ہوا ہے، کیا وہ قدیر کی بیوی کا دیا ہوا ہے؟ ۔۔۔ اب مجھے اندھیروں میں ٹٹولنا تھا۔ میرے مخبر بھی کوئی کام کی خبر نہیں لا رہے تھے۔ قدیر کی بیوی کے متعلق وہ جو خبریں لاتے تھے وہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں۔ اس کے متعلق زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ تھی ۔۔۔ بنگال کی جادوگرنی ہے۔ جس مرد پر نظر ڈالے

اس کی روح اس کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ کوئی مرد اس کے قبضے میں چلا جائے تو اس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔"

یہ محض گپ بازی تھی۔ اس زمانے میں بنگال کا جادو مشہور تھا جو ایک بے بنیاد روایت تھی۔ قدیر کی بیوی کے متعلق جو باتیں مجھ تک پہنچی تھیں وہ ان آدمیوں کی تھیں جو اسے چاہتے اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔

دیہاتی علاقوں میں ایک کردار اور بھی ہوتا ہے جو عموماً عورت ہوتی ہے۔ اس کردار کو میں پوری طرح بیان نہیں کرنا چاہتا کیونکہ بعض باتیں فحش ہیں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ یہ عورت آسمان سے تارے بھی توڑ لاتی ہے۔ اس کا کام ہوتا ہے۔ ایرے غیرے کی دوستانے کرانا اور خفیہ پیغام ادھر ادھر پہنچانا۔ یہ عورت ہر گھر میں جاتی اور سب کی خدمت کرتی ہے۔ چاہے کوئی مرد اس سے سر یا ٹانگیں دبوانے چاہے کوئی عورت اس سے پیٹ ملوائے۔ وہ ہر کسی کی بھیدی ہوتی ہے۔ ایسی عورتیں بہت ہی ہنس مکھ، ملنسار اور غمخوار ہوتی ہے۔ ان کی باتوں میں جادو کا اثر ہوتا ہے۔ جسے چاہیں بلیک میل بھی کر سکتی ہیں۔ جب چاہیں آنسو بہا سکتی ہیں اور چاہیں تو خود ہنستی رہیں اور دوسروں کے آنسو نکال دیں۔ یہ عورتیں اونچی ذات کی نہیں ہوتیں۔

یہاں میں یہ بھی کہہ دوں تو اچھا ہے کہ میں ذات پات کا قائل نہیں۔ یہ عورتیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے کہ اونچی ذات کی نہیں ہوتیں دراصل اونچی ذات والوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ وہ انہیں روپیہ پیسہ اور دانے وغیرہ دے کر دوسروں کی بیٹیوں کے ساتھ دوستانے کرتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ یہی عورتیں جو ان کی خفیہ ایجنٹ ہوتی ہیں خود ان کی بیٹیوں کے دوستانے دوسرے مردوں سے کراتی ہیں۔ میں ایسے کئی کیس سنا سکتا ہوں جہاں اس قسم کی عورت نے ایک مرد کی دوستی کسی کی بہن سے کرادی اور اسی مرد کی بہن یا بیوی کی دوستی کسی اور سے کرادی۔ یہ خباثت پاکستان بننے سے پہلے بھی موجود تھی اور پاکستان کے دیہات میں اب بھی موجود ہے۔ پولیس معاشرے کی بھیدی ہوتی ہے مگر ہم معاشرے کو جب یہ بھید دکھاتے ہیں تو کسی کو بھی شرم نہیں آتی نہ کوئی کان پکڑتا ہے۔

رحمت کے گاؤں میں بھی ایسی ایک عورت تھی۔ مخبروں نے اس کے متعلق بتایا تو میں نے اسے تھانے میں بلا لیا۔ وہ بہت گھبرائی لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ اسے نہ تو ملزموں کی فہرست میں لیا جائے گا نہ گواہوں کی فہرست میں ۔۔۔ میں نے دس روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے کے دس روپے آج کے ایک سو روپوں کے برابر تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ قدیر کی بیوی اور رحمت کے متعلق کچھ بتاؤ۔ اس نے جواب دیا۔

"عائشہ کی بات کرتے ہو؟" ۔۔۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "وہ اگر ہمارے گاؤں کے مردوں کو کہے کہ ریلوے لائن پر لیٹ جاؤ تو سب لیٹ جائیں گے اور اوپر سے گاڑی گزر جائے گی لیکن چوہدری جی۔ آپ یہ چاہیں کہ آپ عائشہ کے جسم کی بو سونگھ لیں تو یہ آپ کا وہم ہوگا۔ ابھی تک وہ مرد پیدا نہیں ہوا جو عائشہ کو موم کر لے۔" قدیر کی بیوی کا نام عائشہ تھا۔

"تم یہ کہہ سکتی ہو تو" میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے کبھی اسے کسی آدمی کا پیغام دیا تھا؟"

"صرف ایک آدمی کا..."

"کون تھا وہ؟"

مجھے توقع تھی کہ وہ رحمت کا نام لے گی لیکن اس نے ایک صاحب اولاد آدمی کا نام لیا اور کہا۔ "میرا جو حشر اس لڑکی نے کیا تھا وہ ساری عمر نہیں بھولوں گی۔ اس نے اپنی شادی پر بھی مجھے اپنے گھر داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ اس کی شادی کے ایک سال پہلے کی بات ہے۔ میں آپ کو سچی بات بتا دوں؟... عائشہ عورت نہیں، بڑی خوبصورت چڑیل ہے۔ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔"

"رحمت کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا؟"

"خدا جانتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "گاؤں کے کسی اور مرد یا عورت کا بھید پوچھ لو۔ پیٹ کے بھید بھی بتا دوں گی لیکن عائشہ کے متعلق کچھ نہ پوچھو۔ بہت گہری لڑکی ہے۔ رحمت اس کے ساتھ شادی ضرور کرنا چاہتا تھا لیکن میں عائشہ کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتی۔"

اس نے جس صاحب اولاد کا نام لیا تھا کہ وہ عائشہ کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا تھا اس کے متعلق پتہ چلا کہ چھ مہینے گزرے، کہیں ہے۔ میرے سامنے اب پھر اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف یہ سوال۔ ایک عورت کے چند ایک بال اور رحمت کے پاؤں کا نشان تھا۔ مگر یہ کھرا مجھے تفتیش میں مدد دے سکتا تھا، عدالت میں نہیں۔ میں نے قدیر اور اس کی بیوی کے قریبی رشتہ دار مردوں کی فہرست تیار کی۔ مجھے شک تھا کہ ان میں سے کسی نے ہی شک پر یقیناً یہ رحمت کو قتل کیا ہے کہ اس نے قدیر کو زہر دیا ہے۔

میں تفتیش کی نئی لائن بنا رہا تھا کہ صبح کے وقت ایک شاہ جی، نمبردار اور دو اور آدمی تھانے میں آئے۔ انہوں نے رپورٹ درج کرائی کہ شاہ کا بیٹا جس کی عمر بائیس تیئس سال تھی، کھیتوں میں مرا پڑا ہے۔ وہ سب سہمے ڈرے ہوئے تھے۔ پہلے قدیر مرا۔ دو روز بعد رحمت مر گیا اور اس کے دو روز بعد شاہ کا بیٹا مر گیا۔ ایک آدمی نے ہاتھ جوڑ کر روہانسی آواز میں کہا —— "حضور، یہ کوئی شر شرارہ معلوم ہوتا ہے ورنہ (شاہ جی) بادشاہوں کی اولاد پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔"

مجھے اس شاہ سے اور اس جیسے ہر ایک شاہ سے نفرت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو میری تعلیم ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جتنی حقیقتیں میں نے دیکھی ہیں (یا پولیس انسپکٹر دیکھا کرتے ہیں) ان کے سامنے شاہوں اور پیروں کے تعویذ اور کالے جادو محض خرافات ہیں۔ لوگ بے چارے ان پڑھ اور توہم پرست ہوتے ہیں، ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اب یہ شاہ اپنے بیٹے کے قتل کی رپورٹ درج کرانے آیا تو میں نے بے اختیار اسے کہا —— "شاہ صاحب، آپ تو زمین اور آسمان کا حال جانتے ہیں۔ جن اور چڑیلیں آپ کے قبضے میں ہیں۔ اپنے بیٹے کے قاتل کے متعلق آپ کچھ نہیں جانتے؟"

چونکہ شاہ کے ساتھ نمبردار اور گاؤں کے دو آدمی تھے اس لیے ان پر رعب جمانے کے لیے اس نے غصے سے جھنجھلا کر کہا: "اگر میرے بیٹے کا قاتل کوئی جن ہوا یا کوئی چڑیل ہوئی تو دیکھنا چوہدری، ساری دنیا کے سامنے اس کے سارے خاندان کو جلا دوں گا۔"

میں نے اس دوران قدیر کی بیوی کو آکر اور رکھا۔ اس کے گھر وہ خود گیا نہ کسی کو بلایا۔ اب مجھے شاہ کے بیٹے کی موت کی اطلاع ملی تو میں ان کے ساتھ موقعہ واردات پر پہنچا۔ شاہ کا مکان قدیر کے گاؤں سے کوئی اڑھائی یا تین فرلانگ دور تھا۔ مکان کے آگے اس نے باغیچہ بنا رکھا تھا۔ جناب بڑی شان سے الگ تھلگ جاگیر میں رہتے تھے۔ اس کے مکان اور قدیر کے گاؤں کے درمیان کھیت اور درخت تھے۔ اس کے بیٹے کی لاش ان کھیتوں میں پڑی تھی۔ رات کے پچھلے پہر آندھی چلی اور تھوڑی سی بارش بھی ہوئی تھی جس سے یہ نقصان ہوا کہ کھرے ضائع ہو گئے تھے۔ لاش ایک منڈیر پر پڑی تھی۔ منہ کھلا ہوا، زبان باہر آئی ہوئی، آنکھوں کے ڈھیلے باہر آئے ہوئے، مٹھیاں بھینچی ہوئیں اور وہ پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ میں نے گردن کو غور سے دیکھا۔ اس کا گلا ہاتھوں سے گھونٹا گیا تھا۔

میں نے سب کو وہاں سے دور چلے جانے کو کہا۔ میرا اپنا ایک طریقہ کار تھا۔ موقعہ واردات سے بعض اوقات کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جو دوسروں کو نظر بھی نہیں آتی اور اگر نظر آ جائے تو شہری اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ پولیس کے لیے ایسی چیزیں بہت ہی اہم ہوتی ہیں۔ ایسی چیزیں تماشائیوں کی نظروں سے اوجھل ہی رکھی جائیں تو زیادہ فائدہ مند ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تماشائیوں میں قاتل بھی موجود ہو۔ اسی لیے میں نے سب کو دور چلے جانے کو کہا اور خود لاش کے ارد گرد کی زمین دیکھنے لگا۔ کوئی کھرا صاف تو نہیں تھا لیکن زمین صاف بتا رہی تھی کہ یہاں قاتل اور مقتول میں خاصی دھینگا مشتی ہوئی ہے اور مقتول قاتل کے ہاتھوں میں تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔ سورج نکل آیا تھا۔ زمین پر کوئی چیز دھوپ میں چمکی۔ میں نے بیٹھ کر دیکھا۔ یہ چھوٹا سا ایک موتی تھا جو عورتوں کے کانوں میں ڈالنے والے کانٹوں میں لگا ہوتا ہے۔ یہ زیور میں جڑا ہوا تھا۔ میں نے یہ موتی یا اسے آپ نگ کہہ لیں، اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

کام کی ایک چیز اور مل گئی۔ مقتول کی مٹھیاں بند تھیں۔ دونوں مٹھیوں میں کسی عورت کے لمبے لمبے بال تھے۔ ایک مٹھی میں تین

بال تھے اور دوسری میں پانچ بال۔ کچھ بال بہت لمبے تھے اور کچھ ٹوٹے ہوئے۔ یہ مٹھیوں میں تھے اور انگلیوں کے درمیان سے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ میں نے بال مٹھیوں میں سے نکال لیے۔ انہیں اپنی انگلی پر لپیٹ کر گچھا بنایا اور جیب میں ڈال لیا۔ وہاں کے تین آدمیوں کے ابتدائی اور رسمی بیان قلم بند کیے۔ انگوٹھے لگوائے اور لاش چارپائی پر ڈلوا کر سول ہسپتال بھیج دی۔ ایک کانسٹیبل ساتھ بھیج دیا اور میں خود شاہ کے ڈیرے پر چلا گیا۔ اسے الگ بٹھا کر پوچھا کہ اسے کسی پر شک ہے؟ اس نے ایک پیر کا نام لیا جو وہاں سے تین میل دور رہتا تھا۔ کہنے لگا — "وہ میری شہرت اور میری کرامات سے جلتا ہے۔ مجھے اس پر شک ہے۔ اسے تھانے بلا کر [illegible] جائے۔"

"کوئی اور بات کرو شاہ صاحب" میں نے اسے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اپنے بیٹے کے قتل کی بات کرو۔ کاروباری حسد کی باتیں چھوڑو۔ میں جو پوچھتا ہوں وہ صاف صاف بتاؤ۔ رات کو آپ کے ہاں کون کون سی عورت آئی تھی؟"

اس نے آنکھیں بند کر کے ذرا اپنے اوپر وجد طاری کر کے کہا — "یہاں تو ساری دنیا آتی ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں عورت کون کون سی آئی تھی؟" میں نے ذرا رعب سے پوچھا مگر وہ اپنے آپ کو دیہاتیوں کا روحانی بادشاہ بلکہ خدا سمجھتا تھا۔ اس نے رعب کے جواب میں رعب سے مجھ سے پوچھا — "تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں پوچھتے ہو؟ عورت کوئی بھی آئی ہو تمہیں اس سے کیا؟ تم تفتیش کر کے بتاؤ کہ میرے بیٹے کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"تمہارے بیٹے کو ایک عورت نے قتل کیا ہے۔" میں نے غصہ پی کر اطمینان سے کہا۔ میں نے اپنا اصول بنا رکھا تھا کہ کوئی مجھے گالی بھی دے، میں غصہ پی جایا کرتا تھا۔ اکثر تھانیدار خودسر قسم کے گواہوں اور ملزموں پر تشدد شروع کر دیتے ہیں اور تفتیش سے توجہ ہٹا کر لوگوں پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم تھانیدار ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ تفتیش میں کوئی تعاون نہیں کرتا۔ میں نے شاہ کا رعب پی لیا اور کہا۔

"تمہارے بیٹے کو ایک عورت نے قتل کیا ہے" — اس نے پوچھا — "کون ہے وہ؟"

"جس پر جناب کی بھی نظر کرم تھی اور جناب کے بیٹے کی بھی" میں نے کہا — وہ اپنے مخصوص انداز سے کچھ بولنے لگا تو میں نے ذرا دبدبے سے کہا — "دیکھو شاہ۔ میں چاہوں تو تمہیں ہی اپنے بیٹے کے قتل کے شبے میں باندھ سکتا ہوں۔ ایک جوان آدمی قتل ہو گیا ہے۔ یہ تمہارا نہیں، گورنمنٹ کا کیس ہے" — میں نے اسے آپ کہنا چھوڑ دیا اور کہا "تمہارے بیٹے کے قتل کا وقت تمہارے گھر میں تھا اور وہ تمہاری [illegible] ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ڈیرے پر جو عورتیں یا جوان لڑکیاں آتی ہیں اور جن کو تم خراب کرتے رہتے ہو ان میں کوئی ایسی ہے جس کے متعلق تم یہ کہہ سکو کہ اخلاق کی بہت پکی ہے؟"

"تم مجھ پر غلط الزام نہ لگاؤ" اس نے ذرا دبی زبان میں کہا۔

اس کا رعب مر گیا تھا لیکن وہ یہ تسلیم کرنے پر راضی نہیں تھا کہ وہ عورتوں کو خراب کرتا ہے۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ شاہ کے بیٹے نے کسی عورت پر ہاتھ ڈالا ہے اور اس عورت نے اسے ختم کر دیا ہے۔ اس کی مٹھی میں عورت کے بال اور لاش کے قریب کانٹے کا موتی بتا رہا تھا کہ قاتل عورت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قاتل کوئی مرد ہو۔ شاہ کے بیٹے نے اس عورت کو پکڑ رکھا ہو اور اس کے ساتھ جو آدمی تھا اس نے شاہ کے بیٹے کا گلا گھونٹ کر مار دیا ہوگا۔ یہ آدمی اس عورت کا بھائی یا خاوند ہو سکتا تھا لیکن میں اس سوچ سے پریشان ہونے لگا کہ دیہات کے یہ گنوار لوگ شاہ اور پیروں کو تو خدا کے بعد کا درجہ دیتے ہیں۔ اپنی بہو بیٹیوں کو ان کے ڈیروں پر بھیج دیتے ہیں۔ ان میں ایسا جرأت والا کون ہے جس نے شاہ کے بیٹے کو قتل کر دیا ہے؟ — میرا دماغ بار بار قدیر کی بیوی کی طرف لے جاتا تھا۔ میں نے اس کے گھر

کے دوران اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کا ردِ عمل دیکھا تھا۔ پھر اس عورت نے بھی اس کے متعلق بتایا تھا کہ عائشہ خوبصورت چڑیل ہے۔ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔

"قدیر کی بیوی عائشہ تمہارے پاس آتی ہے؟" میں نے شاہ سے پوچھا۔

"کبھی کبھی۔"

"رات آئی تھی؟"

وہ جھینپ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ دیکھ کر کہا۔ "میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ اپنے بیٹے کے قاتل کو پھانسی چڑھانا چاہتے ہو تو دل کی ساری باتیں میرے آگے رکھ دو۔ تم نہیں بتاؤ گے تو مجھے دوسرے لوگوں سے تمام باتوں کا علم ہو جائے گا۔ پھر میں تمہیں اپنے بیٹے کے قتل کے شبے میں گرفتار کر لوں گا۔ تمہاری پیری مریدی بالکل ختم ہو جائے گی۔ شہادت کو چھپانا جرم میں اعانت کے برابر ہوتا ہے۔ یہ جرم قتل کا ہے۔ قتل میں اعانت کی سزا عمر قید بھی ہو سکتی ہے۔ اپنے جنوں چڑیلوں کو ذرا بھول جاؤ...... رات کو عائشہ تمہارے پاس آئی تھی؟"

"نہیں۔"

"دن کے وقت آئی تھی؟"

"ہاں۔"

"تم نے اسے رات کو آنے کے لیے کہا تھا؟" میں نے ایک شک کے تحت پوچھا۔

"کہا تو تھا۔" وہ پھر جھجک گیا۔ "لیکن..... وہ۔" یہ کہہ کر وہ عجیب سی طرح ہنس پڑا۔ کہنے لگا ـــــ "وہ بڑی اکھڑ مزاج ہے۔"

میں ساری بات سمجھ گیا۔ میرے لیے اتنا ہی فقرہ کافی تھا۔ میں نے کہا ـــــ "تم نے اسے کہا تھا کہ رات کو آنا تعویذ دوں گا۔"

"کہا تو یہی تھا۔" اس نے کہا۔

"وہ تعویذ کیوں لینے آئی تھی؟"

"اس کا خاوند مارا گیا ہے۔ مجھے صرف اتنا ہی کہتی تھی کہ شاہ جی دعا کرو خدا میری مشکلیں آسان کرے۔ میں بہت بڑے چکر میں آ گئی ہوں۔"

میں نے یہاں پہنچ کر اس سے کچھ بڑی ہی ننگی باتیں پوچھیں۔ شاہ نے مجھے یقین دلا دیا کہ عائشہ اس کے ہاتھ نہیں چڑھی تھی۔ وہ اپنا جسم دینے کو کبھی تیار نہیں ہوتی تھی۔ میں یہی سننا چاہتا تھا۔ میں وہیں سے قدیر کے گھر چلا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خدا نے مجھے اندھیرے میں روشنی دکھا دی ہے۔ قدیر کے گھر جا کر میں نے قدیر کی بیوی کو اندر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کے چہرے پر صاف تبدیلی تھی۔ گھبراہٹ اور ڈر کا اثر صاف تھا۔ لیکن وہ مجھے پہلے سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی اور اب مجھے پتہ چلا کہ اس کے حسن کی اصلیت کیا ہے۔ یہ اس کے اندر کا حسن تھا۔ میں نے اسے بہت تسلی دی اور کہا کہ جو کچھ پوچھوں وہ صاف صاف بتا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سر سے دوپٹہ نہیں اترنے دوں گا۔ اب کوئی بات چھپا بھی نہیں سکو گی۔

"پوچھو چوہدری جی!" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"رات کو تم شاہ کے گھر کیوں نہیں گئی تھی؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے کانوں میں سونے کے کانٹے تھے۔ میں نے دونوں کانٹے غور سے دیکھے۔ ایک میں تین باریک سفید موتی مثلث میں جڑے ہوئے تھے۔ دوسرے میں دو موتی تھے۔ تیسرے کی جگہ خالی تھی۔ یہ موتی میری جیب میں تھا اور وہ رومال بھی میری جیب میں تھا جو رحمت کی لاش کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے کونے میں بال بندھے ہوئے تھے۔ اور جو بال شاہ کے بیٹے کی مٹھیوں سے نکالے تھے وہ بھی جیب میں تھے۔

"عائشہ!" میں نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ "تم راستے سے واپس آ گئی تھی۔"

اس کی آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔

"میں تمہیں پھر کہتا ہوں کہ گھبراؤ نہیں۔" میں نے اسے پھر تسلی دی۔ "میں مسلمان ہوں۔ ہندو یا سکھ نہیں۔"

مگر وہ بگڑ گئی۔ پختہ آواز میں بولی۔ "میں رات کہیں نہیں گئی تھی۔"

"تم بات کی تھی"۔ میں نے کہا۔ "اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم واپس کہاں سے آئی تھی"۔

"کہاں سے؟"

"جہاں تم اپنے کانٹے کا ایک نگ پھینک آئی تھی"۔ میں نے جیب سے سفید موتی نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور اسے دکھایا۔ "بائیں کان والا کانٹا اتار کر دیکھو"۔

اس نے تیزی سے اپنا کانٹا اتارا۔ دیکھ کر اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ میں نے جیب سے وہ رومال نکالا جو رحمت کی لاش سے برآمد ہوا تھا۔ اس کی گانٹھ کھولی۔ رومال اور بالوں کا گچھا اس کے آگے کر دیا۔ اس نے نہایت آہستہ آہستہ ہاتھ آگے کیا اور رومال پر رکھ دیا۔ دھیمی سی آواز سے پوچھا۔ "یہ آپ کو کہاں سے ملا؟" ___ اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"رحمت کی جیب میں تھا"۔

وہ دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ میں جان گیا کہ وہ چیخیں مار کر رونا چاہتی ہے۔ وہ عورت تھی۔ عورت مرد سے زیادہ دلیر ہو سکتی ہے لیکن جذبات کی کچی ہوتی ہے۔ میں نے جیب سے دوسرے بال نکالے اور کہا ___ "یہ بال بھی تمہارے ہیں۔ شاہ کے بیٹے کی لاش کی مٹھیوں میں تھے۔ یہ بال بھی تمہارے ہیں جو رحمت نے رومال میں باندھ رکھے تھے۔ تمہارے خاوند کو رحمت نے زہر دیا تھا"۔ ___ مجھے ابھی بالکل یقین نہیں تھا کہ یہ بال اسی کے ہیں۔

اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر سکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی ادھر دیکھتی کبھی دوسری طرف سر گھما لیتی۔ وہ سخت بے چین ہو گئی تھی۔ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے دروازے کی طرف دیکھا جیسے وہ بھاگ جانا چاہتی ہے۔ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور کھینچ کر بٹھایا مگر وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اچانک چلا کر کہا۔ "تم مرد کتے ہو۔ رحمت بھی کتا تھا۔ شاہ کا بیٹا بھی کتا تھا۔ شاہ بھی کتا ہے"۔

میں نے اٹھ کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا ___ "میں تمہارا بھائی ہوں"۔ ___ اس نے چہرہ میرے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی اور کہا ___ "میرا کوئی بھائی نہیں"۔ ___ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر زور سے دھکا دیا اور خود دھڑام سے فرش پر بیٹھ گئی۔ بولی۔ "پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ میں سولی پر چڑھنے کے لیے تیار ہوں"۔ ___ اس نے فرش پر زور زور سے ہاتھ مار مار کر کہا ___ "سن لے۔ رحمت کو میں نے قتل کیا ہے۔ شاہ کے بیٹے کو میں نے قتل کیا ہے۔ بتا اور کیا پوچھتا ہے تو"۔

اس وقت وہ اتنے زیادہ قہر اور غصے میں تھی کہ مجھے شک ہوا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہے۔ اس کے دانت اس طرح دکھائی دینے لگے جیسے کوئی خوبصورت چڑیل ہو۔ میں نے بڑی ہی مشکل سے اسے ٹھنڈا کیا اور اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ آرام سے بات کرے، میں اس کی مدد کروں گا۔ اس پر وہ رونے لگی۔ اس نے جو لمبا چوڑا اقبال جرم کیا وہ مختصر الفاظ میں اس طرح ہے کہ وہ شریف ماں باپ کی بیٹی تھی۔ جوان ہوئی تو اسے رحمت اچھا لگنے لگا۔ رحمت نے بھی اسے دل و جان سے چاہا۔ اس نے قسمیں کھا کر بتایا کہ ان کی محبت پاک تھی۔ رحمت نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے گا لیکن اس کے ماں باپ نہ مانے۔ عائشہ کا رشتہ قدیر کے ساتھ طے ہو گیا۔ رحمت نے اسے کہا کہ گھر سے بھاگ چلتے ہیں لیکن عائشہ نہ مانی۔ اس نے اسے کہا کہ ماں باپ نے معلوم نہیں کیسی کیسی امیدوں سے پالا ہے۔ میں ماں باپ کی عزت گاؤں میں خراب نہیں کروں گی۔ تم اپنے ماں باپ کو راضی کرو میں اپنے ماں باپ کو راضی کر لوں گی۔

رحمت کے ماں باپ راضی نہ ہوئے تو عائشہ نے اپنی ماں سے بات تک نہ کی کہ وہ رحمت کو پسند کرتی ہے۔ اس کی شادی قدیر کے ساتھ ہو گئی۔

"قدیر کے ساتھ شادی کر کے میرا دل زخمی ہو گیا"۔ عائشہ نے مجھے سنایا۔ "لیکن میں نے باپ کی پگڑی کو داغ نہ لگنے دیا۔ اُف تک نہ کی۔ لڑکیاں ڈولی میں بیٹھ کر روتی ہیں۔ میں روئی بھی نہیں۔ جب سسرال سے واپس آئی تو سہیلیوں نے مجھ سے مذاق کیے تھے کہ قدیر تجھے اتنا اچھا لگا تھا کہ میکے گھر اور گاؤں چھوڑتے تیری آنکھ میں آنسو بھی نہ آیا؟ میں ہنستی رہی مگر میرے دل کے زخموں کو نہ کوئی دیکھ سکا نہ میں نے کسی کو دکھایا۔ مجھے قدیر اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے صرف رحمت اچھا لگتا تھا۔ شادی سے دو روز پہلے رحمت

نے مجھے کہا تھا کہ اپنی کوئی نشانی دے جاؤ۔ میں نے پوچھا کہ اسے کیا پسند ہے۔ اس نے کہا کہ سر کے بال دے جاؤ۔ میں نے اپنے سر کے تھوڑے سے بال ریشمی رومال میں لپیٹ کر دے دیئے۔ میں نے قدیر کو کبھی پتہ نہ چلنے دیا کہ میں اسے پسند نہیں کرتی۔ میں نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کا باپ اور بہن باہر بیٹھے ہیں ان سے پوچھ لو۔ میرے ساتھ شادی کر کے قدیر نے کوئی قصور تو نہیں کیا تھا۔ میں اسے یا اس کے باپ اور بہن کو کیوں پریشان کرتی؟"

ان لوگوں نے اپنا گھر عائشہ کے حوالے کر دیا تھا اور گھر کی مختار وہی تھی۔ اس دوران وہ میکے جاتی تو رحمت کے گھر ضرور جاتی۔ سارا سارا دن وہاں رہتی اور کبھی کبھی رحمت سے اکیلے بھی ملتی۔ رحمت اسے بار بار کہتا کہ چلو بھاگ چلیں لیکن عائشہ نہ مانی۔ اس نے رحمت سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر تمہارے ماں باپ مان جاتے ہیں تو قدیر سے طلاق لے لیتی ہوں۔ رحمت نے اپنا وعدہ نبھایا۔ اس نے دو رشتے ٹھکرا دیئے۔

وقت گزرتے گزرتے آٹھ مہینے گزر گئے۔ رحمت نے عائشہ کو ایک دن کہا کہ وہ قدیر کو راستے سے ہٹا دے گا پھر ماں باپ کو عائشہ کے ساتھ شادی کرنے کے لیے رضامند کرے گا۔ عائشہ نے مجھے بتایا کہ وہ اس کی بات سمجھ نہ سکی۔ وہ سمجھی کہ وہ قدیر کو طلاق پر راضی کرے گا بلکہ بعد میں وہ اس کی اس بات کو مذاق سمجھتی رہی۔

تین روز بعد قدیر اس حالت میں گھر آیا کہ ایک ہاتھ پیٹ پر اور دوسرا سینے پر رکھا تھا۔ ناک سے خون نکل رہا تھا۔ وہ کسی کو کچھ نہ بتا سکا۔ صحن میں آ کر گرا اور مر گیا۔ عائشہ نے کہا۔ "جب وہ گرا تو مجھے فوراً رحمت کی بات یاد آئی کہ میں قدیر کو راستے سے ہٹاؤں گا۔ اس وقت مجھے سمجھ آئی کہ اس نے کیا کہا تھا۔ قدیر کو دیکھ کر میرے منہ سے نکلا ہائے اسے تو کسی نے زہر دیا ہے۔ مجھے دو آدمیوں پر بھی شک تھا۔ وہ مجھے دس دس روپے کے نوٹ دکھاتے رہتے تھے۔ مجھے پیغام بھی بھیجا کرتے تھے۔ منتیں کرتے اور ساری عمر غلام رہنے کے وعدے کرتے تھے۔ میں جانتی ہوں کہ قدیر کی موت پر یہ سارے آدمی خوش ہوں گے۔ رحمت بھی آیا تھا۔ میں نے اسے مردوں میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ قدیر مجھے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن وہ میرا خاوند تھا۔ میرے سر کی چادر تھا۔ میری عزت اسی سے تھی۔ میں غصے سے پاگل ہونے لگی۔ رحمت رات دیر تک باہر مردوں میں بیٹھا رہا۔ میں اسے بار بار دیکھتی رہی۔ وہ جانے کے لیے اٹھا تو میں چوری چھپے گاؤں سے نکل کر اس کے راستے میں کھڑی ہو گئی۔ میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ قدیر کو زہر اس نے دیا ہے یا کسی اور نے۔ وہ مجھے اتنی خوشی سے ملا جیسے ہمارا رشتہ طے ہو گیا ہو۔ بڑے فخر سے کہنے لگا۔ "میں نے راستہ صاف کر دیا ہے۔ تیار رہو۔" میں نے اسے کہا۔ "کل ملنا۔ میں آؤں گی" ــــ اور وہ خوش خوش چلا گیا۔"

عائشہ کے دل میں انتقام آ گیا۔ وہ دو روز بعد گاؤں سے دور اس جگہ پہنچی جو اس نے رحمت کو بتائی تھی۔ رحمت اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جانوروں کی طرح گردن تان کر اسے کہا۔ "میں قدیر جیسے دس آدمیوں کو ختم کر سکتا ہوں" ــــ اس کے ساتھ ہی اس پر شیطان سوار ہو گیا۔ وہ عائشہ کو کھڑی فصل میں چلنے کو کہنے لگا۔ عائشہ نے مجھے سنایا۔ "میں بدکار نہیں۔ میں نے اسے کہا تھا کہ جائز طریقے سے شادی کر لو۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں خاوند سے طلاق لے لیتی ہوں لیکن اس نے میرے خاوند کو زہر دے دیا اور ابھی اس کی قبر کی مٹی خشک نہیں ہوئی تھی کہ مجھے بدکاری کے لیے کہنے لگا۔ میں بھول گئی کہ اس شخص کو میری روح بھی چاہتی ہے۔ میں نے یہی محسوس کیا کہ وہ مجھے بیوہ سمجھ کر مجھے فصل کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ میں نے اس کے پیچھے ہو کر اس کی گردن ہاتھوں میں دبا لی۔ اس نے زور لگایا لیکن میں نے اس کا سانس روک دیا۔ وہ بے بس ہو کر تڑپنے لگا اور گر پڑا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی گری۔ گردن نہ چھوڑی۔ میرے منہ سے یہی لفظ بار بار نکلتے تھے۔ "تم مرد ہوتے تو بزدل چوہوں کی طرح میرے خاوند کو زہر نہ دیتے۔ میں اپنے خاوند کا بدلہ لے لوں گی" ــــ پھر اس کی حرکت ختم ہو گئی۔"

وہ بول رہی تھی اور میں اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی روح کا حسن اس کے چہرے پر آ گیا تھا اور اب کسی ڈر یا خطرے کے بغیر بول رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں نہیں بتا سکتی کہ میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آئی تھی اور میری حس پر کس شے کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس کی جان نکل گئی تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا اور نہ مجھے ڈر لگا کہ پکڑی

جاؤں گی۔ میں اور زیادہ دلیر ہو گئی۔ میں نے لاش کو کندھے پر ڈال لیا۔ آپ نہیں مانیں گے کہ میں نے اتنے بھاری مرد کو کندھے پر اٹھا لیا ہو گا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ ریل کی لائن بہت دور نہیں تھی۔ میں نے لاش ایک لائن پر لٹا دی۔ آدھا دھڑ ادھر آدھا ادھر۔ اور وہاں سے قدیر کی قبر پر چلی گئی۔ قبر پر ہاتھ پھیرتی رہی اور بین کرتی رہی۔ گاؤں کے دو آدمیوں نے میری آواز سنی تو آ کر مجھے گھر لے گئے۔"

عائشہ کو چند اور آدمی بھی پھانسنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ سب کو نفرت سے دھتکار چکی تھی۔ اس کا خاوند مارا گیا اور جسے وہ چاہتی تھی اسے اس نے اپنے ہاتھوں مار دیا تو اس کی دماغی حالت اس کے قابو سے باہر ہونے لگی۔ اس سے پہلے وہ دو مرتبہ شاہ کے گھر سلام کے لیے گئی تھی۔ اب وہ بہت پریشان ہوئی تو پھر شاہ کے پاس گئی اور اسے کہا کہ وہ اس کے لیے دعا کرے کہ خدا اس کی مشکلیں آسان کر دے۔ اسی روز وہ شاہ کے گھر سے واپس آئی تو شاہ کا بیٹا اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ عائشہ بھی دیہات کی دوسری عورتوں کی طرح اس کا احترام کرے گی اور وہ جو چاہے گا وہ کر گزرے گی۔ عائشہ نے اسے بھی کھری کھری سنا دیں۔ وہ دوسرے دن پھر شاہ کے پاس گئی تو شاہ نے اسے رات کو بلایا اور کہا کہ وہ جو تعویذ دے گا وہ رات کو ملتا ہے۔ عائشہ جھانسے میں آگئی۔ اگر وہ شاہ تک رات کو پہنچ جاتی تو شاہ نہیں تھا یا عائشہ کی عزت نہیں تھی۔ بھولیوں کو شاہ کا بیٹا بھی سن رہا تھا کہ عائشہ کو باپ نے رات کو بلایا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب عائشہ رات کے وقت شاہ کے گھر کی طرف جا رہی تھی اس کا بیٹا اسے راستے میں مل گیا۔ اس نے اس پر اپنی خبیث نیت کا اظہار کیا تو عائشہ نے اسے عزت سے کہا کہ وہ اسے بدکار نہ سمجھے مگر وہ اس کی بات نہ سمجھا۔ عائشہ نے اسے سختی سے منع کیا تو شاہ کا بیٹا اپنی مردانگی کا رعب جمانے لگا۔ عائشہ نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ شاہ کے بیٹے نے ایک ہاتھ عائشہ کے دائیں کان پر رکھا، دوسرا بائیں کان پر اور اس طرح اس کے سر کو جکڑ کر اپنا منہ اس کے منہ کی طرف لے جانے لگا۔ عائشہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑ لی اور دونوں انگوٹھے شہ رگ کے دائیں بائیں رکھ کر پورے زور سے دبا دیئے۔ شاہ نے عائشہ کے بال مٹھیوں میں پکڑ کر کھینچے اور اس کے ہاتھوں میں اس کا ایک کانٹا بھی آگیا ہو گا جس کا ایک موتی نکل کر گر پڑا۔ عائشہ نے اس کی گردن کو اور زیادہ دبا لیا۔ شاہ کا بیٹا بہت تڑپا لیکن عائشہ اپنی عزت کی خاطر چڑیل بن چکی تھی۔ اس نے اسے جان سے مار کر ہی دم لیا۔ وہ گرا تو عائشہ کے کئی بال اس کی مٹھیوں میں چلے گئے۔ عائشہ شاہ کے گھر نہ گئی۔ وہیں سے واپس آگئی۔

"میں اس کے گھر اس لیے نہ گئی کہ مجھے اس کی بھی نیت پر شک ہو گیا تھا" عائشہ نے کہا۔ "معلوم نہیں مجھے یہ عقل کس نے دی کہ شاہ جو تعویذ رات کو دے گا وہ دن کے وقت بھی دے سکتا ہے۔ مجھے اس کی آنکھیں یاد آگئیں۔ میں اس کے پاس جاتی تھی تو مجھے باؤلے کتوں کی طرح دیکھتا تھا۔"

عائشہ نے کہا۔ "اس سے پہلے بھی کئی مرد میرے پیچھے پڑے رہتے تھے لیکن میں نے کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ مگر میرا خاوند مارا گیا تو میں چڑیل بن گئی۔ میں اپنے خاوند سے شرمسار ہوں کہ اس کی زندگی میں ایک غیر مرد کو دل میں بٹھائے رکھا لیکن میرا خدا خود ہی گواہی دے گا کہ میرے اس جسم کا مالک میرا خاوند تھا۔ یہ جسم اسے بھی نہیں دیا جسے میں دل سے چاہتی تھی۔"

اُس وقت عائشہ کا حسن دیکھنے والا تھا۔ مجھے اس سوال کا جواب مل گیا کہ اس لڑکی میں وہ کیا کشش ہے جس نے میری تھانیداری کو بھی ہلا دیا تھا۔ یہ روح کا حسن تھا اور یہ دل کی پاکیزگی تھی جو اس کی آنکھوں میں چمکتی تھی اور جو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر کھِل رہی تھی۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ احترام سے اس کے سر کو چوم لوں جسے پاک رکھنے کے لیے اس نے دو مردوں کی گردنیں مروڑ دی تھیں۔ میں جب تھانے میں گیا تو میں نے اس کے اُن بالوں کو جو شاہ کے بیٹے کی مٹھی سے نکالے تھے اور انہیں بھی جو رحمت کی لاش کی جیب سے برآمد ہوئے تھے۔ مگر عائشہ نے مجھے بڑے ہی سخت امتحان میں ڈال دیا۔ قانون کی نگاہ میں وہ دوہرے قتل کی مجرم تھی لیکن میری نگاہ میں اس کا رتبہ کچھ اور تھا۔ میں قانون کا غلام تھا۔ تین آدمی قتل ہو گئے تھے۔ مجھے استغاثہ مضبوط بنانا تھا مگر میرے اندر اس لڑکی کا ایک مسلمان بھائی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی کو سزا ہو۔ مجھے لڑکی

کو حراست میں ضرور لینا تھا اور مجسٹریٹ کے پاس لے جا کر اقبالی بیان بھی
ریکارڈ کرانا تھا۔

میں عائشہ کو حراست میں لے کر تھانے لے گیا۔ اسے حوالات میں
بند کر دیا اور کانسٹیبلوں سے کہا کہ اسے معمولی مجرم نہ سمجھیں۔ اسے عزت
سے رکھیں۔ اس کے لیے کھانا اپنے گھر سے پکوا کر بھیجا۔ سوچ سوچ کر میرا
سر چکرانے لگا۔ شام کو ایک گاڑی ہمارے سٹیشن پر رکتی تھی۔ مجھے ایک
سکھ مجسٹریٹ کا خیال آیا۔ میں نے ایک بار اس کا کام کیا تھا۔ میں نے وردی
اتاری۔ اپنے کپڑے پہنے اور شام کی گاڑی سے شہر چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کا
سفر تھا۔ شہر پہنچا تو اس سکھ مجسٹریٹ کے گھر چلا گیا۔ ہندو بڑی ہی کمینی
اور دھوکا باز قوم ہے۔ سکھوں پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ مجسٹریٹ گھر پر مل گیا۔
بڑے تپاک سے ملا۔ میں نے اسے عائشہ کی ساری کہانی اور اس کا بیان
سنا دیا اور اسے کہا کہ میں اسے آپ کے پاس اقبالِ جرم کے لیے لا رہا
ہوں مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ سزا سے بچ جائے۔ سکھ سمجھ گیا کہ میری نیت
خراب نہیں اور میں لڑکی کی غیرت مندی کی وجہ سے اسے بچانا چاہتا ہوں۔
اس کا طریقہ یہی تھا کہ کچھ گڑبڑ اقبالی بیان میں یہ مجسٹریٹ کر دے اور
استغاثہ میں ایک دو کمزوریاں میں خود چھوڑ دوں۔

میں نے مجسٹریٹ سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ اقبالی بیان
اتنا کمزور لکھیں کہ مجھ پر کسی کو شک نہ ہو اور عدالت یہ ریمارک نہ دے
کہ پولیس نے استغاثہ بہت کمزور بنایا ہے۔"

مجسٹریٹ میری بات سمجھ گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرا کام کر دے
گا اور لڑکی کو بری ہونے کا موقع دے گا۔ رات کی پسنجر ٹرین سے میں واپس
آیا۔ میں نے عائشہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھے وہ رات آج بھی یاد ہے۔ میں
ساری رات نہیں سویا۔ سوچتا رہا۔ کروٹیں بدلتا رہا اور صبح ہو گئی۔ عائشہ
کو حوالات سے نکالا۔ اسے ناشتہ کروایا۔ منہ ہاتھ دھلایا اور ایک کانسٹیبل
کو ساتھ لے کر عائشہ کو ریلوے سٹیشن پر لے گیا۔ یہ گاڑی بھی ہمارے سٹیشن پر
رکتی تھی۔ میں عائشہ کو مجسٹریٹ کے پاس اقبالی بیان کے لیے لے گیا۔
مجسٹریٹ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ کچھ کمزوریاں اقبالی بیان میں ڈال دیں۔
کچھ گڑبڑ میں نے اپنے استغاثہ میں کی لیکن ہم دونوں عائشہ کو عمر قید سے
نہ بچا سکے اور وہ اپیل میں بھی بری نہ ہو سکی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی
کہ عائشہ سیشن کورٹ میں جا کر بھی اپنے اقبالی بیان سے منحرف نہیں ہوئی تھی۔

سرورق کی طویل کہانی واپس کرتے ہوئے
متعلقہ ایڈیٹر نے کہا "معاف کیجیے۔ میں آپ کی ٹیکنی
کلر کہانی شائع نہیں کر سکتا۔"

"ٹیکنی کلر کہانی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں، پہلے صفحہ پر ہیروئن شرم سے سرخ ہو
گئی۔ دوسرے صفحے پر ہیرو غصے سے نیلا پڑ گیا۔ تیسرے صفحہ
پر رقیب روسیاہ خوف کے باعث پیلا پڑ گیا۔ چوتھے پر
نیلے آسمان پر سفید بادل تیرنے لگے۔ پانچویں پر ہیروئن کی
بہن نے دھانی دوپٹہ پہنا۔ چھٹے پر سبز رنگ کا طوطا ٹیں ٹیں
کرنے لگا۔ ساتویں پر سیاہ رات کے اندھیرے میں ہاتھ کو
ہاتھ سجھائی نہ دیا اور آٹھویں پر لڑکی کے گالوں پر قوسِ
قزح کے رنگ بکھر پڑے۔"

باتیں کرتے کرتے اُس کی سانس اُکھڑنے لگی، میں نے اُس کو ہلایا جلایا، مگر اُس کے چہرے پر موت کا پسینہ آگیا تھا اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

اماوس کی رات

زاهد محمود

ٹھنڈی، خوشبوؤں سے لدی ہوا کُھلی کھڑکی کے اندر آرہی ہے۔ اِک نگاہ باہر کی دُنیا پر ڈالتا ہُوں۔ آسمان نیلا اور شفاف ہے۔ ستارے ٹمٹما رہے ہیں۔ چاند کی عدم موجودگی کے باوجود رات روشن ہے۔ جھینگروں کی صدائیں وقفے وقفے سے آرہی ہیں جو رات کے سناٹے میں شگاف ڈال دیتی ہیں۔

مَیں لمبی آہ بھرتا ہُوں...

دُنیا کتنی حسین، کتنی پُر سکون اور دلفریب ہے لیکن یہ میرے لیے نہیں۔ مجھے اپنے مقدر پر حیرت ہوتی ہے۔ دُنیا کی کونسی آسائش ہے جو مجھے میسّر نہیں۔ آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ہر نگاہ کی توجہ کا مرکز پایا۔ دولت مند گھرانے کا بیٹا۔ خوشیاں، مسرتیں، جو چاہا وہ پایا۔ اس کے باوجود میں اس

دُنیا کو اپنے لیے ایک جہنّم سمجھتا ہُوں اور مسلسل جُھلس رہا ہُوں
دو سال سے میری زندگی میں ایسا انقلاب آیا ہے جس نے
میرے شب و روز کا سکون چھین لیا ہے۔ دو سال کے
اندر میرے چہرے کی سپیدی اور سُرخی زردی میں تبدیل ہو
گئی ہے۔ ان دو برسوں میں میرا وزن کم ہُوا ہے۔ مَیں ایسی
بیماری میں مبتلا ہُوں جس کا علاج کسی کے پاس نہیں لاکھوں
جتن کیے، ہر در تک پہنچا، دولت پانی کی طرح بہا دی لیکن
مایُوسی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

مَیں آخری فیصلہ کر چکا ہُوں۔ خود ہی اپنی جان لینے کا
فیصلہ! مَیں نے تاریخ تک مقرر کر رکھی ہے۔ آج چاند کی
دو تاریخ ہے۔ مَیں چاند کی تیرہ تاریخ کو اپنی جان اپنے ہاتھوں
سے ختم کر دُوں گا۔

اپنی زندگی لینے سے پہلے مَیں اپنی زندگی کی داستان لکھ
کر مکمل کر دینا چاہتا ہُوں۔ کل مَیں نے اپنا فیصلہ حتمی طور پر
قبول کر لیا تھا۔ آج سے مَیں نے اپنی رُودادِ حیات لکھنا
شروع کر دی ہے۔ مَیں تیرہ تاریخ تک اپنی زندگی کی داستان
مکمل کر کے اپنے پیچھے چھوڑ جانا چاہتا ہُوں۔ جانتا ہُوں کہ
جب میری خودکشی کے بعد میرے ہاتھ کی لکھی ہُوئی میری
اپنی آپ بیتی کسی کے ہاتھ لگے گی اور وہ اسے پڑھے گا تو
اُسے یقین نہیں آئے گا لیکن مَیں یہ بھی جانتا ہُوں کہ مجھے
چند ایسی پڑھنے والی آنکھیں ضرور مل جائیں گی جو میری
آپ بیتی کو ناقابلِ یقین نہیں بلکہ حقیقی اور سچی قرار دیں گی۔
مَیں ایک ناکام انسان ہُوں، اس لیے خودکشی کا فیصلہ کر چکا ہُوں۔

کوئی یقین نہیں کرے گا کہ چاند بھی انسان کا دشمن
ہو سکتا ہے۔ دو برس ہونے کو آئے ہیں جب آسمان پر
چمکنے والے منوّر چاند نے میرے خلاف سازش کی اور مجھے
مغلوب کر لیا۔ چاند کے خلاف اس جنگ میں کوئی انسان
میرے لیے کمک مہیّا نہ کر سکا۔ بالآخر مَیں اکیلا رہ گیا۔

اسے اتفاق کہیے یا عجیب و غریب واقعہ کہ جب مَیں
پیدا ہُوا تو میرے والدین نے میرا نام قمر خاں رکھا۔ میرے
والد بہت بڑے جاگیردار تھے۔ زمینیں اور جائیداد ہمارے
خاندان میں کئی پُشتوں سے چلی آ رہی ہیں۔ میری پیدائش
ہماری آبائی حویلی میں ہُوئی۔ یہ حویلی قلعہ نما ہے۔ کم از کم
سو برس پُرانی ہے لیکن جہاں ان سو برسوں میں اس کی
اصل شکل و صُورت تبدیل نہیں کی گئی، وہاں اس دوران
میں وہ تمام سہولتیں اور آسائشیں فراہم کی گئیں جن کے بغیر
آج کا جدید انسان گزارہ نہیں کر سکتا۔

پچھلے چند روز سے مَیں اپنی اسی آبائی حویلی میں آ گیا
ہُوں۔ ہماری حویلی میں درجنوں ملازم ہیں لیکن مَیں نے
سب ملازموں کو چھُٹی دے دی ہے۔ انھیں بہت حیرت
ہُوئی تھی۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ وہ چاند کی چودھویں تک
چھُٹی کر سکتے ہیں۔ درجنوں خدمت گزاروں میں سے مَیں
نے اپنے ایک پُرانے بُوڑھے ملازم مُراد کو حویلی میں رکھ
لیا ہے۔ مُراد ہر فن مولا ہے۔

یہ حویلی جو بیسیوں کمروں، راہداریوں اور چند خفیہ
تہ خانوں پر مشتمل ہے، ایک چھوٹے قلعے کے مانند ہے۔
اس کی یہ اُونچی دیواریں فصیل نما ہیں جن پر کنگورے اور
بُرجیاں دُور سے دکھائی دیتے ہیں۔ اس حویلی نے زمانے
کے کئی دَور دیکھے ہیں۔ آج بھی وہاں جہاں قیمتی اور اصیل
گھوڑوں کا اصطبل ہے، وہاں میری دو انتہائی قیمتی اور
ماڈرن کاریں بھی موجود ہیں۔ حویلی کی ظاہری حالت انسان پر
دبدبہ اور ہیبت طاری کر دیتی ہے۔ فصیل نما دیواروں کے
اندر اور باہر اَن گنت بلند و بالا قدیم چھتنار درخت ہیں۔
بعض مقامات پر ان درختوں کی ٹہنیوں اور شاخوں نے
فصیل نما دیواریں ڈھانپ رکھی ہیں۔

حویلی کے بیشتر کمرے بڑے قیمتی اور نادر فرنیچر سے
آراستہ ہیں۔ چند کمرے ایسے بھی ہیں جو مکمل طور پر ماڈرن
ہیں۔ یہاں صوفے ہیں۔ جدید دَور کا فرنیچر ہے۔ ہر وہ چیز
جو کسی بڑے دولت مند شہری مہذّب اور ماڈرن گھرانے
میں ہو سکتی ہے، وہ اس حویلی میں موجود ہے۔ چالیس پچاس

برس پہلے حویلی میں قندیلیں اور شمعیں جلتی تھیں۔ قیمتی جھاڑ اور فانوس دساور سے منگوائے جاتے تھے۔ کئی کمروں میں آج بھی وہی پرانے جھاڑ اور فانوس شمعوں سے روشنی کرتے ہیں لیکن اب وہاں بجلی بھی آچکی ہے۔ ریفریجریٹر بھی ہے اور ٹی وی بھی۔ ریڈیو بھی، وی سی آر بھی اور جدید الیکٹرانکس کا سب سامان بھی۔ معلوم نہیں چاند کی تیرہ تاریخ کے بعد اس کا حشر کیا ہوگا۔

میری پیدائش پر میرے والد نے جس جشنِ ولادت کا اہتمام کیا، اُس پر لاکھوں روپے خرچ کر دیے۔ غریب غُربا اور ضرورتمندوں کی جھولیاں بھر دی گئیں۔ میں اپنے والدین کی پہلی اور آخری اولاد تھا، اس لیے وہ مجھ پر ہر لحہ واری صدقے جاتے۔ میری خدمت اور نگہداشت کے لیے کئی ملازمائیں بھی رکھی گئی تھیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایسے کمرے میں پایا جہاں چاروں طرف کھلونے ہی کھلونے دکھائی دیتے تھے۔ انتہائی مہنگے اور قیمتی کھلونے جو دُنیا بھر سے جمع کیے گئے تھے۔

قدیم رواج کے مطابق میری رسمِ بسم اللہ ہُوئی تو ایک بار پھر پورے علاقے میں خوشیاں منائی گئیں اور جشن کا سماں پیدا ہوگیا۔ مَیں اپنے والدین کی آنکھوں کا تارا تھا۔ میری تعلیم کے لیے قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ میری ہر خواہش میری زبان پر آنے سے پہلے پُوری کر دی جاتی مجھے کچھ طلب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ ملازم ہر وقت میرے ناز اُٹھانے کے لیے موجود تھے۔

ان سب خوشیوں اور آسائشوں کے ساتھ ساتھ مَیں بڑا ہُوا۔ گیارہ برس کا ہُوا تو میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اپنی ماں کی موت کا صدمہ آج تک میرے ذہن میں تازہ ہے۔ اُس وقت پہلی بار مجھے احساس ہُوا تھا کہ دُنیا میں بہت سے ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں جن کے سامنے دولت کے ڈھیر بھی ہیچ اور ناکارہ ہیں۔ میری والدہ کی وفات کے بعد میرے والد نے میری دلداری اور نازبرداری میں کہیں زیادہ اضافہ کر دیا۔ بعض لوگوں نے انہیں دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا لیکن میرے والد نے انکار کر دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سوتیلی ماں کبھی میرے ساتھ انصاف نہ کر سکے گی۔ ویسے بھی انہیں میری والدہ سے بے حد محبت تھی۔

مَیں سترہ برس کی عمر میں ایف اے کا طالب علم تھا کہ میرے والد شدید بیمار پڑ گئے۔ والدہ کی موت کے بعد اُن کی صحت کو گُھن لگ چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ گُھل رہے تھے۔ مَیں جانتا ہُوں وہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔ وہ میری وجہ سے بھی زندگی کے خواہاں تھے لیکن روگ اندر ہی اندر انہیں چاٹتا چلا گیا تھا۔ اُن کی بیماری پُراسرار سی تھی۔ ہر ڈاکٹر اور معالج کی تشخیص جُداگانہ تھی۔ اُن کا علاج ہوتا رہا۔ وہ تقریباً ایک برس تک بستر کے ساتھ لگے رہے اور پھر ایک دن اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں علاقے کا نیا جاگیردار تھا۔ دُنیا کی ہر آسائش مجھے میسّر تھی لیکن میرا اپنا کوئی نہ رہا تھا۔ باپ نہ ماں...

میرے والد نے اپنے انتقال سے دو ایک روز پہلے مجھے خاص طور پر بلوایا۔ اپنے پاس بیٹھے ملازموں اور عیادت

کتارے

ایک نوجوان نے اپنی گرل فرینڈ پر رعب جمانے کی خاطر کہا: "میرے دائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ میرا بایاں ہاتھ کیا کر رہا ہے۔"
گرل فرینڈ بولی: "ممکن ہے مگر مجھے اچھی طرح خبر ہے۔"

✪

ملازمت کی خواہشمند لڑکی سے ایک کمپنی کے ڈائریکٹر نے کہا: "معاف کیجیے ہم آپ کو اپنے یہاں ملازمت نہیں دے سکتے۔ جہاں آپ پہلے کام کرتی تھیں وہاں سے آپ کو بہت اچھے چال چلن کا سرٹیفکیٹ ملا ہے۔"

ے آنے والے لوگوں کو اپنے کمرے سے چلے جانے ے کہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو میرے والد نے ھے اپنے پلنگ پر اپنے قریب بٹھا لیا۔ انھوں نے میرا ا تھام کر بڑے دُکھ بھرے پُراسرار اور دھیمے لہجے میں نا شروع کیا:

"قمر خاں! میرا آخری وقت آ چکا ہے۔ جانتا ہوں کہ اب میں زیادہ دن نہیں جی سکوں گا۔ میرے بعد تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ اس جاگیر کو ترقی دینی ہوگی جو ہمارے رگوں کی یادگار اور ہمارا افتخار ہے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں سہرا باندھے دیکھوں۔"

میں نے والد محترم کی بات ٹالتے ہوئے کہا تھا:

"آپ کی ہر خواہش پوری کرنا میرا فرض ہے۔ آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ پھر دل کے ارمان پورے کر لیجیے۔"

میرے والد کے چہرے کی کیفیت بتا رہی تھی کہ میری شادی کا مسئلہ اُن کے لیے یقیناً بہت اہم ہے لیکن اس سے بھی زیادہ کوئی اہم بات ہے جسے وہ کہتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ میں نے اُن کے چہرے کے بدلتے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے اندر یہ ہمت پیدا کر چکے ہیں کہ ہچکچاہٹ کو دُور کر کے وہ بات کہہ ڈالیں۔ وہ پُراسرار دھیمے لہجے میں کہنے لگے:

"ہمارے خاندان کی ایک عجیب روایت چلی آ رہی ہے۔ کاش میں تمہیں تفصیل سے کچھ بتا سکتا! مسئلہ ایسا ہے کہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ اس کے باوجود میں تمہیں ہوشیار کر دینا چاہتا ہوں۔"

میں بڑے تجسس سے اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔

"ہمارے خاندان کی ہر تیسری پشت میں ایک آدمی کو ایک خاص مرض لاحق ہوتا ہے۔ تمہارے پردادا بھی اسی پُراسرار مرض میں مبتلا ہوئے تھے۔ اس سے پہلے بھی تین پشت کے ایک فرد کو یہ مرض لاحق ہوا تھا۔ وہ پاگل ہو کر مرے تھے..."

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں تک مجھے کچھ سُجھائی نہ دیا کہ کیا کہوں؟

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

میرے والد صاحب نے میرا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ اُن کے ہاتھ کی ٹھنڈک میں اب تک محسوس کر رہا ہوں۔

"ہاں، یہ سچ ہے... ہمارے خاندان کی تیسری پشت میں ایک نہ ایک شخص پاگل ہو کر مرا ہے۔"

وہ رُک گئے۔ اُن کے چہرے پر اذیت کی ایسی کیفیت دکھائی دی جو میرے لیے اُس وقت بھی بڑی تکلیف دہ تھی اور آج بھی حد درجہ تکلیف دیتی ہے۔

"ہاں... یہی سچ ہے... اب تیسری پشت میں تم آ گئے ہو۔"

میرا جی دہل گیا ـــ لیکن دوسرے لمحے میں نے اسے اپنے والد کی توہم پرستی سمجھا۔ میں ایک تعلیم یافتہ انتہائی صحت مند اور وجیہہ نوجوان تھا۔ بھلا میں کیوں پاگل ہوتا! لیکن اپنے مرتے ہوئے باپ کی بات جھٹلانا بھی میرے بس میں نہیں تھا، اس لیے خاموشی سے بیٹھا سُنتا رہا۔

"قدیم خاندانی روایت کے مطابق اس پشت میں تیسرا نمبر تمہارا ہے اور اب تمہاری باری ہے..."

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے مُنہ پر ہاتھ رکھ لیا جیسے وہ پشیمان ہوں کہ یہ جملہ اُن کی زبان سے کیوں نکل گیا۔

مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ خاصی دیر گہری بوجھل خاموشی چھائی رہی تھی۔ پھر جیسے والد محترم نے یکدم موضوع بدل دیا۔ میرے ہاتھ کو قدرے بھرپور انداز میں دبانے کی کوشش کرتے ہوئے انھوں نے مُردہ سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا:

"وعدہ کرو کہ تم جلد ہی شادی کر لو گے۔"

"مگر آپ ابھی خاندانی روایت کی بات کر رہے تھے۔ ہر تیسری پشت میں پاگل ہو جانے کی روایت..."

ہاں... وہ روایت تو ہے لیکن تم وعدہ کرو کہ شادی کر لوگے۔"

مجھے اپنے والد کی باتیں سمجھ میں نہ آ رہی تھیں لیکن اُن کی خوشی کے لیے مَیں نے شادی کرنے کا وعدہ کر لیا۔

تیسرے دن والد صاحب انتقال کر گئے اور مَیں وہ سب باتیں بھول گیا جو اُنھوں نے مجھے خاندانی روایت کے بارے میں بتائی تھیں۔

❁

بیس برس کی عمر تک مَیں نے بی اے کر لیا۔ آگے پڑھنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ جاگیر کا کام ہی اتنا پھیلا ہُوا تھا کہ مجھے اس طرف پُوری توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ مَیں اپنی حویلی ہی میں رہنے لگا۔ شہر کا بنگلہ کرایے پر چڑھا دیا۔

پھر میری زندگی میں گلابو داخل ہُوئی۔

وہ سچ مچ گلاب کا پھول تھی۔ نازک، بے حد حسین اور معطر... وہ جنتِ نگاہ تھی اور فردوسِ گوش تھی۔ اُس کا سراپا سُرخ و سپید گلاب کی پتیوں اور خوشبوؤں سے گوندھا گیا تھا۔ وہ گودڑی کا لعل تھی۔

اس وقت جبکہ مَیں اپنی رُودادِ حیات قلم بند کر رہا ہُوں، دو باتیں ایسی ہیں جو مجھے بہت عجیب لگ رہی ہیں۔

جس طرح چاند میرا دشمن بن گیا ہے اور میرا پیدائشی نام اتّفاق سے قمر خاں ہے، اسی طرح گلابو بھی اسم بامسمّیٰ تھی۔ اُس کی زندگی گلاب کی طرح تھی جو کونپل کی صورت میں جنم لیتا، پھول بنتا، خوشبوئیں اور حُسن بکھیرتا اور پھر مُرجھا جاتا یا مسل دیا جاتا ہے۔ میرا اپنا نام اور گلابو کا نام اور اُسی کا مقدر میری زندگی کی داستان میں معنی خیز اہمیت رکھتے ہیں جبکہ لوگ کہتے ہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے اور مَیں کہتا ہُوں کہ نام میں بہت کچھ ہوتا ہے۔

میرے دل میں جو طوفان دو سال سے بپا ہے، اب اس طوفان کو سکون سا آ رہا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ مَیں اپنا آخری فیصلہ کر چکا ہُوں کہ مَیں خودکشی کر کے چاند کو موقع نہیں دُوں گا کہ وہ مجھے شکست دے سکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب بھی گلابو کی یاد آتی ہے، دل عجب سوز و گداز سے بھر جاتا ہے۔ اُس کی موت جس انداز میں ہُوئی، اُس سے پُورا علاقہ کانپ اُٹھا تھا۔ آج تک لوگ اُس کے قاتل کی تلاش میں ہیں۔ آج بھی بچے بچے کی زبان پر اُس کے ہولناک قتل کا ذکر آ جاتا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اُس کا قاتل کون ہے... سوائے میرے... ہاں مَیں جانتا ہُوں کہ اُس کا قاتل کون ہے... کونسی اندھی قوت تھی جس نے اُسے قتل کر دیا۔

مَیں جو کچھ جانتا ہُوں وہ اپنے سینے میں چھپا کر اس دُنیا سے جانا نہیں چاہتا، اس لیے یہ رُوداد لکھ رہا ہُوں۔

حویلی کا باغ پُورے علاقے میں شہرت رکھتا تھا۔ میرے بزرگوں نے ہمیشہ حویلی کے باغ کو حسین اور بھرپُور بنانے کے لیے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ یہ باغ جس میں فوّارے بھی تھے اور سنگی تخت بھی بنائے گئے تھے، ہماری امارت کا اظہار کرتا تھا۔ سالہاسال سے اس میں نت نئے پھل دار درختوں اور پھُولوں کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ موسم کوئی بھی ہوتا اس باغ میں بعض درخت پھلوں سے لدے نظر آتے اور بعض کیاریوں میں پھُول مہک رہے ہوتے۔ تین مالی ہمہ وقت کام کرتے تھے۔ ہیڈ مالی کرم دین تھا اور گلابو اُس کی بیٹی تھی۔

گلابو کو مَیں بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ اس حویلی سے تعلق رکھنے والے افراد میں سے ایک تھی لیکن بچپن میں وہ مجھے کبھی اچھی نہ لگی تھی۔ جب مَیں تعلیم کے لیے شہر گیا اور وہاں کئی برس رہا اور تعطیلات میں واپس آتا تو کبھی کبھار گلابو پر نظر پڑ جاتی جو اب مجھے خاصی اچھی لگنے لگی تھی لیکن ابھی میرے دل میں اُس کے لیے محبت کا چراغ روشن نہ ہُوا تھا۔

جب مَیں مستقل حویلی میں رہنے لگا اور جائیداد اور جاگیر کے تمام انتظامات سنبھال لیے تو پھر ایک دن مَیں نے گلابو کو دیکھا...

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب مَیں صبح باغ میں

ہواخوری کر رہا تھا۔ باغ خوشبوؤں میں مہکا ہوا تھا۔ فضا اور
ہوا معطر تھی۔ ابھی صبح کا دھندلکا تھا جب میں نے کسی کو
پھولوں کی ایک کیاری کے پاس جھکے ہوئے پایا۔ اس کی
طرف بڑھا تو میں نے دیکھا کہ ایک دوشیزۂ بہار جھکی موتیے
کی کلیاں چن رہی ہے۔۔۔ محراب بناتا ہوا جسم اور وہ اس
کا وحشت زدہ ہرنی کی طرح چونکنا۔۔۔ اور پھر مجھے دیکھ کر کچھ
حیرت سے اور کچھ سہمے ہوئے انداز میں مسکرا دینا۔۔۔ یہ
سب کچھ چند لمحوں میں ہوا اور انہی چند لمحوں میں میں نے
یوں محسوس کیا کہ حسن، جوانی اور معصومیت کو اپنی مکمل ترین
صورت میں ایک ہی سراپے میں دیکھ لیا ہے۔

کچھ کہے بغیر جب اس نے اپنا خوبصورت نازک ہاتھ
ماتھے کی طرف اٹھا کر مجھے سلام کیا تو اس کے ہاتھوں میں رکھی
ہوئی موتیے کی کلیاں زمین پر گرنے لگیں۔ وہ کچھ نادم سی
ہوئی اور پھر ان کلیوں کو اٹھائے بغیر وہاں سے چل دی۔ اس
کے جانے کے بعد میں نے اوس کھائے سبزے پر چمک
چمک کرتی سپید کلیوں کو جھک کر اٹھایا تو مجھے وہ کلیاں دوسری
کلیوں سے کہیں زیادہ سپید، خوبصورت اور معطر لگیں۔ یہ
گلابو کا لمس تھا جس نے انہیں نئی خوبصورتی اور نئی خوشبو
عطا کر دی تھی۔

میں نے اپنی جاگیر کے میر منشی احمد بیگ سے بات
کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میر منشی کا خاندان کئی پشتوں سے ہماری
خدمت ادا کرتا چلا آ رہا تھا۔ ہم اگر نسلی طور پر جاگیردار تھے
تو اس کا خاندان نسل در نسل ہماری جاگیر کا میر منشی چلا آ رہا
تھا۔ احمد بیگ اس وقت ساٹھ پینسٹھ برس کے پیٹے میں
تھا۔ دو لڑکیاں تھیں جو بیاہی گئی تھیں اور اپنے بیٹے کو وہ
اپنے ساتھ کام پر لگائے ہوئے تھا کیونکہ مستقبل میں
احمد بیگ کے بعد اسے ہی یہ منصب سنبھالنا تھا۔ میں فیصلہ
کر چکا تھا اور احمد بیگ سے بات کرتے ہوئے میرے
لہجے میں اعتماد تھا:

"میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے میر منشی صاحب!
وہ مجھے مبارک اور دعائیں دینے لگا۔

"میں ہیڈ مالی کی بیٹی گلابو سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔
آپ اس کے والد کرم دین سے بات کریں۔"

میر منشی احمد بیگ کی آنکھیں جیسے پھٹنے لگیں۔ میں
جانتا تھا وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مجھے میرا خاندانی مرتبہ
اور گلابو کی پستی کا احساس دلانا چاہتا ہے لیکن میں نے اسے
کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔

"میں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کر چکا ہوں۔ آپ آج
ہی کرم دین سے بات کر کے مجھے شام تک اطلاع دیں۔
اب آپ جا سکتے ہیں، منشی صاحب!"

وہ حیرت زدہ اٹھا اور مجھے حیرت میں گم نظروں سے
دیکھتا چلا گیا۔

میر منشی سہ پہر ڈھلنے کے بعد حاضر ہوا تو اس کے
چہرے پر عجیب طرح کے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔

"میں کرم دین کے گھر گیا تھا، سرکار! گلابو کی ماں اور باپ
پر یہ بات سنتے ہی جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ میں نے انہیں
جھنجھوڑا تو بھی وہ خاموش رہے۔ جب وہ کچھ سنبھلے تو کرم دین
پھولے نہ سما رہا تھا۔ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا لیکن گلابو
کی ماں کا ردعمل بہت مختلف تھا، سرکار۔ جب میں انہیں
چھوڑ کر نکلا تو وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ کرم دین اس رشتے
کے حق میں ہے اور اس کی بیوی اس کی شدید مخالفت کر
رہی ہے۔"

بات روک کر احمد بیگ میر منشی نے پھر ایسا تاثر دیا
جیسے وہ مجھے اس ارادے سے روکنا چاہتا ہو۔ میں نے
براہ راست سوال کیا:

"تو پھر بات کا نتیجہ کیا نکلا؟"

"سرکار! کرم دین تھوڑی دیر بعد مجھے فیصلے سے آگاہ
کرے گا۔"

ہیڈ مالی کرم دین کی بیوی مجھے شام کے بعد ملنے آئی۔
اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر خوف

صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس خوفزدہ چہرے پر اَن گنت اندیشے بھی مچل رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اُسے گلابو کی میرے شادی کرنے پر کیا اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ مَیں محض دل بہلانے کے لیے گلابو سے شادی کر رہا ہوں۔ جب اُس کی تازگی ختم ہو جائے گی تو مَیں اُسے بیکار چیز کی طرح نکال پھینکوں گا۔ مَیں نے اُسے سمجھانے اور اپنی محبت اور وفا کا یقین دلانے کی کوشش کی لیکن اُس نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:

"سرکار! آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ میری گلابو آپ کے قابل نہیں۔ کہاں ہم، کہاں آپ۔ اس کے علاوہ سچی بات یہ ہے کہ مَیں اُس کی بات اپنی بہن کے بیٹے سے کر چکی ہوں۔ ہم غریبوں کے پاس زبان کے سوا کیا ہوتا ہے؟ مَیں زبان سے پھر گئی تو برادری میں ہماری کیا عزت رہ جائے گی؟ سرکار کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور دولت مند رشتہ موجود ہے۔ میری بیٹی کو ایک بار داغ لگ گیا تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔"

وہ چلی گئی۔ مَیں دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ میں نے اپنے آپ کو بے حد متحمل، بُردبار اور صابر پایا۔ مجھے گلابو کی ماں کی مجبوریاں سمجھ میں آ گئی تھیں۔ مَیں چاہتا تو اُن سے انتقام لے سکتا تھا۔ کرم دین اور اُس کی بیوی کا نام و نشان مٹا سکتا تھا لیکن مَیں نے ایسا کرنے کے بجائے صبر کر لیا۔ اپنے پہلے اور آخری پیار کے اس انجام کو قبول کر لیا۔

❦

مجھے چُپ سی لگ گئی۔ گلابو پر شاید اُس کی ماں نے پابندی لگا دی تھی۔ اب وہ باغ اور حویلی کی راہداریوں میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی۔ کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو خود ہی نظریں اُوپر اُٹھا کر نہ دیکھتا اور دل میں کہتا اب وہ کسی دوسرے کی امانت ہے .....!

ایک عجیب طرح کی اُداسی اور مایوسی تھی جو میرے پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ جاگیر کے لوگ اور خاص طور
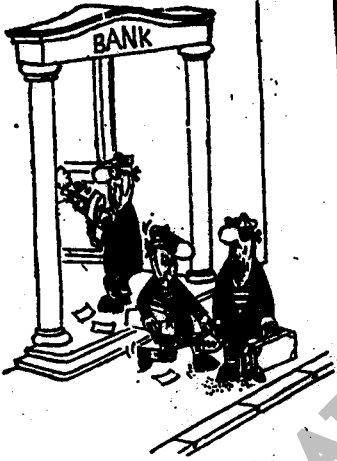
"کوئی خبیث کا بچہ ہماری کار چُرا کر لے گیا ہے"

پر وہ کارندے جن سے میرا روزانہ واسطہ پڑتا تھا، وہ تو مَیں محسوس کرتا کہ وہ میرے بارے میں پریشان ہیں۔ اور پھر شاید لوگوں میں کسی طرح یہ بات بھی پھیل گئی تھی کہ مَیں نے گلابو سے شادی کرنی چاہی تھی اور گلابو کی ماں نے انکار کر دیا تھا۔ لوگ اس پر زیادہ حیرت زدہ نہیں تھے کہ مَیں نے جاگیردار ہوتے ہوئے ایک کمی کمین کی بیٹی سے شادی کرنے کا ارادہ کیوں کیا۔ زیادہ حیرت انھیں اس بات پر تھی کہ انکار کے باوجود مَیں خاموش تھا۔ میری خاموشی اُن کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ صدیوں سے یہ روایت چلی آ رہی ہے۔ جاگیردار کو کوئی انکار نہیں کر سکتا اور اگر انکار کی جرأت کرے تو جاگیردار اُسے ایسی عبرتناک سزا دیتا ہے کہ کئی نسلیں اُسے یاد رکھتی ہیں۔

کسی کو معلوم نہ تھا کہ مَیں اکیس برس کا ہو چکا ہوں اور چاند میرا دشمن بن چکا ہے۔ مجھے اس اکیسویں سالگرہ کا دن اچھی طرح یاد ہے۔ اُس روز میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ مَیں اتنا اُداس کیوں ہُوں۔ قمری مہینے کے اعتبار سے اس روز چاند کی نویں تاریخ تھی۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہُوا محسوس ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں بوجھل اور سُرخ ہو رہی تھیں۔

عجب طرح کی خواہش دل میں خود بخود پیدا ہو رہی تھی کہ مَیں چیزوں کو توڑ ڈالوں۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ میرے لیے اس پر قابو پانا بے حد مشکل ہو گیا۔

چاند کی دسویں اور گیارہویں رات یہ خواہش مزید شدت اختیار کر گئی۔ مَیں نے کئی برتن توڑ ڈالے۔ کئی کتابیں پھاڑ دیں۔ بارہویں اور تیرہویں کو یُوں محسوس ہُوا جیسے میرے جسم کے اندر کوئی طاقتور درندہ چھپا ہُوا ہو اور باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مَیں نے کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے۔ جانے کیا کیا مجھ سے ہُوا، پھر مَیں ہانپتا ہُوا فرش پر گر گیا....

چاند کی چودھویں تھی۔ جونہی شام ہُوئی اور آسمان پر پُورا چاند نکلا، مَیں پاگل ہو گیا... جو کچھ میرے اندر اور باہر ہو رہا تھا، اُس نے مجھے پاگل کر دیا۔ سات آٹھ بجے رات مَیں نے اچانک محسوس کیا کہ میرے جسم پر بڑے بڑے بال اُگنے لگے ہیں۔ مَیں اپنے ہاتھوں سے اپنا جسم ٹٹولنے لگا۔ واقعی میرے سارے جسم پر بڑے بڑے سخت نوکیلے بال اُگ چکے تھے۔ میرے بازو بالوں سے بھرے ہُوئے تھے۔ میرے ڈاڑھی مونچھ سے بے نیاز چہرے پر بالوں کا جھنکاڑ اُگ آیا تھا... مَیں کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے۔ مَیں اسے ایک بھیانک اور لرزہ خیز خواب سمجھ رہا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں کی ساخت تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ اندر کی طرف چلے گئے ہیں اور اُنگلیاں پنجوں کی طرح مُڑ گئی ہیں اور ان کے سروں پر تیز نوکیلے اور لمبے ناخن نکل آئے ہیں۔ میرے ہاتھ کسی درندے کے پنجوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔

یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ یہ لرزا دینے والا خواب کب ٹُوٹے گا...

مَیں نے خواب کی دُنیا سے نکلنے کی کوشش کی لیکن اگر یہ خواب ہوتا تو پھر ٹوٹ بھی جاتا۔ یہ خواب تھا ہی نہیں۔ یہ تو حقیقت تھی اور حقیقت بدلی نہیں جا سکتی۔

مَیں ہاتھوں اور پیروں کے بل چلتا ہُوا قدِ آدم آئینے کی طرف بڑھا اور پھر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

آئینے میں مَیں نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ حیران کُن... ناقابلِ بیان۔

آئینے میں ایک بھیڑیا کھڑا تھا... خونخوار بھیڑیا...

کیا یہ مَیں ہوں؟ مَیں ہوں... قمر خاں... اگر مَیں نہیں ہوں تو پھر یہ بھیڑیا کون ہے؟

آئینے میں دکھائی دینے والا بھیڑیا، مَیں تھا۔ ذہن انسان کا تھا لیکن اندازِ فکر درندوں کا بن گیا تھا...

اپنے آپ کو بھیڑیا بنتے دیکھ کر مجھے اتنا صدمہ ہُوا کہ مَیں غش کھا کر گر پڑا.....

جب مجھے ہوش آیا تو مَیں ــــ مَیں تھا۔ سُورج کی کرنیں کمرے کے اندر چھن کر آ رہی تھیں۔ قدِ آدم آئینے میں مجھے اپنا ہی عکس دکھائی دیا۔ اپنا یعنی قمر خاں کا۔ لیکن میری رنگت بہت پیلی ہو چکی تھی۔ مَیں اپنے آپ کو بہت کمزور اور نقاہت زدہ محسوس کر رہا تھا۔ مَیں نے حرکت کی تو جوڑ جوڑ دُکھنے لگا۔ اپنے جسم کو دیکھا۔ وہی جسم جو پچھلی رات خاردار لمبے درُشت بالوں سے اٹا ہُوا تھا۔ اب اُس پر کوئی بال دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چہرہ بھی ٹھیک تھا۔

ایک بار پھر میرا ذہن چکرا کر رہ گیا۔

کل رات جو کچھ مَیں نے آئینے میں دیکھا، وہ کیا تھا؟ کیا وہ ایک واہمہ تھا؟ اگر واہمہ تھا تو مَیں اس واہمے میں کیسے مبتلا ہو گیا تھا اور حقیقت کیا تھی۔ میرا ذہن میرے

حواس یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ رات اپنے آپ
کو آئینے میں مَیں نے جس خوفناک بھیڑیے کی صُورت میں
دیکھا تھا، وہ ایک خواب تھا۔ نہیں وہ خواب نہیں تھا۔۔
ہاں وہ خواب تھا۔۔۔۔

❋

میرے کئی شب و روز اسی کشمکش میں گزر گئے۔ مَیں
کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ میرے اعصاب جواب دینے لگے۔
کسی نہ کسی طرح آہستہ آہستہ مَیں اپنے آپ کو یہ کمزور سا یقین
دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ مَیں نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ ایک
خواب تھا۔۔۔ ہولناک خواب لیکن مَیں یہ محسوس کرنے
لگا تھا کہ اس خواب کے بعد میرے اپنے وجود اور ذہن میں
تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ میرے اندر کی نرمی اور شائستگی
میں دراڑ پیدا ہو چکی تھی۔ اب مَیں لوگوں سے سخت کلامی
کرنے لگا تھا۔ بعد میں مجھے خود حیرت ہوتی کہ مَیں ایسا تو
نہیں تھا۔

ایک دن مَیں اپنی اس اندرونی تبدیلی پر بے حد
شرمندہ اور نادم ہُوا۔ گلابو حویلی کی ایک راہداری سے گزر
رہی تھی۔ میرا اُس کا آمنا سامنا ہُوا، اُس کی نگاہیں جھکی ہُوئی
تھیں لیکن مَیں نے اپنی نظروں کو بدلتے پایا۔ مَیں جو اُسے
دُور سے آتے دیکھ کر اپنی آنکھیں جھکا لیتا تھا، اب مَیں
نے اپنی اُنہی آنکھوں کو اُسے گھورتا پایا۔ وہ میرے اس
انداز پر کچھ سہم سی گئی۔ تیزی سے آگے نکلنا چاہتی تھی کہ
مَیں نے جست لگا کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔

اُس نے بڑی بے بسی اور حیرت سے میری طرف دیکھا
اُس لمحے وہ اور زیادہ حسین دکھائی دینے لگی۔

مَیں نے زور سے اُس کے بازو کو جھٹکا دے کر چھوڑتے
ہُوئے کہا

"مجھ سے تم بچ نہیں سکتیں۔"

وہ آنسو بہاتی بھاگ کھڑی ہُوئی جیسے کوئی ایسی ہرنی
ہو جو شکاری کی زد سے جان بچانے کے لیے بھاگ رہی ہو۔

چند ہی منٹ کے بعد مَیں نے پچھتانا شروع کر دیا۔
مجھے اپنے آپ پر یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ مَیں نے ہی ایسی حرکت
کی تھی۔ مَیں حیران تھا کہ مجھ میں اتنی جرأت اور بے باکی کہاں
سے آ گئی۔

مَیں یہ مَیں نہیں تھا۔ مَیں ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔
لیکن نہیں۔ یہ مَیں ہی تھا۔ مَیں نے ہی ایسا کیا تھا۔
یہ خواب نہیں تھا۔

مَیں بہت پچھتایا۔ بہت سے وسوسوں نے میرے
دل میں ڈیرا ڈال دیا۔ مَیں سوچنے لگا کہ گلابو جا کر میری اس
گھٹیا حرکت کے بارے میں اپنی اماں سے کہے گی۔ اُس کے
باپ کو معلوم ہو گا۔ وہ میرے متعلق کیا سوچیں گے؟ اوہ میرے
خدا۔۔۔ لیکن جب شام تک کوئی میرے پاس شکایت لے
کر نہیں آیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ میری گھٹیا حرکت کا ذکر گلابو
نے اپنے والدین سے نہیں کیا۔۔۔ مَیں دل ہی دل میں
اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے لگا۔ مَیں نے اپنے آپ سے
عہد کیا کہ مَیں آئندہ ایسی گری ہُوئی حرکت کبھی نہیں کروں گا۔

مَیں کئی روز حویلی میں اپنے کمرے ہی میں پڑا رہا۔
باہر ہی نہ نکلا۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ دن
گزرتے چلے گئے۔ مَیں نارمل ہو گیا۔ نقاہت بھی کم محسوس
ہونے لگی۔ چہرے کی زردی بھی سُرخی میں تبدیل ہو رہی تھی
لیکن۔۔۔ یہ سب کچھ عارضی تھا۔

چاند کی دسویں گیارہویں کو پھر میرے وجود میں زلزلہ
آنا شروع ہو گیا۔ مَیں چونکہ پچھلے ماہ اس لرزہ خیز تجربے سے
گزر چکا تھا، اس لیے مَیں نے اس کے خلاف بند باندھنے
کی کوشش کی۔ اپنے حواس قائم رکھتے ہُوئے اپنے اندر پیدا
ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اور جب
چاند کی چودھویں آئی تو میری تمام کوششیں ناکام ہُوئیں اور
مَیں ایک بار پھر۔۔۔ اپنے آپ کو خونخوار بھیڑیے کی صُورت
میں دیکھ رہا تھا۔۔۔ اور مَیں بھیڑیے کی طرح غرّا رہا تھا۔ مَیں
پکا پکا بھیڑیا بن گیا تھا۔ مَیں چیر پھاڑ کرنا چاہتا تھا۔ مَیں

نے اپنے بستر کے تکیوں کو دانتوں میں لے کر پھاڑ دیا کپڑے نوچ ڈالے۔ جو چیز سامنے آئی اُسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ صبح ہُوئی تو مَیں پھر سے اپنے آپ کو قمر خاں کے وجود میں پا رہا تھا لیکن کسی بچے کی طرح کمزور بھی ہو چکا تھا۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ رہا کہ مَیں چاند کی چودھویں تاریخ کو بھیڑیا بن جاتا ہُوں۔ اس تاریخ کا اس ہولناک واقعے سے گہرا تعلق تھا۔ مَیں نے شہر کا رُخ کیا۔ . . .

ایک المناک اور بے ثمر جدوجہد کا آغاز ہُوا مختلف معالج، حکیم، سیانے اور تعویذ گنڈہ کرنے والے... مَیں انھی کا ہو کر رہ گیا لیکن جُونہی چاند کی چودھویں تاریخ آتی مَیں بھیڑیا بن جاتا۔ کسی ڈاکٹر، کسی ماہر معالج، کسی حکیم، کسی گنڈہ تعویذ کرنے والے کا کوئی علاج کوئی نُسخہ کوئی تعویذ مجھ پر کارگر ثابت نہ ہُوا۔

مَیں چند دنوں کے لیے اپنی جاگیر پر جاتا اور پھر نکل کھڑا ہوتا۔ مَیں نے اپنے علاج کے لیے ہر شہر کھنگال ڈالا۔ جہاں کسی کی شہرت سُنی وہاں پہنچ گیا۔ پیسے کو پانی کی طرح بہا دیا لیکن کچھ افاقہ نہ ہُوا۔ کوئی دُعا اور دوا میرے دُکھ کا درماں نہ بن سکی۔

تب مجھے اپنے والد مرحوم کی بات یاد آئی جو اُنھوں نے موت سے چند روز پہلے مجھ سے کہی تھی کہ ہمارے خاندان کی ہر تیسری پُشت کا ایک فرد خاص مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میرے والد سب کچھ جانتے تھے۔ ہر حقیقت سے آگاہ تھے لیکن اُنھوں نے جان بُوجھ کر بات گول مول کی تھی، ورنہ وہ جانتے تھے کہ ہمارے خاندان کی ہر تیسری پُشت کا ایک فرد ـــــ چاند کی چودھویں تاریخ کو انسان سے بھیڑیا بن جاتا ہے۔

دو برسوں میں میرے اندر انسان اور درندے کی کشمکش جاری رہی۔ انسان اس درندے کو مغلوب نہ کر سکا، اور درندہ انسان کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔ مَیں چاند کی چودھویں تاریخ کو ایسے کمرے اور ایسے گھر میں رہتا جس کے دروازے مضبوط ہوتے اور اُنھیں توڑنا مشکل ہوتا۔ جہاں سے آوازیں باہر نہ جا سکتیں۔ مَیں چاند کی چودھویں آتے ہی اپنے آپ کو کمرے کے اندر بند کر لیتا اور اپنے اندر کے انسان کو زندہ رکھنا چاہتا تھا جبکہ چودھویں تاریخ کو میرے اندر چُھپا ہُوا درندہ بھیڑیا باہر آنے کے لیے جان توڑ کوشش کرتا۔

دو برس مَیں اپنے اندر کے بھیڑیے کے ساتھ لڑا لیکن اُسے ختم نہ کر سکا۔

❁

جاگیر کے انتظامات میں میری مسلسل عدم موجودگی کی وجہ سے گڑبڑ ہونے لگی۔ مجھے میر منشی کے اصرار پر بہر حال اپنے گاؤں اپنی جاگیر اور اپنی حویلی کا رُخ کرنا پڑا۔ مَیں تہیہ کر چکا تھا کہ سارے کام نمٹا کر چاند کی چودھویں سے پہلے گاؤں سے نکل جاؤں گا لیکن کام ختم ہونے کا نام نہ لے رہے تھے اور چاند کی چودھویں آ گئی۔

میرے جسم پر بال اُگ آئے اور میرے ہاتھ پاؤں پنجوں میں تبدیل ہو گئے۔ مَیں جسیم اور طاقتور بھیڑیا بن گیا۔ میرے دُشمن چاند نے مجھے زیر کر لیا تھا۔ میرے اندر اندھی اور بے پناہ قوت مجھے اُکسانے لگی۔ مَیں نے دروازہ توڑ دیا اور باہر نکل آیا۔

نصف شب ہو چکی تھی۔ چاروں طرف چاند کی روشنی پھیلی ہُوئی تھی۔ مَیں جوان تھا لیکن اُس وقت درندہ تھا، ایک بھیڑیا تھا۔ میرے اندر شر اور بدی نے اپنا غلبہ کر لیا تھا۔

مَیں چلتا ہُوا گلابو کے کوارٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے دو تین بار دروازے پر پنجے مارے اور پھر مَیں دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ چند منٹوں کے بعد دروازہ کھُلا۔ مَیں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ گلابو تھی جو گہری نیند سے اُٹھ کر دروازہ کھول کر باہر جھانک رہی تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں بہادر ہوتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خطروں سے نہیں گھبراتیں۔ مَیں نے اپنے

نیچے زمین پر زور سے مارے اور ہلکے سے غرّایا... بھیڑیے کی معروف چالاکی اور عیاری میرے وجود کا حصہ بن گئی تھی۔

گلابو جُونہی دروازے سے چند قدم آگے بڑھ کر باہر دیکھنے کے لیے آگے بڑھی، مَیں ایک جست لگا کر دروازے کے سامنے اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

اُس نے مجھے مُڑ کر دیکھا۔

اب وہ دروازے کے راستے سے اندر نہیں جا سکتی تھی۔ اُس کی چیخ نکلی اور وہ سامنے باغ کی طرف بھاگنے لگی۔ مَیں اُس کے پیچھے لپکا۔ مَیں قمر خاں نہیں تھا ایک بھیڑیا تھا۔ وہ پُوری قوت سے بھاگ رہی تھی لیکن وہ مجھ سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتی تھی۔ خوف نے اُس کی آواز تک کو سلب کر لیا تھا۔ اب وہ چیخ بھی نہیں رہی تھی۔ ایک چیخ جو کب سے سناٹے میں تحلیل ہو چکی تھی، اس کے بعد اُس کے حلق سے دوسری چیخ نہیں نکلی۔

پھر مَیں نے اُسے جا لیا... موتیے کی اُنہی کیاریوں کے پاس جہاں وہ ایک دن کلیاں چُن رہی تھیں تو قمر خاں نے اُسے دیکھا اور اُس سے محبت کرنے لگا تھا، وہیں دوسرے قمر خاں نے جو چاند کی چودھویں رات کو بھیڑیا بن جاتا تھا اُسے جھپٹ لیا۔ اُس کے نرخرے پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ اُس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ مَیں بھیڑیا تھا اور وہ ایک نرم و نازک انسانی وجود۔ مَیں نے اُس کا خون پیا۔ اُس کے جسم کو اپنے تیز نوکیلے دانتوں اور پنجوں سے اُدھیڑ کر رکھ دیا۔

مجھے بڑی تسکین حاصل ہُوئی۔ میرے اندر چُھپا ہُوا قمر خاں اُس لمحے مر چکا تھا۔ مَیں ایک بھیڑیا تھا جو ایک انسانی جسم کو نوچ کھسوٹ کر لذت حاصل کر رہا تھا...

صُبح کی پہلی کرنیں نمودار ہو رہی تھیں جب مَیں اپنے کمرے میں بیٹھا ہانپ رہا تھا اور قمر خاں بن چکا تھا.....

تب مَیں نے رونے پیٹنے کی آوازیں سُنیں۔ لوگ بھاگ بھاگ کر باغ میں آ رہے تھے۔

میرے مُنشی نے مجھے اطلاع دی۔ اب مَیں قمر خاں تھا

لیکن بہت کمزور تھا۔

کچلی کچلی لاش دیکھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

وہ جو خود موتیے کی کلی تھی، اس وقت کچلی کچلی پڑی تھی۔ پتی پتی بکھر چکی تھی۔

وہ جو حسین اور متناسب ترین پُرکشش انسانی اعضا کا مجموعہ تھی اب اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے اور اُس کا سارا حُسن مسخ ہو کر بھیانک ہو چکا تھا۔۔۔

دیہاتی باتیں کر رہے تھے۔ کئی ایسے تھے جو باغ میں پنجوں کے نشان دیکھ کر سُراغ لگا چکے تھے۔

"بھیڑیے کا کام ہے۔۔۔ یہ اُس کے پنجوں کے نشان ہیں۔"

جسم پر بھی دانتوں کے نشان تھے۔

بھیڑیا تھا۔۔۔ بھیڑیا تھا۔۔۔ آدم خور بھیڑیا۔۔۔

پُورے علاقے میں دُور دُور تک یہ ہولناک خبر پھیل گئی کہ گلابو کو بھیڑیا کھا گیا۔ سُراغ، نشان اور واقعات نے کسی شک اور شبے کی گنجائش نہ چھوڑی تھی۔ گلابو کو بھیڑیے نے مار ڈالا تھا۔

اور میں، جو وہ بھیڑیا تھا، اُس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ گیا۔ جا ہی نہیں سکتا تھا۔

لیکن میں جو اب قمر خاں تھا، جانتا تھا کہ گلابو کا قاتل کون ہے۔ میں اُس کا قاتل ہُوں یا چاند جو میرا دشمن بن چکا ہے اور جس نے مجھے قاتل بنا دیا تھا۔

❖

شام سے پہلے پہلے گلابو دفن کر دی گئی۔

میں اُس کے جنازے میں شریک نہیں ہُوا۔ میں اُس کی موت کے دُکھ میں نہیں رویا۔ میں تو کئی دن اُس قمر خاں کا ماتم کرتا رہا جو چاند کی ہر چودھویں تاریخ کو بھیڑیا بن جاتا ہے اور جس نے اپنی پہلی اور آخری محبت کو خود ہی مار ڈالا تھا۔۔۔

اَن گنت سوالوں نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ ایسے ایسے سوال جن کے جواب کسی کے پاس نہیں۔ ایسے ایسے سوال جو ذہن میں پیدا ہوتے ہیں تو سارا وجود لرز جاتا ہے۔ ایسے ایسے سوال جو پُراسرار حقیقتوں کی نقاب کُشائی نہیں کر پاتے۔۔۔۔

میں ایک نہیں تھا۔ میرا وجود تقسیم ہو چکا تھا۔ انسان ـــ بھیڑیا ـــ شائستگی ـــ نیک خوئی اور درندگی۔

میں لاعلاج تھا۔۔۔

میرے اندر اتنی صلاحیّت اور سکت باقی نہیں رہی تھی کہ میں اپنے اندر کے انسان کو بھیڑیے پر غالب لا سکوں۔

میں نے اپنی شکست اور ناکامی تسلیم کر لی۔

اور پھر میں جانتا تھا کہ اب جب چاند کی چودھویں رات آئے گی تو میں پھر شکار کے لیے نکلوں گا۔ اب میرے اندر کا انسان اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ میں بھیڑیے کو باہر جانے سے روک نہیں سکتا اور وہ ہر دروازہ توڑ دے گا۔

جب انسان بھیڑیا بن کر اپنی پہلی اور آخری سچی محبت کو خود ہی قتل کر ڈالے تو دوسرے انسانی وجود اُس کے لیے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟

انسان ہونے کے ناطے سے، اپنے انسان ہونے کے وجود کا اظہار کرنے کے لیے میں نے وہ زہر حاصل کر لیا ہے جو چند منٹوں میں اِنسان کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

میں بھیڑیا بن کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔۔۔۔

❖

میں اپنی رُوداد قلم بند کر چکا ہُوں اور پُوری طرح مطمئن ہُوں، اس لیے میں بہت پُرسکون ہُوں کہ میں انسان کی حیثیت سے مر رہا ہُوں اور انسان کی برتری، فطرت اور اس کے مظہر چاند پر ظاہر کر دی ہے۔

میں دل کی دھڑکن بند کر دینے والا زہر پی چُکا ہُوں۔ میں مرنے والا ہُوں۔۔۔ میں بھیڑیا نہیں۔۔۔ انسان ہُوں میں۔۔۔ مر رہا۔۔۔۔۔۔۔

خونی بلی

ایڈگر ایلن پو

خوفناک کہانیوں کے شائقین کے لئے ایڈگر ایلن پو کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ..... ایک دہشت ناک کہانی۔

یہ کہانی کئی برسوں سے میرے ذہن میں موجود تھی مگر نامکمل تھی۔ اس کے متعلق ایک سوالیہ نشان میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اب اس سوال کا جواب بھی مل گیا ہے اور یہ عبرت ناک داستان مکمل ہو گئی ہے۔ اب میں یہ کہانی آپ کو سنا سکتا ہوں۔

میں پاکستان کے چند بڑے شہروں میں سے ایک کا رہنے والا ہوں۔ میری خالہ جو لاہور میں رہتی ہیں' ان کی بیٹی کی شادی تھی۔ سب گھر والے چند دن پہلے ہی وہاں چلے گئے تھے۔ ان دنوں میرے امتحانات ہونے والے تھے اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ عین شادی والے دن شامل ہوں گا تاکہ پڑھائی کا حرج نہ ہو۔

میں جب ریلوے سٹیشن پہنچا تو ایک طرف سے شور اٹھا ----- "پاگل ای اوئے' پاگل ای اوئے" ----- میں نے ادھر دیکھا۔ غلاظت میں لتھڑا ہوا ایک پاگل نظر آیا جو گندگی کھا رہا تھا۔ لوگوں کو ابکائیاں آ رہی تھیں اور وہ اسے بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاگل نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو میرے ذہن میں دھماکہ ہوا اور میں چونک اٹھا۔ کسی پاگل کو دیکھ کر چونکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارے ملک میں یہ مخلوق کھلے بندوں پھرتی ہے۔ بعض پاگل تو بالکل ننگے شہر کی معروف سڑکوں پر کھلے بندوں پھرتے نظر آتے ہیں اور عورتوں کے لئے بالخصوص پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں اخبار میں پڑھا تھا کہ لاہور کے معروف ترین بازار انارکلی میں نیم برہنہ پاگل خواتین کو پریشان کرتے ہیں۔ یہ پاگل خواتین کے کپڑوں کو آگ لگا دیتے ہیں

اور ان پر گندگی پھینکتے ہیں۔ ایسے بازاروں میں غیر ملکی لوگ بھی خریداری کرتے ہیں۔ آپ خود سوچ لیں کہ ان کی ہمارے ملک کے بارے میں کیا رائے ہو گی مگر ہماری حکومت ایسی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتی کیونکہ اقتدار کے جھگڑوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔

میں کہہ رہا تھا کہ اس پاگل کا چہرہ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اس کی بائیں آنکھ کے اوپر ابرو نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے زخم کی وجہ سے گوشت اڑ گیا ہو۔ اب ابرو والی جگہ خاصی بھدی نظر آتی تھی۔ یہی دیکھ کر میں چونکا تھا۔ میرے ذہن میں چار سال پہلے کے واقعات فلم کی طرح چلنے لگے۔ میری آنکھوں کے آگے مرتی ہوئی ایک جوان لڑکی کا کربناک چہرہ آگیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک ہولناک رات یاد آگئی۔ ہولناک بھی ایسی کہ اس کی یاد سے بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے وہ حقیقت نہیں بلکہ ڈراؤنا خواب تھا۔

ان دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا۔ ایک کام سے اسلام آباد جانا پڑا۔ واپسی میں دیر ہو گئی۔ میں رات ایک ڈیڑھ بجے اپنے شہر میں پہنچا۔ بہار کے دن تھے۔ پورے چاند کی چاندنی بڑی شفاف تھی۔ میرا گھر تقریباً" دو میل دور تھا۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ ویسے بھی رات کے اس وقت کسی سواری کا ملنا مشکل تھا۔ راستے میں ایک نہر آتی ہے۔ میں نے نہر کا بڑا پل کراس کیا اور نہر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ تھوڑا آگے جا کر شہر کا بڑا قبرستان آتا ہے۔ میں نے سوچا قبرستان کے اندر سے نکلوں گا تو جلدی گھر پہنچ جاؤں گا۔ اس طرح فاصلہ تقریباً" آدھا رہ جاتا تھا۔

عام طور پر لوگ دن میں بھی اس قبرستان سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ یہاں میں اپنے متعلق آپ کو بتا دوں۔ میں نے چھوٹی سی عمر میں ہی بہت دکھ دیکھے ہیں۔ زندگی نے بڑے تلخ تجربات سے روشناس کرایا ہے۔ میں ابھی پندرہ سال کا تھا کہ میرے والد صاحب کو خاندانی دشمنی کی وجہ سے قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کا سر میری گود میں تھا۔ ان کو کسی چیز میں زہر دیا گیا تھا۔ مرتے وقت انہوں نے کہا تھا کہ میرے بعد اپنی ماں کا اور چھوٹے بھائی کا خیال رکھنا اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنا۔ انہوں نے کلمہ پڑھا اور میری گود میں دم توڑ دیا۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ اس کمی کو میں بہت محسوس کرتا ہوں۔ والد صاحب کی قبر اسی قبرستان میں ہے۔ میں اکثر راتوں کو وہاں جا کر باپ کی قبر پر بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے کبھی کسی چیز سے ڈر نہ لگا تھا۔ میرے اندر پختہ مردوں والی عادتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ یوں کہہ لیں کہ میں پندرہ سال کی عمر میں ہی پختہ کار مرد بن گیا تھا۔ میرے دوست مجھے سنکی کہتے تھے۔

میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر والد صاحب کی قبر پر بیٹھوں گا اور فاتحہ پڑھ کر گھر چلا جاؤں گا۔ میں قبرستان میں داخل ہو گیا اور قبروں کے درمیان چلنے لگا۔ یہ قبرستان کا صدیوں پرانا حصہ ہے جس کی بہت سی قبریں بیٹھ گئی یا گڑھے بن گئی ہیں۔ یہی وہ حصہ ہے جس میں سے لوگ دن کو بھی گزرتے ڈرتے ہیں۔ چاندنی رات میں قبرستان کا سناٹا، گھنے درخت اور جا بجا جھاڑیاں ڈراؤنا منظر پیش کر رہی تھیں۔ فضا پر پرہول سا سکوت طاری تھا جیسے کسی بے چین الو

کی آواز بار بار توڑ رہی تھی۔ اچانک مجھے اپنے پیروں کے پاس سرسراہٹ سنائی دی۔ دیکھا تو ایک سانپ رینگتا ہوا جھاڑیوں میں جا رہا تھا۔ اس قبرستان میں سانپ عام ہیں۔ ان کے علاوہ سیہہ، بجو اور نیولے وغیرہ بھی نظر آ جاتے ہیں۔ جو دن بھر اپنے بلوں میں چھپے رہتے اور رات کو خوراک کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

ابھی تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک چیخ بلند ہوئی اور قبرستان کا سناٹا توڑ گئی۔ فضا میں پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ الو اور چمگادڑ تھے جو گھبرا کر اڑے تھے۔ میں سر تا پا لرز گیا اور جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ میرے دماغ میں بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانیاں گردش کرنے لگیں۔ میں نے سوچا شاید کوئی چڑیل ہے۔ مجھے چیخ سے اندازہ نہ ہوا کہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ میں نے آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی اور آگے بڑھا۔ چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ چیخ دوبارہ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی کسی عورت کی آواز سنائی دی 'چھوڑ دو' 'چھوڑ دو۔'

اب مجھے سمت کا اندازہ بھی ہو گیا اور یہ یقین بھی کہ کسی عورت کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اور یہ چڑیل وغیرہ نہیں ہے۔ میں آواز کی سمت دوڑا۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے ایک مرد اور ایک عورت کے سائے نظر آئے جو آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ میں نے بڑی زور سے آواز دی ---- "کون ہے اوئے! ٹھہر جاؤ" ---- اور ان کی طرف دوڑا۔ اچانک عورت کی بڑی ہی کربناک چیخ ابھری اور وہ گرنے لگی۔ مرد اسے چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ میں نے بلا سوچے سمجھے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ فاصلہ بہت

مسٹر ولسن کے دو بچے تھے جن کی عمریں چھ اور آٹھ سال تھیں۔ دونوں کو اپنا کتا پیڈی بہت عزیز تھا۔ ایک روز جب وہ اسکول گئے ہوئے تھے تو پیڈی کار کے نیچے آ کر مر گیا۔ ماں جانتی تھی کہ اس جانکاہ خبر سے بچوں پر بجلی گر پڑے گی۔ چنانچہ جب وہ واپس آئے تو اس نے انہیں بڑی لمبی تمہید کے بعد بتایا کہ پیڈی مر چکا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ بچے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی، لیکن چند ہی منٹ بعد بچے روتے ہوئے کچن میں داخل ہوئے۔ "ممی ... پیڈی ... پیڈی مر گیا۔"

"ہاں میرے بچو! میں نے تمہیں اسکول سے آتے ہی بتا دیا تھا نا ... اس وقت تو تم نہیں روئے تھے۔"

"ہاں۔" بڑے بچے نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں یہ سمجھا تھا کہ ڈیڈی مر گئے۔"

سرہانے

مصحفی اور انشا کی چشمکوں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ مصحفی نے جب سنا کہ انشا کی حالت بری ہے اور کوئی دم کے مہمان ہیں تو ان کے مکان پر عیادت کے لیے گئے۔ دیکھا کہ عالم نزع میں دم توڑ رہے ہیں۔

سانس اکھڑی ہے سرد سینہ ہے
ماتھے پر موت کا پسینہ ہے

مصحفی نے نبض پر ہاتھ رکھا تو کمال حسرت کے ساتھ ان کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکل گیا

تیرے بیمار کو ہے عزم سوئے [illegible] کی رات

انشا نے آنکھیں کھولیں اور بے اختیار کہہ اٹھے۔

نبض چلی بسنے کی دلی سے [illegible] کی رات

زیادہ تھا۔ میں نے اسے للکارا مگر وہ بھاگتا چلا گیا او
قبرستان کے گھنے حصے میں غائب ہو گیا۔

میں واپس اس جگہ کی طرف دوڑا جہاں و
عورت گری تھی۔ اس سارے واقعے میں بمشکل
منٹ لگے ہوں گے۔ میں نے اس جگہ پہنچ کر عورت
کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ایک طرف کی جھاڑیو
میں سے اس کے کراہنے کی آواز آئی اور خاموشی چھ
گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر جھاڑیوں کے پیچھے دیکھ
جو منظر نظر آیا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے میں ے
آنکھیں بند کر لیں۔ ایک جوان عمر لڑکی جو اوپر سے
بالکل برہنہ تھی' اس حالت میں پڑی تھی کہ سینے سے
لے کر ناف تک اس کا پیٹ کٹا ہوا تھا اور انتڑیا
باہر آ رہی تھیں۔ خون بہہ رہا تھا۔ مجھ پر تو جیسے سکتہ
طاری ہو گیا ہو۔

"پانی" ---- وہ سسکی اور میرا سکتہ ٹو
گیا۔

میں دوڑتا ہوا قبرستان کے شمالی حصے کی طر
گیا۔ وہاں ایک گورکن کا جھونپڑا تھا۔ اس وقت
گورکن بھنگ کے نشے میں دھت دنیا و مافیہا سے
خبر پڑا تھا۔ میں نے ایک برتن میں پانی لیا' ایک پر
پرانی چادر اٹھا لی اور لڑکی کے پاس پہنچا' اس کے
سے پانی لگایا پھر اس کی انتڑیاں پیٹ کے اندر ڈا
اور چادر سے اس کا پیٹ باندھ دیا۔ اس نے
ت دیکھ لی تھی اور وہ جان گئی تھی کہ وہ زندہ نہ
رہ سکے گی۔

"وہ بدبخت کہاں گیا؟" ---- اس ے
سے پوچھا۔

"کون تھا وہ؟" ---- میں نے پوچھا ---

نے تمہیں کیوں مارا ہے؟"

اس نے اپنی ساری کہانی مجھے سنائی۔ اس
کئی بار وہ غنودگی میں گئی۔ میں اسے ہلاتا اور
ایک دو گھونٹ پلاتا۔ پھر وہ آگے بولتی۔ اس
اپنا نام پروین بتایا۔ بعد میں میں نے پروین کے
میں جا کر معلومات حاصل کیں۔ ان کے مطابق
یہ کہانی اسی کے الفاظ میں سناتا ہوں۔

میرے ماں باپ بہت غریب تھے اور میں ان
واحد اولاد تھی۔ وہ دونوں بس کے ایک حادثے
فوت ہو گئے۔ رشتے دار پہلے ہی غریبی میں ساتھ
رز گئے تھے۔ میرے ایک تایا نے مجھے سنبھال لیا۔
وقت میں اس عمر تک پہنچ گئی تھی جہاں والدین
ان کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔
ے ماں باپ تو تھے نہیں۔ یہ فرض بوڑھے تایا
ادا کیا۔ ایک شریف سے لڑکے سے جو ایک دفتر
کلرک تھا' میری شادی کر دی گئی۔

میرا شوہر کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ مکان
اوپر والے حصے میں مالک مکان خود رہتا تھا۔ وہ
رے شوہر والے دفتر میں ہی اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس کی
ر میرے شوہر کی دوستی بھی تھی۔ اس کے تین بچے
وہ چالیس بیالیس سال عمر کا شخص تھا۔ اس کا
وک ہمارے ساتھ بہت اچھا تھا۔ شام کو وہ اور میرا
ہر دفتر سے آتے تو ہم اکٹھے بیٹھتے اور باتیں کرتے
تے تھے۔ زندگی بڑی پرسکون گزر رہی تھی مگر
رت نے شاید میری قسمت میں سکھ کم اور دکھ
یادہ لکھے تھے۔

ایک دن میرے شوہر کو دفتر میں دل کا دورہ
اس کو ہسپتال لے کر گئے مگر ڈاکٹروں کی پوری

کوشش کے باوجود نہ بچ سکا۔ میرے لئے تو قیامت برپا ہو گئی۔ شوہر کے رشتہ داروں کو خط لکھے مگر دو تین کے سوا کوئی نہ آیا۔ مشکل کی اس گھڑی میں اپنے پرائے سب منہ موڑ گئے۔ کسی نے بھی نہ کہا کہ تمہارا رہ ہی کون گیا ہے' چلو میرے ساتھ۔ یہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے تایا زاد بھائیوں نے میرے ماں باپ کا مکان جعل سازی سے بیچ ڈالا ہے اور پوری رقم ہضم کر گئے ہیں۔ ہمارے مالک مکان نے آخری رسومات میں مدد کی اور پورا ساتھ دیا۔ اس نے کرایہ معاف کر دیا۔

شوہر کی وفات کے دو مہینے بعد میں نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اس خوبصورت کھلونے کے مل جانے سے میرا غم کچھ کم ہونے لگا اور میں اپنے بچے میں کھو گئی۔ بچے کی پیدائش کے بعد میری صحت بہت اچھی ہو گئی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ میں ایک بچے کی ماں ہوں۔ مالک مکان اور اس کی بیوی نے مجھے محرومی اور محتاجی کا احساس نہ ہونے دیا۔

کچھ دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ مالک مکان کی مہربانیاں مجھ پر کچھ زیادہ ہونے لگی ہیں۔ وہ بلا ضرورت میرے پاس زیادہ بیٹھنے لگا۔ اپنے بچوں سے زیادہ وہ میرے بچے کو پیار کرتا تھا۔ شوہر کے دفتر سے ملنے والی رقم سے اور پنشن سے میرا گذارہ بہت اچھا ہو رہا تھا مگر اس شخص کی عنایات بڑھتی جا رہی تھیں۔

ایک دن میرا بیٹا رو رہا تھا۔ بہلتا ہی نہیں تھا۔ مالک مکان نے اپنے بچوں کو کہا کہ یہ لو پیسے کچھ کھا لینا اور منے کو ساتھ لے جاؤ' یہ بھی بہل جائے گا۔

ان کے باہر جانے کے بعد وہ میرے پاس آ بیٹھا اور میرے شوہر کی باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ شوہر کے نہ ہونے سے پیدا ہونے والی محرومیوں کا ذکر کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مسلنے لگا جیسے وہ میرے ہاتھ سے کھیل رہا ہو۔ میں نے کچھ محسوس نہ کیا مگر اس کے بعد اس نے ایک دو ایسی حرکتیں کیں کہ میں چونک اٹھی۔ میں تو اسے بھائیوں کی طرح سمجھتی تھی مگر اس نے وہ حرکتیں اور باتیں شروع کر دی تھیں جو کوئی شوہر ہی اپنی بیوی سے کر سکتا ہے۔ اس نے میری عجیب کیفیت کر دی۔ ایک طرف اس نے مجھے میری محرومیوں کا احساس دلایا تو دوسری طرف اس نے مجھے غصہ دلایا۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ اسے کیا کہوں کہ بچے بازار سے واپس آ گئے اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

اس کا مطلب اس نے غلط لیا اور وہ اور زیادہ

شیر ہو گیا۔ اب وہ موقع بے موقع مجھ سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے صاف لفظوں میں اپنی بدنیتی کا اظہار کر دیا۔ میں اسے ٹالتی رہی مگر اس کی دست درازیاں بڑھتی گئیں۔ ایک رات میں سوئی ہوئی تھی۔ میرا بچہ پنگھوڑے میں سو رہا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے جسم پر کوئی ہاتھ پھیر رہا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھی تو مالک مکان کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا مت ڈرو، کسی کو پتہ نہیں چلے گا اور وہ مجھے اپنے بازوؤں میں لینے لگا۔

میں تڑپ کر بستر سے اٹھی اور اس کو زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو ہٹا۔ وہ نشے میں لگ رہا تھا۔ میں نے اسے خدا کے واسطے دیئے مگر اس پر شیطان سوار تھا۔ اس نے سوئے ہوئے بچے کو اٹھا لیا اور کہنے لگا کہ میری بات مان لو ورنہ اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ میں نے بچے کی جان کی پرواہ نہ کی اور شور مچانا شروع کر دیا۔ شور سن کر ہمسائے آ گئے اور دروازہ پیٹنے لگے۔ اس نے گھبرا کر بچے کو بستر پر پٹخا اور اوپر بھاگ گیا۔

صبح ہونے پر محلے داروں کو ساری صورت حال کا علم ہوا۔ انہوں نے اس شخص سے باز پرس کی مگر وہ مکر گیا اور کہنے لگا، یہ خواب میں ڈر گئی ہو گی۔ اس کی بیوی اس سے بہت ڈرتی تھی۔ اس نے مجھے تسلیاں دینی شروع کر دیں۔ میں نے اس عورت کو الگ بٹھا کر اس کی کرتوت بتائی تو وہ رو پڑی۔ اس نے کہا کہ اس کا خاوند اتنا ظالم ہے کہ بعض اوقات مجھے شک ہوتا ہے کہ اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ ایک بار یہ میرا گلا گھونٹنے لگا تھا۔ مجھے تو خدا نے بچا لیا تھا۔

ہمارے ساتھ والے مکان میں جو لوگ رہتے تھے وہ بڑے رحم دل اور بھلے لوگ تھے۔ اس شخص کی بیوی کہنے لگی کہ تم میرے ایک بزرگ ہیں، جو بہت ہی ضعیف ہیں، ان کے پاس چلی جاؤ۔ ان کا مکان شہر سے باہر والی طرف قبرستان کے نزدیک ہے۔ میں آج ہی تمہیں ان کے پاس چھوڑ آتی ہوں۔ اس طرح میں ان بابا جی کے پاس رہنے لگی۔ اس دوران میرا بچہ دس ماہ کا ہو چکا تھا۔ بابا جی کو میں بابا جی ہی کہتی تھی۔ وہ مجھ سے اور میرے بچے سے بہت پیار کرتے تھے۔ آج صبح صبح بابا جی کہنے لگے کہ میرے ایک عزیز گاؤں میں رہتے ہیں، وہ شدید بیمار ہیں۔ میں ان کی خبر لے آؤں، تم گھبرانا نہیں کل دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔

دن تو آرام سے گزر گیا مگر رات کو میں ڈر رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ڈرتے ہوئے ذرا سا دروازہ کھول کر پوچھا کون ہے۔ دروازے کو زور کا دھکا لگا اور میں پیچھے کو گری۔ دھکا دینے والا اندر آ گیا۔ اس نے چادر اس طرح لی ہوئی تھی کہ منہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے مڑ کر میری طرف دیکھا اور چادر اتار دی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا۔ وہ مالک مکان تھا۔ میں نے شور مچانے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے کہا، شور مچاؤ گی تو تمہارے بچے کو مار دوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے سوئے ہوئے معصوم منے کو پکڑ لیا۔ وہ بیچارہ رونے لگا۔ اس ظالم نے کہا تو کیا سمجھی تھی کہ میں تجھے بھول گیا ہوں؟ میں بڑا ضدی آدمی ہوں اور اپنی ضد پوری کر کے رہوں گا۔ آج موقع

مل گیا ہے۔

میں اس کے پاؤں پڑ گئی۔ اس کو خدا اور رسولؐ کے واسطے دیئے مگر اس کا دل نہ پسیجا۔ اس پر حیوانیت سوار تھی یا اس کی بیوی کے کہنے کے مطابق اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اس نے میرے دس ماہ کے بچے کو گردن سے پکڑ کر لٹکا لیا اور کہا کہ جھٹکا دے کر اس کی گردن توڑ دوں گا۔ میں عجب مشکل میں پڑ گئی' ایک طرف عصمت تھی' دوسری طرف مامتا۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ آخر مامتا جیت گئی۔ میں نے اس کے کہنے پر قمیض اتار دی۔ بچہ اس کے ہاتھ میں لٹکا ہوا تھا۔ اس نے بچے کو جھٹکا دے کر بستر پر پھینک دیا۔ بچہ جاگ کر رونے لگا۔ میں نے اس درندے پر حملہ کر دیا۔ وہ مرد تھا اور طاقتور بھی تھا اور اس پر حیوانیت بھی سوار تھی۔ اس نے مجھے پکڑ کر گرا لیا۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنی عصمت کو بچانے کی جدوجہد جاری رکھی۔

مجھے اس کے ہاتھ سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں نے دروازے کی کنڈی کھولی اور باہر کو دوڑ لگا دی۔ وہ میرے پیچھے آیا۔ میرا رخ قبرستان کی طرف تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ قبرستان کے دوسری طرف نہر میں کود جاؤں گی مگر اپنی عصمت کو داغدار نہیں ہونے دوں گی۔ راستے میں ہی اس جگہ پہنچ کر ایک پرانی قبر میں پیر دھنس گیا اور میں گر گئی۔ اس بدبخت نے آ کر مجھے پکڑ لیا۔ میں چیخی چلائی۔ میری چیخیں سن کر تم آ گئے اور اس کو للکارا۔ اس نے بھاگنے سے پہلے خنجر سے میرا پیٹ چاک کر دیا۔

خدا کا شکر ہے جس نے میری عصمت بچا لی ہے۔ اب میں اس کے حضور سرخرو حاضر ہوں گی۔ میرا انتقام خدا لے گا۔ میں آسمان والے کے آسمان تلے ننگی پڑی ہوں مگر میری پاکدامنی کا گواہ خدا ہے۔ میں روز حشر اپنے خاوند اور بیٹے سے پاک صاف ملوں گی۔

اس نے مجھے اپنے قاتل کے گھر کا پتہ سمجھا دیا اور بتایا کہ اس کی خاص نشانی یہ ہے کہ اس کی بائیں آنکھ کے اوپر ابرو والی جگہ پر کسی حادثے میں خاصا بڑا زخم آیا تھا۔ اب وہاں ابرو کی بجائے زخم کا بھدا سا اور بڑا نشان ہے۔

باتیں کرتے کرتے اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ میں نے اس کو ہلایا جلایا مگر اس کے چہرے پر موت کا پسینہ آ گیا تھا۔ اس نے میرے بازوؤں میں آخری ہچکی لی اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

میں نے یہ بات اس طرح سنا دی ہے جیسے مرنے والی لڑکی نے اسی طرح آرام آرام سے سنا دی ہو گی۔ نہیں۔ وہ ٹوٹے ٹوٹے فقرے بولتی' رکتی اور بڑی مشکل سے الفاظ زبان سے باہر دھکیلتی تھی۔ کبھی مجھے اس طرح محسوس ہوتا کہ یہ مر چکی ہے اور اس کی روح بول رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتی تھی۔ ساری زندگی اس کی شاید کسی نے نہیں سنی تھی۔ یہ خیال بھی آتا ہے کہ وہ غشی کی حالت میں بھی لاشعوری طور پر بول رہی تھی۔ تصور میں لائیں کہ آپ کا پیٹ پھٹا ہوا ہے' انتڑیاں باہر آ رہی ہیں اور آپ ہسپتال میں نہیں بلکہ قبرستان میں پڑے ہیں۔ تو کیا آپ ہوش میں رہیں گے اور بول سکیں گے؟

یہ میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ میری اس وقت کیفیت یہ تھی جیسے میں وہاں

جکڑا گیا تھا اور کوئی پراسرار طاقت مجھے اس لڑکی کی باتیں سننے پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ شاید خوف کی انتہا تھی۔ میرا دماغ جام ہو گیا تھا۔ مجھے وہاں سے بھاگ جانا چاہئے تھا لیکن وہی بات کہ مجھے کسی طاقت نے جکڑ رکھا تھا۔

وہ جب مر گئی تو میرا دماغ بیدار ہو گیا۔ پہلا خیال یہ آیا کہ کسی نے دیکھ لیا تو مجھے تھانے پہنچا دیا جائے گا اور میں ہی قاتل قرار دے دیا جاؤں گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اس زخمی لڑکی کو اٹھا کر ہسپتال کی طرف نہیں چل پڑا تھا ورنہ مجھے ہی دھر لیا جاتا۔ میں وہاں سے اٹھا اور گھر چلا گیا۔

میں نے صبح پولیس کو گمنام فون کر کے اس واردات کی اطلاع دی۔ قاتل کا پتہ اور حلیہ بھی لکھوا دیا۔ پھر میں قبرستان میں چلا گیا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ جس لاش کو میں نے احترام سے چادر میں باندھ دیا تھا وہ لوگوں کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ تھانیدار اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ چونکہ میں نے گمنام فون کر کے قاتل کی نشاندہی کر دی تھی اس لئے پولیس نے قاتل کو گرفتار کر لیا مگر اس نے جرم کا اقبال کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کوئی گواہ بھی نہ تھا اور قاتل نے دل کھول کر پولیس کی خدمت بھی کر دی تھی۔ قاتل دنیا کے قانون سے صاف بچ نکلا تھا' اور اب میں برسوں بعد قاتل کو اللہ کی گرفت میں دیکھ رہا تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا اور گندگی کھا رہا تھا۔

میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کن حالات میں پاگل ہوا تھا اور اس کا کیا بنا' اس کے محلے میں گیا۔ لوگوں سے مل کر معلومات حاصل کیں۔ ہمسایوں نے بتایا کہ پاگل ہونے کے بعد اس کے لڑکے آوارہ ہو گئے۔ ایک لڑکا گھر سے بھاگ گیا اور دوسرا ہیروئن کا نشئی ہو گیا۔ لڑکی کا کوئی والی وارث نہ رہا تو وہ غلط لائن پر چل نکلی اور فلموں میں کام کرنے کے شوق میں ماڈرن طوائفوں کے ہتھے چڑھ گئی۔

وہ چونکہ عادی مجرم نہ تھا' اس لئے وہ ایک معصوم لڑکی کا خون ہضم نہ کر سکا اور نفسیاتی مریض ہو گیا۔ رات سوتے میں ڈر جاتا اور کہتا کہ وہ آ گئی ہے وہ مجھے مار ڈالے گی۔ ڈاکٹروں نے کافی کوشش کی مگر وہ ٹھیک نہ ہو سکا۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس کی اپنی اولاد نے اس سے آنکھیں پھیر لیں اور گھر میں اس کا داخلہ بند کر دیا۔

پروین کے بچے کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

میں نے اس قاتل کو پولیس کی حراست میں دیکھا تھا۔

اب وہ سڑکوں پر عبرت کا نشان بنا نظر آتا ہے۔ ہم لوگ عبرت حاصل نہیں کرتے۔ وقتی طور پر واقعے سے متاثر ہوتے ہیں اور چند دنوں بعد بھول جاتے ہیں۔

ایک صاحب جن کی بیگم بہت فضیلی واقع ہوئی تھیں، رات گئے گھر پہنچے تو انھوں نے ایک چور کو دروازہ کھولنے کی کوشش میں مصروف پایا۔ انھوں نے چپکے سے چور سے کہا: "میں دروازہ نہایت خاموشی سے کھول دوں گا مگر ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا ؟" چور نے سرگوشی کی۔

"شرط یہ ہے کہ پہلے تم اندر جاؤ گے۔"

کالی ماتا کے پجاری

ولیم شارٹنگ

اب تم کالی ماتا کے چرنوں میں قربانی دے سکتے ہو" پنڈت نے پھمن سے کہا۔

اگر میں اپنی بات کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کروں تو یہ کہوں گا کہ میں جنگلی جانوروں کے بارے میں کسی قسم کا کوئی کمزور نظریہ یا عقیدہ نہیں رکھتا لیکن جہاں میرے حواس خود اپنی شہادت کو مسترد کر دیں وہاں اگر میں ایسی بات کروں تو یقیناً "پاگل قرار پاؤں گا۔ دراصل میں پاگل نہیں ہوں اور نہ ہی دن میں خواب دیکھنے کا عادی ہوں۔ کل میری موت کا دن ہے اور آج میں اپنی روح کا بوجھ ہلکا کر دوں گا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے بلا تبصرہ اور پوری تفصیل کے ساتھ اپنے ساتھ پیش آنے والے ان گھریلو واقعات کو بیان کر دوں گا جن کے نتائج و عواقب نے مجھ پر یہ عذاب مسلط کیا اور مجھے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ میں ان کی تشریح و تفصیل میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ کئی لوگوں کے لئے شاید یہ واقعات کچھ اتنے خاص نہ ہوں مگر میرے لئے یہ ایک ڈراؤنا خواب ہیں۔ شاید آپ انہیں پڑھ کر میرے فیصلے کے مقابلے میں کوئی زیادہ بہتر، زیادہ منطقی اور زیادہ دانش مندانہ فیصلہ کر سکیں۔

بچپن سے ہی میں اپنے مزاج کی نرمی اور رحمدلی کے لئے مشہور تھا۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے میں اکثر اپنے ہم عمر ساتھیوں کے مذاق کا نشانہ بھی بن جایا کرتا تھا۔ مجھے جانور بے حد پسند تھے اور میرے والدین کی طرف سے مجھے بہت سے پالتو جانور بھی ملے تھے۔ میرا زیادہ تر وقت انہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ ان کو کھلاتے پلاتے اور ان کی دیکھ بھال کرتے ہوئے مجھے جو سرور و اطمینان حاصل ہوتا تھا وہ صرف اسی وقت کا حصہ تھا۔ میری یہ عادت میری عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور پرورش پاتی رہی۔ یہ میرے لئے تفریح اور مسرت کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ جن لوگوں نے ایک وفادار اور قابل اعتماد کتا پال رکھا ہو ان کے لئے یہ سمجھنا آسان ہو گا کہ ایسا کرنے میں کتنا سکون اور آرام حاصل ہوتا ہے۔ ان بے زبان جانوروں کے والہانہ اور بے غرض پیار کی شدت سیدھی دل میں اتر جاتی اور اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ خصوصاً "آدم گزیدہ" لوگوں کو۔

میری جوانی کے آغاز میں ہی میری شادی ہو گئی اور خوش نصیبی سے مجھے میری ہم مزاج بیوی ملی۔ پالتو جانوروں سے میری محبت اور پیار دیکھتے ہوئے اس نے ان میں اضافہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ہمارے پاس پرندے تھے، سنہری مچھلیاں تھیں، خرگوش تھے، ایک خوبصورت کتا تھا، ایک چھوٹا سا بندر تھا اور ایک بلی تھی۔

ہماری بلی ایک خوبصورت اور قوی الجثہ جانور تھی۔ گہری سیاہ رنگت، حیران کن ذہانت اور غایت درجے کی وفاداری۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے میری بیوی اکثر مذاقاً اس قدیم روایت کی طرف اشارہ کیا کرتی تھی جس کے مطابق تمام کالی بلیاں چڑیلیں ہوتی ہیں۔ اس کا یہ مذاق بعد میں حقیقت بن کر میرے سامنے آگیا۔

پلوٹو..... یہ میری بلی کا نام ہے.... مجھے اپنے پالتو جانوروں میں سب سے زیادہ پسند تھی اور وہ بھی مجھ سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ میں جہاں جاتا وہ میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ بعض اوقات میں بڑی مشکل سے اسے اپنا پیچھا کرنے سے باز رکھتا تھا۔

ہماری دوستی کئی سال تک اسی طرح چلتی رہی مگر اس دوران میری مزاجی کیفیت میں ایک عجیب سی

تبدیلی آتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی وجہ میری حد سے
بڑھی ہوئی بے [illegible] تھی۔ میں روز بروز تنگ مزاج
ہوتا گیا اور دوسروں کے محسوسات کے بارے میں بے
حس ہوتا گیا۔ میں اپنی بیوی کو بلا ارادہ بے ہودہ اور
غلیظ گالیاں بھی دینے لگا تھا۔ حتیٰ کہ تشدد کا نشانہ بھی
بنانے لگا۔ میرے پالتو جانور بھی میرے مزاج کی اس تبدیلی
کا شکار ہونے لگے۔ پلوٹو بھی تنگ نہ جانے کیسے میری
بدسلوکی سے محفوظ تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی دوسرا
جانور غلطی سے بھی میرے راستے میں آجاتا تو اس کی
شامت آجاتی۔

آہستہ آہستہ اس مرض نے مجھ پر غلبہ پالیا اور
آخرکار پلوٹو جو بوڑھی ہو رہی تھی، اُس نے بھی اس
کے اثرات محسوس کرنے شروع کر دیئے۔

ایک رات جب میں نشے میں دھت گھر واپس
آیا تو مجھے احساس ہوا کہ پلوٹو میرے سامنے آنے سے
کترا رہی ہے۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ اپنی فطری
[illegible] کے تحت اُس نے میری گرفت سے نکلنے کی
کوشش کی اور [illegible] اس نے دانتوں سے
[illegible] معمولی سا زخم آگیا۔ یکایک غصے کا
ایک [illegible] میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ میں [illegible]
[illegible] اس وقت میرے بدن سے
[illegible] ایک شیطانی قوت نے میرے [illegible]
[illegible] کی لہر دوڑا دی۔ میں نے اپنی جیب
سے ایک قلم تراش چاقو نکال کر کھولا۔ بیچاری پلوٹو کو
گردن سے دبوچا اور بڑے اطمینان سے چاقو کا پھل
اُس کی ایک آنکھ میں گھونپ کر ڈھیلا آنکھ سے باہر
نکال دیا۔

[illegible] وقت اپنی اس خبیث جرأت کا قلم

کرکٹ میچ

پاک و بھارت
کا کرکٹ کا ایک روزہ میچ ہو رہا
تھا۔ ہر وہ شخص جس کے سینے میں دھڑکتا
ہوا دل تھا اور ماتھے پر دو عدد آنکھیں تھیں، میچ دیکھنے بھاگا چلا
جا رہا تھا۔ کس طرح ممکن تھا کہ مقابلہ حق و باطل ہو رہا ہو اور تاج محمد آنسو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے آفس میں بیٹھے رہیں۔

پس وہ اپنے افسر اعلیٰ کے پاس گئے اور خشک آنکھوں پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے بولے۔ "حضور فیض گنجور سے التماس ہے کہ حقیر ناچیز
کو آج کی چھٹی عنایت فرمائی جائے تو عین غریب پروری ہوگی اور
احقر تادم آخر آپ کا ممنونِ احسان رہے گا۔"

افسر اعلیٰ نے خشک آنکھوں کو نہیں اس ہاتھ کو دیکھا جو آنکھوں
میں آتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھنے میں مصروف تھا، پوچھا۔ "کیا بات
ہے۔ اتنے غم دیدہ غم دیدہ کیوں ہو اور تمہاری آواز اتنی لرزیدہ
لرزیدہ کیوں ہے؟!"

"یہ کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ مجھے اپنے چچا کے جنازے
کو کندھا دینے اور قبرستان چھوڑنے کے لیے جانا ہے۔"

افسر اعلیٰ شریف تھا۔ اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے تاج محمد
کو ایک روز کی رخصت اتفاقیہ عطا کر دی۔ تاج محمد آنسو آفس سے
ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہوئے نکلے۔ بلیک میں ٹکٹ
خریدا۔ پہنچ گئے معرکہ عظیم کو بچشم خود ملاحظہ کرنے۔

حسن اتفاق سے افسر اعلیٰ کے سینۂ بے کینہ میں بھی ایک دھڑکتا
ہوا دل تھا اور پیشانی کشادہ میں دیکھنے والی دو آنکھیں بھی خیر سے تھیں
اس نے سوچا کہ میچ نہیں دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ چنانچہ یہ کہہ کر
کہ ایک ضروری وزٹ پر جا رہا ہے۔ خود بھی میچ دیکھنے روانہ ہو گیا۔

بڑے ٹکٹوں کی بلیک ایک روز پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ مجبوراً
بلیک میں چھوٹا ٹکٹ خریدا اور جس جگہ جا کر بیٹھا وہیں بغل میں تاج محمد
آنسو دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھے اچھل اچھل کر تالیاں بجانے اور
"جیوے جیوے میاں داد" کے نعرے لگانے میں مصروف تھے۔

افسر اعلیٰ کو بہت غصہ آیا۔ تاج محمد آنسو کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے بولا
"تم اپنے چچا کو کندھا دے کر قبرستان پہنچانے کے لیے آئے ہو؟"

"جی ہاں جناب عالی!" تاج محمد آنسو نے فی البدیہہ جواب دیا۔ "میرا خیال ہے
کہ ایل بی ڈبلیو ہوتے ہی جنازہ اٹھنے کی توقع کی جا سکتی ہے بصورت
دیگر عمران خان کے اُس گیند پر آؤٹ پر جسے بآسانی نو بال کہا جا سکتا تھا۔
لازمی طور پر جنازہ اٹھے گا۔"

"کیا بکواس ہے؟"

"بکواس نہیں حقیقت ہے جناب عالی!" تاج محمد آنسو نے کہا۔ "یہ [illegible]
ایمپائر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔"

بند کرتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔
صبح کو جب میں سو کر اٹھا تو خوف اور خلش کا ایک امتزاج کانٹا بن کر میرے دل میں چبھ رہا تھا لیکن یہ چبھن بڑی خفیف، بڑی مبہم سی تھی۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ میں ایک بار پھر اپنی پرانی روش پر لوٹ آیا اور جلد ہی میری اس سفاکی کی یاد شراب میں ڈوب کر اپنی موت آپ مر گئی۔

آہستہ آہستہ پلوٹو کی آنکھ کا زخم بھر گیا۔ آنکھ کا خالی حلقہ اپنی جگہ پر موجود تھا اور بے حد خوفناک لگتا تھا۔ وہ معمول کے مطابق گھر میں گھومتی رہتی مگر جوں ہی میں اُسے چھُونے کی کوشش کرتا وہ انتہائی دہشت کے عالم میں بھاگ نکلتی۔ اس کے ساتھ ایسے سلوک پر مجھے افسوس ہُوا مگر جلد ہی اس افسوس نے تلخی کے لئے جگہ خالی کر دی اور تب میری بربادی پر آخری مہر لگانے کے لئے سرکشی میری روح کا جزو بن گئی۔

اس جذبے کے بارے میں سائنس خاموش ہے۔ فلسفہ کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ منطق اس کا منبع تلاش کرنے سے قاصر ہے۔ مجھے اس امر پر اپنے وجود سے بھی زیادہ یقین ہے کہ یہ جذبہ انسان کے قدیم ترین جذبات میں سے ایک ہے۔ یہ ایک ایسی ذہنی صلاحیت ہے جو انسان کے کردار کا رخ متعین کرتی ہے۔ ایسا کون ہے جس نے کبھی کوئی ناپسندیدہ حرکت محض اس وجہ سے نہ کی ہو کہ وہ جانتا ہے کہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ انصاف سے کام لیتے ہوئے فیصلہ کیجئے، کیا ہم جان بُوجھ کر قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتے؟ صرف اس وجہ سے کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ سرکشی، یہ بغاوت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

میں بتا رہا تھا کہ یہ خودسری میرے لئے بربادی کا پیغام لے کر آئی۔ انسانی فطرت کی اذیت پسندی لاانتہا ہے۔ یہ خود پر ظلم کرتی ہے، خود کو اذیت پہنچاتی ہے، گھٹیا مقاصد کے حصول کے لئے گھٹیا کام کرتی ہے۔ اس اذیت پسندی نے مجھے آگے بڑھنے پر اُکسایا اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس غریب جانور کو اس کے انجام تک پہنچا دوں جس کا جرم صرف اپنا دفاع تھا۔

ایک صبح اپنے پورے ہوش و حواس میں مَیں نے ایک رسی کا پھندہ اُس کے گلے میں ڈالا اور اُسے ایک درخت کی شاخ کے ساتھ لٹکا دیا۔ اُس وقت میری آنکھوں سے آنسو بارش کی طرح برس رہے تھے اور میرے دل پر انتہائی کرب کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے اُسے قتل کر دیا اس لئے کہ وہ مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ میں نے اسے قتل کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میں نے اُسے قتل کر دیا اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ ایسا کر کے میں ایک گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ ایک ایسے گناہ کا جو مجھے غفار و قہار خدا کی لامتناہی رحمت سے محروم کر دے گا۔

جس دن یہ مذموم حرکت میں نے کی تھی، اُس رات "آگ، آگ" کی چیخوں سے میری آنکھ کھُل گئی۔ میرے بستر کے گرد پڑے ہوئے پردے آگ کی لپیٹ میں تھے۔ پورا گھر آتش فشاں بنا ہُوا تھا۔ میں، میری بیوی اور ایک ملازم بڑی مشکل سے جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ آگ کے شعلوں کی آتشی زبانیں میری ساری دولت چاٹ گئیں اور میں تباہ و برباد ہو گیا۔

اس قنوطیت اور یاسیت کے عالم میں بھی مجھے اتنا

ہوش باقی تھا کہ میں اپنی کرتوت اور اس تباہی کے درمیان وجہ اور اثر کا ایک تعلق تلاش کر سکتا۔ میں حقائق کی کڑیاں آپس میں ملا رہا تھا اور میری کوشش تھی کہ کوئی بھی ممکنہ تعلق ادھورا نہ رہ جائے۔ اگلے دن میں اپنے مکان کے کھنڈرات کی طرف جا نکلا۔ ماسوائے ایک کے باقی ساری دیواریں گر چکی تھیں۔ سلامت رہنے والی دیوار کچھ زیادہ موٹی نہیں تھی۔ یہ اندرونی حصے کے ایک کمرے کی تھی اور میرے بستر کا سرہانہ اس کے ساتھ لگتا تھا۔ اس دیوار کے پلستر نے آگ کا بڑی حد تک مقابلہ کیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں اس کی یہ توجیہہ کی کہ ایسا اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ پلستر کچھ ہی عرصہ پہلے کیا گیا تھا۔ اس دیوار کے گرد لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور بہت سے لوگ دیوار کے ایک مخصوص حصے کا بڑی باریک بینی اور انہماک سے جائزہ لے رہے تھے.... عجیب.... غیر معمولی.... اور اسی طرح کے چند الفاظ مجھے سنائی دیئے۔ میں اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگے بڑھا اور دیکھا دیوار کی سفید سطح پر بلی کی ایک دیوہیکل شبیہ بنی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سچ مچ کوئی بلی دیوار میں جڑی ہوئی ہو.... شبیہ کی گردن کے گرد ایک رسی لپٹی ہوئی تھی۔

جب میں نے پہلی نظر اس آسیب کو دیکھا (میں اس سے کم اسے کوئی اور نام نہیں دے سکتا) تو انتہا درجے کے خوف و حیرت نے میرا برا حال کر دیا مگر اس خیال نے میرے دل کو تقویت بخشی کہ جس بلی کو میں نے مارا تھا اس کی لاش میرے گھر سے متصل ایک باغ میں لٹک رہی تھی۔ فائر الارم بجنے پر یہ باغ فوری طور پر لوگوں سے بھر گیا ہو گا۔ کسی نے بلی کی رسی کاٹ کر

امریکا رے امریکا

شادی کے تیسرے ہفتے ٹام سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر اُس نائٹ کلب میں چلا گیا جہاں وہ شادی سے قبل باقاعدہ جانے کا عادی تھا۔

کلب میں داخل ہوتے ہی بیوی کو چند در چند پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے ایک لڑکی آئی، اس نے ٹام کا کوٹ اتارتے ہوئے پیار سے اس کے بال بکھیر دیئے۔ پھر دوسری لڑکی آئی اور اس نے ٹام کے بال سنوار دیئے۔ آخر میں آرڈر لینے کے لئے بارمیڈ آئی اور ٹام کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولی "بہت دنوں کے بعد آئے ہو ڈارلنگ!"

بیوی کلب کی لڑکیوں کی حرکات برداشت نہ کر سکی اور اٹھ کر تیزی سے باہر کی طرف چل دی۔ اسے منانے کی کوشش کرتا ہوا ٹام بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔ باہر نکل کر اُس نے ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹام نے وضاحت کرنا شروع کر دی "یہ ساری باتیں ماضی کی ہیں۔ اب میں اپنے ماضی کو دفن کر چکا ہوں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔"

"لیکن ڈارلنگ، میری بات تو سنو۔"

"نہیں۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

ٹام دیر تک اس سے "میری بات تو سنو" کہتا رہا اور وہ جواب میں "نہیں نہیں" کی رٹ لگائے رہی۔

اچانک ٹیکسی ڈرائیور نے بریک لگائے اور پیچھے گھوم کر بولا "آج تم کتنی بے ہودہ اور بدتہذیب لڑکی کو پکڑ لائے ہو ٹام۔ اسے ٹیکسی سے نیچے دھکیل دو۔ میں تمہیں دوسری لڑکی کے پاس لئے چلتا ہوں جو تمہاری ہر بات سنے گی اور ہر بات پر "ہاں ہاں" کرے گی۔"

اسے درخت سے اتارا اور میری خواب گاہ کی ایک کھلی کھڑکی کے ذریعے اندر پھینک دیا ہو گا۔ غالباً اس سے اس کا مقصد مجھے نیند سے بیدار کرنا تھا۔ دوسری دیواروں نے گر کر میرے دست ستم کی شکار کو تازہ لیپ کیے گئے پلستر پر منطبق کر دیا ہو گا۔ اس کے بعد آگ کے شعلوں نے، لاش سے اُٹھنے والی امونیا گیس نے اور پلستر کے چونے نے مل کر اس خاکے کو وہ شکل دی جسے میں نے دیکھا۔

اگرچہ میں فی الفور ایک وجہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر میرا ضمیر مطمئن نہ ہو سکا۔ بلی کی شبیہ نے میرے دل و دماغ پر گہرا نقش ثبت کیا تھا۔ کئی ماہ تک میں بلی کے آسیب سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ ایک نیم جذباتی سا احساس مجھے کچوکے لگاتا رہتا۔ بظاہر یہ ضمیر کی خلش محسوس ہوتی تھی مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ اپنے پچھتاوے کا مداوا کرنے کے لئے میں نے پھر انہی بدنام جگہوں اور مقامات پر جانا شروع کر دیا جہاں میں پہلے بھی اکثر جایا کرتا تھا۔ وہاں پر میں ہمیشہ پلوٹو جیسی کسی بلی کی تلاش میں رہتا تھا جو اس کی خالی جگہ پُر کر دے۔

ایک رات ایسی ہی ایک جگہ پر میں نیم مدہوشی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک کسی سیاہ رنگ کی چیز نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ رَم یا جن کی خالی بوتلوں کے ڈھیر پر کوئی سیاہ رنگ کی چیز بیٹھی ہوئی تھی۔ جس بات نے مجھے حیرت میں مبتلا کیا وہ یہ تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اسی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور اس وقت وہاں پر کچھ موجود نہ تھا۔ میں اٹھ کر اُس تک پہنچا اور چھو کر دیکھا۔ یہ ایک سیاہ بلی تھی۔ ایک بہت بڑی بلی۔ ٹھیک اتنی ہی بڑی جتنی پلوٹو تھی، ہر زاویے سے اس کے مماثل سوائے ایک کے۔ پلوٹو کے بدن کے کسی بھی حصے پر ایک بھی سفید بال نہ تھا۔ اس بلی کی چھاتی کے مقام پر ایک غیر واضح مگر وسیع سفید دھبہ تھا۔

میرے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بلند آواز میں خرخراتے ہوئے اپنا جسم میرے ہاتھ سے یوں رگڑنے لگی جیسے اُسے میری توجہ سے خوشی محسوس ہوئی ہو۔ مجھے بالکل ایسی ہی کسی بلی کی تلاش تھی۔ میں نے اسی وقت اس جگہ کے مالک کو یہ بلی خریدنے کی پیشکش کر دی مگر وہ شخص اس بلی کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اُس نے پہلے کبھی اسے دیکھا تھا۔

جب میں گھر کو روانہ ہوا تو بلی بھی میرے ساتھ ساتھ آ گئی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ گاہے گاہے راستے میں رک کر میں جھکتا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتا۔ گھر پہنچتے ہی وہ اس طرح اِدھر اُدھر پھرنے لگی جیسے ہمیشہ سے یہاں رہتی چلی آئی ہو۔ میری بیوی اسے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئی لیکن جہاں تک میرا سوال ہے میں اپنے اندر اس کے لئے ناپسندیدگی کے جذبات محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وقت کا دھارا اُلٹا چل پڑا ہو۔ گزشتہ حالات و واقعات میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے۔ ایسا لگتا جیسے وہی فلم دوبارہ دہرائی جائے گی۔ وہی کچھ دوبارہ ہو گا جس سے میں بچنے کی کوشش کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے یہ اندیشہ کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ کیا بلی کی محبت مجھے اس سے متنفر کر رہی ہے؟ درجہ بدرجہ نفرت اور ترشی کے جذبات میرے مزاج کی تلخی میں گھل کر اُسے

زیر بلا بناتے چلے گئے۔ میں بلی کے سامنے آنے سے گریز کرنے لگا۔ شرم کے ایک تند احساس اور میری سابقہ بے رحمانہ حرکت کی یاد نے کچھ عرصہ تک مجھے اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بنانے سے باز رکھا۔ چند ہفتوں تک وہ میرے ہاتھ سے محفوظ رہی مگر پھر آہستگی سے، بے حد آہستگی سے مجھے اس سے ناقابلِ بیان کراہت محسوس ہونے لگی اور میں اُس کی مکروہ محبت سے ایسے کترانے لگا جیسے طاعون کے مریض کی سانس سے کترایا جاتا ہے۔

میری نفرت و کراہت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس رات میں اسے گھر لایا اس کی صبح کو یہ انکشاف ہوا کہ وہ بھی پلوٹو کی طرح ایک آنکھ سے محروم ہے۔ اس وجہ سے وہ میری بیوی کو اور بھی عزیز ہو گئی جس کے متعلق میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ انسانیت اور رحمدلی کی وہ خصوصیت جو کبھی میرا طرۂ امتیاز تھی میری بیوی میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

جوں جوں میرے دل میں اس بلی کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی، میری جانب اس کا التفات بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ایسی مستقل مزاجی سے میرا پیچھا کرتی تھی جسے سمجھنا آپ کے لئے دشوار ہو گا۔ اگر میں کرسی پر بیٹھتا تو وہ بھی کرسی کے نیچے گھس کر بیٹھ جاتی یا اُچھل کر میرے گھٹنوں پر آ بیٹھتی اور اپنے نفرت انگیز پیار کا مظاہرہ کرنے لگتی۔ اگر میں چلنے کے لئے کھڑا ہوتا تو وہ میری ٹانگوں سے اس طرح آ کر ٹکراتی کہ میں بمشکل گرنے سے بچتا یا وہ اپنے تیز اور نوکیلے پنجے میرے کپڑوں میں گاڑ کر میری چھاتی تک چڑھ آتی۔ ایسے موقع پر میرے اندر ایک شدید خواہش پیدا ہوتی کہ ایک ہی گھونسے سے اس کا کام تمام کر دوں مگر میں کوشش کر کے خود پر قابو پا لیتا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ ایسا سوچتے ہی مجھے اپنا سابقہ جرم یاد آ جاتا مگر زیادہ تر اس وجہ سے .... مجھے یکدم اس کا اعتراف کر لینا چاہئے ... کہ میں اس سے خوف کھانے لگا تھا۔

یہ خوف میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اسے کیا نام دوں؟ اس کی وضاحت کیسے کروں؟ مجھے خود سے شرم محسوس ہوتی تھی۔ جی ہاں! اپنے ضمیر کی اتنی سزا بھگتنے کے باوجود بھی مجھے خود سے شرم محسوس ہوتی تھی کہ مجھے اس جانور سے جو خوف محسوس ہوتا تھا اس کی بنیاد صرف وہم پر تھی۔ میری بیوی نے کئی مرتبہ اس دھبے کی طرف میری توجہ دلائی جو پلوٹو اور اس بلی کے درمیان واحد ظاہری فرق تھا۔ یہ دھبہ بڑا ہوتے ہوئے بھی مبہم اور غیر واضح سا تھا لیکن بڑے غیر محسوس طریقہ سے یہ روشن اور واضح ہوتا جا رہا

دو بچیاں کھیل رہی تھیں۔ کھیل کے دوران ننھی نجمہ نے ننھی سلمیٰ سے کہا۔

"کوّے کوّی کی کہانی سنو گی؟"

ننھی سلمیٰ نے کہا: "نہیں میں جھوٹی باتیں نہیں سنتی۔ کہانیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔"

ننھی نجمہ نے تردید کی: "کہانیاں جھوٹی نہیں ہوتیں۔"

"میرے ابو نے بتایا ہے کہ کہانیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔" ننھی سلمیٰ بولی: "اور وہ غلط بات نہیں کہہ سکتے کیوں کہ وہ اسکول ٹیچر ہیں۔"

"میرے ابو جمعہ کو مچھلی کے شکار پر جاتے ہیں اور وہ بھی غلط بات نہیں کہہ سکتے کیوں کہ وہ تمہارے ابو سے زیادہ جھوٹ کے متعلق جانتے ہیں۔"

تھ۔ میں نے اسے فریب نظر سمجھ کر مسترد کر دیا مگر حقیقت روز روشن کی طرح آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ سب روز بروز ایک واضح شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اب اس کی شباہت ایک ایسی چیز سے ملتی تھی جسے نام دیتے ہوئے میرے بدن میں جھرجھری دوڑ جاتی تھی۔ اسی وجہ سے میں اس جانور سے نفرت کرتا تھا' اس سے خوف کھاتا تھا اور اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ اس کی چھاتی پر ایک مہیب اور ہولناک شے کا عکس تھا .... پھانسی کے پھندے کا عکس!

آہ! خوف اور جرم کا کرب.... نزع اور موت کا عذاب۔ ایک حقیر جانور جس کی ہم جنس کو میں بے دردی سے ختم کر چکا تھا وہ حقیر جانور مجھ سے انتقام لے رہا تھا۔ مجھ سے.... ایک انسان سے.... اشرف المخلوقات سے.... خدا کے خلیفہ سے.... مصائب و آلام کی اذیت ناقابلِ برداشت تھی۔ میری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو چکا تھا۔ بلی کبھی بھی مجھے تنہا نہ چھوڑتی تھی۔ خواب میں بھی اس کی گرم سانسیں مجھے اپنی گردن پر محسوس ہوتی تھیں۔ اس کا بوجھ میں اپنی چھاتی پر پڑا پاتا تھا۔ خواب جو مجسّم ہو گیا تھا.... خواب جس سے میں نجات حاصل نہیں کر سکتا تھا.... خواب جو میری روح پر قابض ہو گیا تھا۔

میرے دل کی بچی کھچی نیک خوئی اس عقوبت کی نذر ہو گئی۔ شیطانی سوچیں میرے لاشعور میں اُتر گئیں' خبیث ترین اور ذلیل ترین شیطانی سوچیں۔ مجھے دنیا کی ہر چیز سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ میری صابر و شاکر اور وفادار بیوی میرے بار بار پھٹ پڑنے والے غصے کا سب سے بڑا نشانہ تھی۔

ایک دن میں اس قدیم اور سال خوردہ عمارت (جہاں ہماری غربت نے ہمیں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا) کے تہہ خانے کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ میری بیوی وہاں کچھ کام کر رہی تھی اور میں اُس کا ہاتھ بٹانے جا رہا تھا۔ اچانک سیڑھیاں اترتے بلی میری ٹانگوں سے اتنی شدت کے ساتھ آ کر ٹکرائی کہ میں سر کے بل نیچے گرتے گرتے بچا۔ آگ بگولہ ہو کر میں نے ایک کلہاڑی اٹھائی۔ شاید اُس وقت غصے نے میرے دل و دماغ پر طاری خوف کو بھی شکست دے دی تھی۔ میں نے پوری قوت سے بلی پر وار کیا مگر راستے میں ہی میری بیوی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

غیض و غضب کی ایک وحشیانہ لہر نے میرے شعور کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ میرے جسم کا تمام خون میرے چہرے میں جمع ہو کر میری آنکھوں میں مرتکز ہو گیا۔ پھر جیسے ہر چیز پر دُھند چھانے لگی۔ گہرے سرخ رنگ کی دھند' خون جیسی دُھند' ہر چیز اس کی لپیٹ میں آ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

جب دھند چھٹی تو میں نے دیکھا کہ میری بیوی فرش پر پڑی ہے اور کلہاڑی اُس کے سر کو دو ٹکڑے کرتی ہوئی اندر تک دھنسی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔

ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر میں نے خود کو سنبھالا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب لاش کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں اسے اپنے گھر سے نکال کر کہیں اور نہیں لے جا سکتا' نہ ہی دن کے وقت اور نہ ہی رات کو۔ کوئی بھی کہیں بھی کسی بھی وقت مجھے دیکھ سکتا تھا۔ میرے دماغ میں کئی طریقے آئے۔ پہلے میں نے سوچا کہ لاش کو چھوٹے چھوٹے

ٹکڑوں میں کاٹ کر آگ میں جلا دوں۔ پھر یہ کہ تہہ خانے میں ایک گڑھا کھود کر لاش کو اس میں دبا دوں۔

ایک مرتبہ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسے تجارتی سامان کی طرح پیک کر کے ایک قلی کا بندوبست کروں جو اسے یہاں سے اٹھا لے جائے۔ پھر ایک طریقے پر میرا دل اور دماغ دونوں متفق ہو گئے۔ وہ یہ کہ لاش کو تہہ خانے کی دیوار میں چُن دوں بالکل ویسے ہی جیسے ازمنۂ وسطیٰ کے راہب اپنے شکاروں کو چُن دیا کرتے تھے۔

یہ تہہ خانہ اس کام کے لئے بے حد موزوں تھا۔ اُس کی دیواریں بڑے بودے پن سے تعمیر کی گئی تھیں اور ان پر حال ہی میں ایک بے ڈھنگا سا پلستر کیا گیا تھا جسے موسم کی نمی نے ابھی تک سوکھنے نہیں دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دیوار میں خلا سا تھا جیسے وہاں کوئی چمنی یا آتش دان بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس خلا کے سامنے اینٹیں لگا کر اسے باقی دیواروں جیسا بنا دیا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں ان اینٹوں کو ہٹا کر لاش اندر رکھنے کے بعد دوبارہ پھر اس طرح لگا سکتا ہوں کہ کوئی متجسس نظر کسی مشتبہ چیز کا سراغ نہ لگا سکے۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ ایک سلاخ کی مدد سے میں نے ساری اینٹیں نکالیں اور بڑی احتیاط سے لاش کو اندر کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد میں نے ایک ایسا پلستر تیار کیا جو بالکل پہلے پلستر جیسا تھا اور اس کی مدد سے میں نے تمام اینٹیں واپس جما دیں۔ کام ختم کرنے کے بعد مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ دیوار پر کوئی خفیف سا نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرش پر موجود کوڑا کرکٹ میں نے بڑی احتیاط اور باریک بینی سے صاف کر دیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں نے فاتحانہ

"دیکھو اب یہ کدھر جاتی ہے"

انداز سے چاروں طرف نظر ڈالی اور اپنے آپ سے کہا — "ہوں! کم از کم میری محنت ضائع نہیں ہوئی"۔

میرا اگلا قدم اس بلی کی تلاش تھا جو اس سارے فساد کی جڑ تھی۔ میں اسے ختم کر دینے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اسے میرے خطرناک عزائم کی بھنک پڑ گئی تھی اور وہ کہیں چھپ گئی تھی۔ اس نفرت انگیز مخلوق کو اپنے اردگرد نہ پا کر مجھے جو فرحت حاصل ہوئی اس کا اندازہ تو کیا تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔ اُس رات میں بڑے سکون کی نیند سویا۔ جی ہاں! اپنے ضمیر پر قتل کا بوجھ لئے ہوئے بھی میں بڑے سکون سے سو گیا۔

دوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا مگر وہ نظر نہ آئی۔ میں ایک مرتبہ پھر ایک آزاد شخص کی طرح سانس لے رہا تھا۔ میری زندگی کو تہ و بالا کر دینے والا عفریت ہمیشہ کے لئے دفعان ہو چکا تھا۔ میری خوشی بے اندازہ تھی۔ اپنی گھناؤنی حرکت کی خلش میرے دل میں تھی لیکن بے حد خفیف۔ میری بیوی کی گمشدگی کے متعلق کچھ سوالات کئے گئے مگر ان کے جوابات پہلے سے تیار تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ میرے گھر کی تلاشی بھی لی گئی مگر انہیں مایوسی ہوئی۔ مجھے اپنا مستقبل بالکل محفوظ و مامون نظر آ رہا تھا۔

قتل کے چوتھے دن، انتہائی غیر متوقع طور پر

پولیس کی ایک پارٹی نے میرے گھر پر چھاپہ مارا۔ انہوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی مگر میں بغیر کسی گھبراہٹ کے ہر سوال کا جواب دیتا رہا۔ افسران نے مجھے حکم دیا کہ خانہ تلاشی کے دوران ان کے ساتھ رہوں۔ انہوں نے گھر کے ایک ایک کونے کی تلاشی لے ڈالی مگر انہیں کچھ نہ ملا۔ بالآخر وہ کوئی تیسری یا چوتھی دفعہ تہہ خانے میں اتر گئے۔ میرے بدن کے کسی بھی حصے میں ہلکا سا ارتعاش بھی نہ تھا۔ میرے دل کی رفتار کسی معصوم و بے خطا انسان کی طرح معمول کے مطابق تھی' میں چھاتی پر بازو باندھے تہہ خانے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ پولیس والے مکمل طور پر مطمئن ہو گئے اور جانے کی تیاری کرنے لگے۔ خوشی کے مارے میرا دل بلیوں اُچھل رہا تھا اور شدت سے خواہش ہو رہی تھی کہ کوئی بات کروں۔ کوئی ایسی بات جس سے میری بے گناہی پر مہرِ تصدیق ثبت ہو جائے۔

جب پارٹی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو آخر کار میں بول پڑا:

"معزز حضرات! آپ سب کے شکوک رفع کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں آپ سب کی درازیٔ عمر کی دعا کرتا ہوں اور یہ بھی کہ خدا آپ کو تھوڑی سی خوش مزاجی اور ملنساری عطا فرمائے۔ ویسے یہ گھر بڑے اچھے طریقے سے تعمیر کیا گیا ہے (کچھ کہنے کے جنون میں مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں کیا بکتا چلا جا رہا ہوں) بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی تعمیر بہترین طریقے سے ہوئی ہے۔ یہ دیواریں.... کیا آپ لوگ جا رہے ہیں؟ یہ دیواریں بڑی مضبوط ہیں...."

اور پھر انتہا درجے کی حماقت کرتے ہوئے میں نے ایک بانس سے دیوار کے اس حصے کو زور و شور سے بجانا شروع کر دیا جس کے پیچھے میری بیوی کی لاش کھڑی تھی۔

کچھ دیر تک دیوار سے بانس کے ٹکرانے کی آواز سنّاٹے میں غرق ہوتی رہی تب میری بیوی کے مقبرے سے اس کا جواب ملنے لگا۔ ایک ہلکی سی چیخ کی آواز ابھرنے لگی' دھیمی اور مرتعش سی جیسے کوئی بچّہ سسکیاں لے رہا ہو اور تب وہ آواز یکایک ایک لمبی بلند اور تیز چیخ کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک ناقابلِ برداشت غیر انسانی چیخ.... جیسے کسی بھیڑیے کی ہُوک.... ماتم کرتی ہوئی چیخ.... جیسے جہنّم کی ساری بلائیں مل کر واویلا بپا کر رہی ہوں.... جیسے ابلیسی عفریت قہقہے لگا رہے ہوں۔

میں لڑکھڑا کر سامنے کی دیوار سے جا لگا۔ ایک لمحے کے لئے پولیس پارٹی سیڑھیوں میں ساکت و جامد کھڑی رہی پھر دوسرے ہی لمحے درجن بھر مضبوط ڈھنڈے دیوار پر برس رہے تھے۔ دیوار سالم کی سالم نیچے آ گری۔ میری بیوی کی لاش سامنے کھڑی تھی۔ سڑتا گلتا چہرہ' اس پر جما ہُوا خون اور اس کے دو حصوں میں تقسیم سر پر بیٹھی ہوئی وہ منحوس کالی بِلّی جس کا سرخ دہانہ جیسے ہنسی کے انداز میں کھُلا ہُوا تھا اور جس کی اکلوتی آنکھ انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ یہ منحوس کالی بِلّی مجھے اس انجام تک پہنچانے کی ذمہ دار تھی۔ اسی کی وجہ سے میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا اور اسی کی آواز نے مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا مگر یہ یہاں کیسے پہنچی؟ اوہ اچھا! شاید میں نے اپنی بیوی کی لاش کے ساتھ اسے بھی مقبرے میں بند کر دیا تھا۔

"ماسٹر میری بات مان جاؤ،
وہ مکان آسیب زدہ ہے۔
ایک خونی مکان کا قصہ"

پُراسرار مکان

غیر ملکی کہانی

رات انتہائی سرد اور تاریک تھی۔ باہر طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے اور دھواں دھوں پانی پڑ رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر آتش دان میں لکڑی کے چند اور کندے جھونکے اور سلاخ سے آگ کو کرید کر جب پلٹا' تو سرجان کافی کی پیالی کا آخری گھونٹ ختم کر کے پائپ سلگا رہے تھے۔ میری طرف دیکھ کر انہوں نے کہا:

"خدا کی پناہ کس قدر خوفناک رات ہے' بالکل ویسی ہی جیسی آج سے چھ ہفتے قبل میں نے ایک آسیب زدہ مکان میں کاٹی تھی۔"

میں نے حیرت سے سرجان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ معمول کے مطابق سنجیدہ تھا اور وہ آتش دان میں رقص کرتے ہوئے آگ کے سرخ سرخ شعلوں کو گھور رہے تھے۔

"آسیب زدہ مکان؟" میں نے استفہامیہ انداز میں کہا۔ "کیا آپ بھی بد روحوں اور

آسیب پر یقین رکھتے ہیں؟"
"میرے یقین نہ کرنے کی وجہ؟" انہوں نے بھویں سکیڑ کر پوچھا۔
"اس لیے کہ آپ سائنسدان اور فلسفی ہیں۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "اور آپ جیسا شخص یقیناً ان توہمات کا قائل نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں میرے دوست' میں بدروحوں کا قائل نہیں۔۔۔" سرجان کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ انہوں نے پائپ کا طویل کش کھینچا اور دھواں نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے بولے: "آج سے چھ ہفتے قبل تک اگر کوئی شخص مجھے بد روحوں کی موجودگی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا تو میں اس کی باتوں پر کان نہ دھرتا' مگر اب۔۔۔" انہوں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔
میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔
"یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے کسی بھوت کو دیکھا نہ بد روح کو' مگر پھر بھی مجھے ان کے وجود کا قائل ہونا پڑا۔" چند لمحے رک کر وہ پھر بولے۔ "ڈیڑھ ماہ قبل جب میں آسٹریلیا سے واپس آیا' تو مجھے ایک آرام دہ اور پرسکون مکان کی ضرورت تھی جہاں میں اطمینان سے اپنے بعض تجربات کو عملی شکل دینا چاہتا تھا۔ ایک الگ تھلگ اور قدرے ویران علاقے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک مکان پر بورڈ لگا دیکھا۔ اس کے ذریعے پتہ چلا کہ مکان کرائے کے لئے خالی ہے۔ میں نے مکان اندر سے دیکھا۔ بلاشبہ نہایت خوبصورت' آرام دہ تھا اور میری تمام ضروریات کے لیے کافی۔ کمرے کشادہ' دالان وسیع اور برآمدے صاف ستھرے' پھر ہر طرف ایک سکون آمیز خاموشی' بہرحال میں نے متعلقہ آدمی سے بات کی' کرایہ اس کے حوالے کیا اور مکان پر قبضہ کر لیا' لیکن تیسرے ہی دن مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ میں نے غلط کہا۔ میں نہیں بھاگا' بلکہ میری بیوی نے مجھے وہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ مجھے یقین ہے اگر وہ عورت وہاں مزید ایک دن اور رہتی تو اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔"
"غالباً آپ کی بیوی کو کوئی بھوت نظر آ گیا ہو گا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا' لیکن سرجان نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا: "نہیں اسے کوئی بھوت ووت نظر نہیں آیا' البتہ بھوت کی موجودگی کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ دراصل اس مکان کا ایک کمرہ مقفل تھا اور مالک مکان نے ہمیں اس کمرے کی چابی نہیں دی تھی۔ چونکہ مکان کے دوسرے کمرے ہماری ضروریات کے لیے کافی تھے اس لیے میں نے مقفل کمرے کی چابی لینے پر اصرار نہیں کیا۔"
"کیا اس کمرے میں کوئی خاص بات تھی؟"
"ہاں میرے دوست' اس کمرے ہی میں کچھ تھا۔" سرجان نے لفظ "کچھ" پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔ "نہ جانے کیا بات تھی کہ جب بھی میں ادھر سے گزرتا میرے بدن کا رواں رواں کانپنے لگتا' چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آتے اور دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا۔ یہی کیفیت میری بیوی کی ہوتی۔ ابتدا میں ہم کچھ نہ سمجھے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ شاید نئے مکان کی ہوا کا اثر تھا' مگر جب مسلسل تین دن اور تین راتیں ہم پر یہی کیفیت گزری تو چوتھے روز میری بیوی نے یہ مکان چھوڑ دینے کا مصمم ارادہ کر لیا اور مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا' تاہم جانے سے پہلے میں نے اس بڑھیا کو بلایا۔ یہ بڑھیا اسی

مکان کے ایک گوشے میں نہ جانے کب سے رہتی تھی۔ اسے مالک کی طرف سے مکان کی دیکھ بھال اور کرائے داروں کا چھوٹا موٹا کام کرنے پر مقرر کیا گیا تھا۔ جب میں نے بڑھیا سے کہا کہ ہمارا ارادہ اس مکان میں رہنے کا نہیں تو اس نے گردن ہلائی اور کہنے لگی:

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ کو یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ وہ آپ کو کبھی چین سے نہ رہنے دیں گے--- آپ سے پہلے کئی لوگ اس مکان میں رہنے آئے لیکن کوئی بھی ایک یا دو راتوں سے زیادہ اس میں رہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ آپ نے بلاشبہ بڑی ہمت کی ہے کہ تین راتیں کاٹ دیں۔"

بڑھیا کے یہ الفاظ سن کر میں نے پوچھا:

"وہ کون ہیں جو ہمیں یہاں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔" اس کے جواب میں وہ میری طرف یوں تکنے لگی جیسے میں احمق ہوں۔ پھر بولی:

"بدروحیں اور کون--- وہ برسوں سے اس مکان میں ہیں اور میں بھی برسوں سے اس مکان میں ہوں کہ انہیں میری موجودگی بھی پسند نہیں، مگر میں ہرگز مکان نہیں چھوڑوں گی خواہ وہ مجھے مار ہی ڈالیں اور یقیناً ایک نہ ایک روز مجھے انہی کے ہاتھوں مرنا ہے اور پھر میں بھی بدروحوں میں شامل ہو جاؤں گی۔ آہا---" اس نے لرزہ خیز انداز میں اپنا منہ کھولا اور قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ یہ بڑھیا گوشت پوست کی بنی ہوئی مخلوق نہیں، بلکہ کوئی بدروح ہے--"

"پھر آپ نے کیا کیا سرجان؟" میں نے پوچھا۔

"کرتا کیا؟ اسی وقت اپنا سامان بندھوایا اور رخصت ہو گیا۔ اگر میری بیوی وہاں سے فوراً جانے کے لیے بضد نہ ہوتی تو شاید میں اس مکان میں مزید قیام کرتا۔"

سرجان نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔

"آہ--- بارش کس قدر ہلکی ہو گئی ہے--- اب میں جاتا ہوں--- خدا حافظ---" انہوں نے دروازہ کھولا، یخ بستہ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر سرجان ایک ثانیے کے لیے رکے اور بولے:

"کیا آپ اسی مکان کے متعلق سوچ رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "ازراہ لطف و کرم اس کا پتہ بتاتے جائیے۔ میں بھی اس مکان میں ایک دو روز قیام کرنا چاہتا ہوں۔"

سرجان نے قہقہہ لگایا۔ "خوب، خوب" میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ آپ وہاں جائے بغیر نہ رہیں گے۔ آکسفورڈ سٹریٹ کی شمالی نکڑ پر پہلا ہی مکان ہے۔ باہر لگا ہوا پرانا بورڈ "کرائے کے لیے خالی ہے" آپ کی رہنمائی کرے گا۔"

------O------

اگلے روز میں اس عظیم الشان عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ آکسفورڈ کا یہ شمالی حصہ لوگوں کی آمد و رفت سے خالی سب سے الگ تھلگ اور ایک قسم کا گوشۂ تنہائی تھا ان لوگوں کے لیے جو لندن جیسے شہر غدار کے ہنگاموں سے بچ کر پرسکون زندگی بسر کرنا چاہتے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ جس بڑھیا کا ذکر سرجان نے کیا ہے وہ مکان کے اندر ہو گی، اس لیے میں نے صدر دروازے پر زور سے دستک دی، مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب کھڑکیاں بند تھیں

ادھر ادھر گرد کوئی آدمی بھی نظر نہ آتا تھا جس سے مالک مکان کا اتہ پتہ پوچھتا۔ مایوس ہو کر لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دس بارہ سال کا ایک لڑکا موڑ پر نمودار ہوا اور مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر ادھر ہی آ گیا۔

"گڈ مارننگ سر!" اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔ "کیا آپ مالک مکان مسٹر جیکسن سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"بے شک، مگر میں نے سنا ہے کہ اس مکان میں کوئی بڑھیا بھی رہتی ہے۔"

"رہتی تھی جناب۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "مگر ہفتے ہوئے بے چاری مر گئی۔ اس وقت سے یہ مکان بالکل خالی ہے اور کوئی شخص اسے کرائے پر لینے کے لئے تیار نہیں ہوتا' حالانکہ مسٹر جیکسن مالک مکان نے کرایہ بہت کم کر دیا ہے۔ اس نے میری ماں سے کہا تھا کہ ہفتے میں ایک آدھ بار مکان کی صفائی کر دیا کرے' لیکن اماں نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور انکار کر دیا۔"

"کیوں؟"

"آپ کو معلوم نہیں جناب کہ یہ مکان بھوتوں کے قبضے میں ہے۔ بڑھیا کو بھی انہوں نے مارا ہے۔ وہ اپنے بستر پر مری پائی گئی تھی۔ اور اس کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔" لڑکے نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس سے مسٹر جیکسن مالک مکان کا پتہ پوچھا اور اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے وہ گھر ہی پر مل گیا۔ ادھیڑ عمر کے ایک چالاک اور ذہین آدمی نے مصنوعی تبسم سے میرا استقبال کیا۔

"کہیے جناب' آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے سنا ہے آکسفورڈ سٹریٹ والا مکان آپ کی ملکیت ہے اور آج کل خالی پڑا ہے۔ میں اسے کرائے پر لینا چاہتا ہوں۔"

"آہا!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا' پھر سنبھل کر بولا۔ "میری خوش قسمتی ہے کہ آپ تشریف لائے' لیکن۔۔۔"

"میں جانتا ہوں۔۔۔ جانتا ہوں۔۔۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ مکان آسیب زدہ ہے' کیا یہی کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"جناب دراصل بات یہ ہے کہ آسیب واسیب کے قصے تو لوگوں نے مشہور کر رکھے ہیں۔ آج تک کسی نے وہاں کچھ نہیں دیکھا' تاہم میرا فرض تھا کہ ان افواہوں سے آپ کو خبردار کر دوں تاکہ بعد میں شکایت نہ ہو۔ جب تک آپ کا جی چاہے مکان میں رہیے۔ کرائے کے نام سے ایک دھیلا نہ لوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس میں کچھ عرصہ قیام کریں تاکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی دہشت دور ہو اور وہ آئندہ اس کے آسیب زدہ ہونے کی خبریں وضع نہ کریں۔ ارے' آپ ابھی تک باہر کھڑے ہیں۔ آئیے اندر تشریف لے آئیے۔ مکان کی چابیاں ابھی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

اس نے بعجلت اپنے گھر کا بیرونی کمرہ کھولا اور ایک آرام دہ صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "بیٹھیے جناب میں خود لندن میں اجنبی ہوں اور عرصۂ دراز کے بعد ویسٹ انڈیز سے یہاں آیا ہوں۔ دراصل یہ مکان جسے آپ لینے آئے ہیں میرے ایک چچا کی ملکیت تھا اور ان کے انتقال کے بعد چونکہ میں واحد قانونی وارث تھا' اس لیے یہ مصیبت میرے سر پر آن پڑی۔ میں خود بھی اس میں ایک رات رہا اور سوائے

ہے کہ کچھ ویرانی ہی ویرانی ہے' مجھے کوئی آسیب دکھائی نہیں دیا۔ " یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لئے متغیر ہوا لیکن پھر مصنوعی بشاشت پیدا کر کے کہنے لگا:

"جب سے وہ بد بخت بڑھیا مری ہے لوگ طرح طرح کی افواہیں تیزی سے اڑانے لگے ہیں۔ خدا انہیں غارت کرے۔ کل ہی ایک شخص کہہ رہا تھا کہ بڑھیا کو بدروحوں نے گلا گھونٹ کر مارا ہے۔ بھلا بتائیے جناب' کسی بد روح نے آج تک انسان کا گلا گھونٹا ہے؟"

"وہ بڑھیا کتنے عرصے سے اس مکان میں رہ رہی تھی؟"

"چالیس سال سے جناب' چالیس سال سے۔۔۔ اور اس طویل عرصے میں اس پر کسی بد روح یا آسیب نے توجہ نہیں دی۔ خدا رحم کرے ہم لوگوں کی عقلوں پر۔۔۔ اب اس کی طبعی عمر پوری ہو چکی تھی اور اسے ایک نہ ایک دن مرنا ہی تھا۔"

"مکان کے بارے میں پہلے پہل افواہ کب اڑی کہ وہ آسیب زدہ ہے؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا' تاہم اسی بڑھیا نے مجھے بتایا تھا کہ جس زمانے میں وہ اس مکان میں آئی تھی اسی زمانے سے یہ مکان بدنام ہے۔ بہر حال اپنے چچا کی موت کے بعد گزشتہ سال جب میں یہاں آیا' تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے لیکن میں نے اس بکواس پر دھیان نہ دیا۔ مکان خاصا بڑا اور مضبوط ہے اور میں خوش تھا کہ اگر اس پر رنگ و روغن کرا دیا جائے اور نیا فرنیچر لگ جائے تو اچھا کرایہ مل جائے گا' چنانچہ میں نے لوگوں کی باتوں پر دھیان دیئے بغیر اس کی مرمت کرائی اور آپ خود دیکھ لیں گے کہ مکان بالکل نیا ہو گیا ہے' لیکن افسوس کہ ان افواہوں کی وجہ سے کوئی بھی کرائے دار دو دن سے زیادہ اس میں نہیں رہا۔"

"مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے مسٹر جیکسن۔"

"بس کیا عرض کروں جناب۔" اس نے اس انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا جیسے واقعی اپنی بد نصیبی پر افسوس کر رہا ہو۔ "کیا عرض کروں۔۔۔ جب تک ویسٹ انڈیز میں رہا کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی اور اب لندن آتے ہی میرے سامنے مصیبتوں کا پہاڑ کھڑا ہو گیا ہے۔ تھوڑی بہت رقم میرے پاس تھی وہ اس منحوس عمارت کی مرمت میں لگا چکا ہوں۔ اب فاقوں تک نوبت آ پہنچی ہے۔ مکان بیچنے کا کئی مرتبہ ارادہ کیا۔ اخباروں میں اشتہار دیئے' دلالوں سے بات کی' زیادہ کمیشن کا لالچ دیا' مگر بے سود۔ مکان کے آسیب زدہ ہونے کی کہانیاں خریداروں تک پہنچتی ہیں' وہ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور مکان خریدنے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہاں کوئی بھوت پریت نہیں۔۔۔ صرف ہمارے اعصاب کی کمزوری ہے جو ہمیں بھوت بن کر ڈراتی ہے۔ آپ مضبوط اعصاب اور پختہ دل و دماغ کے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ خدا کے لیے وہاں جا کر رہیے اور لوگوں کے دلوں سے بدروحوں کا خوف نکالیے۔"

"فرض کرو میں مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا' کیا پھر بھی آپ مجھے اس مکان میں رہنے کا ایمانداری سے مشورہ دیتے؟"

جیکسن نے حیرت سے منہ کھول کر میری طرف دیکھا اور چند لمحے تامل کے بعد بولا:

"آپ کا مقصد میں سمجھ گیا اور بخدا جھوٹ نہ کہوں گا' اگر میں یہ جانتا کہ آپ کمزور اعصاب کے آدمی ہیں تو اس مکان میں ہرگز ہرگز ایک رات بھی کاٹنے کی اجازت آپ کو نہ دیتا۔"

"کیوں؟"

"اس کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ دراصل میں خود وہاں ایک رات رہا اور اگرچہ میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا' تاہم کسی نا معلوم خوف کے زیر اثر میرے جسم کے رونگٹے بار بار کھڑے ہوتے تھے اور صبح ہونے سے پہلے پہلے میری حالت اس قدر ابتر ہو گئی کہ میں بمشکل باہر نکل سکا۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں مسٹر جیکسن آپ نے ازراہ نوازش اتنی باتیں بتائیں۔ اب اس مکان کی چابیاں عنایت فرمایئے۔"

اس نے ایک الماری کھول کر چابیوں کا گچھا میرے سامنے رکھ دیا اور رخصت کرنے دروازے تک آیا۔

خدا حافظ مسٹر لاٹٹن۔" اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ اس مکان میں آرام سے رہیں گے اور بہت جلد کوئی اچھی خبر آن کر سنائیں گے۔"

-----O-----

جب میں اپنے گھر پہنچا تو آسیب زدہ مکان میں رہنے کا پورا نقشہ ذہن میں مرتب ہو چکا تھا۔ میں نے ان تمام روایتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جو مالک مکان نے سنائی تھیں یا اس نے مختلف لوگوں اور کرایہ داروں سے سنی تھیں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ معاملہ پراسرار ضرور ہے' کیونکہ اتنے افراد بلا ضرورت جھوٹ نہیں بول سکتے۔ بہر حال میں اس کی تہہ تک پہنچنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے میں نے اپنے نوکر فرانس کو بلوایا۔ یہ شخص بہت دنوں سے میرے پاس تھا۔ پستہ قامت' مضبوط جسم اور چمکتی سیاہ آنکھوں والا فرانس انتہائی نڈر اور بے خوف آدمی تھا اور میری طرح اسے بھی آسیب زدہ مکانوں میں رہنے اور جان لیوا قسم کی مہموں میں کود پڑنے کی عادت ہو گئی تھی۔ میرے چہرے پر سوچ بچار کے اثرات دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔ قریب آ کر بولا:

"ماسٹر' آپ کچھ پریشان پریشان نظر آتے ہیں' خیر تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہی ہے۔ یہ لو چابیاں آکسفورڈ سٹریٹ کی شمالی نکڑ پر ایک بڑا سا مکان میں نے کرائے پر لیا ہے۔ یہ اسی مکان کی چابیاں ہیں۔ میں آج رات اس مکان میں سونا چاہتا ہوں۔ اپنے ساتھ چند آدمی لے جاؤ۔ صفائی وغیرہ کر کے بڑے کمرے کے آتش دان میں آگ روشن کر دینا اور ہاں اپنا ریوالور ضرور لے جانا۔"

اس نے چابیاں لیتے ہوئے حیرت سے میری طرف دیکھا:

"کیا وہاں ریوالور کی ضرورت بھی پڑے گی؟"

"شاید پڑ جائے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ مکان آسیب زدہ مشہور ہے۔"

فرانس کا چہرہ فرط مسرت سے روشن ہو گیا۔ ایک نئی مہم اس کے سامنے تھی۔ وہ چلایا:

"آہ ماسٹر' آسیب زدہ مکان۔۔۔ اب آئے گا مزہ۔ مجھے بھی بھوتوں کی زیارت کئے ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ آپ کو یاد ہے ماسٹر' جرمنی کا

وہ پرانا قلعہ جس میں ہم تین ماہ رہے تھے اور بھوتوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔"

فرانس نے جرمنی کے جس پرانے قلعے کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ آسیب زدہ نہیں تھا، لیکن اس کے آسیب زدہ ہونے کی داستانیں مشہور تھیں، حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ چند ذہین جرائم پیشہ افراد کی ایک ٹولی نے اسے اپنا اڈہ بنا رکھا تھا اور سائنس کی مدد سے قلعے کے مختلف حصوں میں یہ لوگ راتوں اور کبھی کبھی دن کے وقت بھی طرح طرح کے شعبدے دکھا کر سیاحوں اور مقامی لوگوں کو خوفزدہ کرتے تھے، لیکن جب میں نے اس قلعے کے ایک حصے کو اپنی رہائش گاہ بنا لیا، تو ان مجرموں نے بھوتوں کا روپ دھار کر مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔ چند ہی روز بعد چھت پر سے دفعتاً خون کی بارش ہوئی اور میرا بستر اور کپڑے خون میں رنگے گئے، تو میں سمجھا کہ یہ واقعی آسیب ہے لیکن جب میں نے اپنی تجربہ گاہ میں اس خون کا تجزیہ کیا تو پتہ چلا کہ یہ مصنوعی خون ہے جو کسی ٹیوب یا پچکاری کے ذریعے مجھ پر پھینکا گیا ہے۔ قصہ مختصر، ایک ماہ کے اندر اندر میں نے ان مجرموں کو گرفتار کر کے حکام کے حوالے کر دیا۔

"نہیں بھئی یہاں حالات کچھ اور ہیں۔" میں نے فرانس کو بتایا۔ "ممکن ہے اس مکان میں بدروحیں ہی رہتی ہوں۔ گتے کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا۔"

"اجی ان کی ایسی تیسی۔" فرانس نے جوش میں آ کر کہا۔ "میں ابھی وہاں جاتا ہوں اور بد روحوں سے کہہ دیتا ہوں کہ اپنا بوریا بستر باندھ لو اور رخصت ہو جاؤ، ورنہ ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔ آپ کے آنے تک میں کمرہ صاف کر کے اُسے روشن کر دوں گا۔ اطمینان سے آیئے گا۔ میں اتنی دیر میں بھوتوں سے اپنا اور آپ کا تعارف کراؤں گا۔" اس نے قہقہہ لگا کر کہا اور چلا گیا۔

-----O-----

کھانا کھا کر جب میں چلنے کے لئے تیار ہوا تو آسمان پر بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے پتہ چلا کہ بارش آج پھر ہونے والی ہے۔ سرد سرد ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ جھکڑوں میں تبدیل ہو رہے تھے اور شائیں شائیں کے شور سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ میں نے اوور کوٹ پہنا، احتیاطاً ایک کمبل بھی لے لیا۔ تیل سے جلنے والی لالٹین ہاتھ میں پکڑی، جیب میں ریوالور رکھا اور گلی میں نکل آیا۔ اِکّا دُکّا بوندیں گرنے لگی تھیں اور میرا محلہ سنسان اور تاریک پڑا تھا۔ میں تیزی سے آکسفورڈ سٹریٹ کی طرف چل دیا۔ یہ سوچ کر کہ نئے اور پھر آسیب زدہ مکان میں پہلی رات جاگ کر ہی کاٹنی ہو گی، اس لیے میکالے کے مضامین کی ایک کتاب بھی ساتھ لے آیا تھا۔ بہر حال ٹھیک ساڑھے نو بجے جبکہ پھوار تیز بارش کی صورت اختیار کر گئی تھی، میں آسیب زدہ مکان کے صدر دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور فرانس کا پھولا ہوا سرخ چہرہ دکھائی دیا۔

"ارے، تم ابھی تک زندہ ہو۔" میں نے مذاقاً کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بدروحیں تم سے ڈر گئیں۔"

میرا خیال تھا کہ یہ فقرہ سن کر وہ حسب عادت ہنسے گا لیکن اس نے کچھ جواب نہ دیا اور جلتی ہوئی لالٹین اونچی کر کے مجھے راستہ دکھانے

لگا: "ادھر سے آیئے ماسٹر' یہ دوسرا کمرہ میں نے آپ کے لیے ٹھیک کر دیا ہے۔ گرد سے اٹا ہوا تھا۔"

میں نے اپنے آپ کو ایک وسیع اور نہایت آرام دہ کمرے میں پایا۔ فرش پر نہایت پرانا مگر بیش قیمت قالین بچھا تھا اور غالباً الزبتھ اول کے زمانے کا شاندار بھاری فرنیچر جس میں ایک لمبی میز' دو کرسیاں اور ایک مسہری شامل تھی' اس کمرے میں سجا ہوا دکھائی دیا۔ فراخ آتش دان میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ کمرے کی چھت اندازاً بیس فٹ اونچی تھی اور اس پر عجیب عجیب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ میں نے اوور کوٹ اتار کر کرسی پر ڈال دیا اور فرانسس کی طرف دیکھ کر کہا:

"تمہارے چہرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی خاص بات ہے۔"

"نہیں ماسٹر' خاص بات تو کوئی نہیں' لیکن جب سے میں آیا ہوں مکان کے مختلف حصوں میں کسی کے چلنے پھرنے اور سرگوشیاں کرنے کی آوازیں گونج رہی ہیں۔"

"ممکن ہے یہ آوازیں تیز ہوا اور بارش کے شور کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ مکان تمہیں پسند آیا؟ کہو تو اسے خرید لوں؟"

"مکان تو شاندار ہے ماسٹر۔ اگرچہ پرانا ہے لیکن ہے کسی وزیر امیر کی رہائش گاہ ـــــ تیس کمرے ہیں جناب اس میں۔ گیلریوں' برآمدوں اور غلام گردشوں کا تو شمار ہی نہیں۔"

یکایک میری کرسی ہلی اور یوں محسوس ہوا کہ کسی نے میرا ٹخنہ پکڑ لیا ہے۔ حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اور دوسرے ہی لمحے میرا پالتو کتا کھڑا محبت سے دم ہلا رہا تھا۔ "کم بخت نے ڈرا ہی دیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آؤ فرانسس' ذرا ایک نظر میں بھی اس مکان کے اندرونی حصوں پر ڈال لوں۔"

جب ہم دونوں کمرے سے نکلے تو کتا دروازے تک ساتھ آیا' لیکن غلام گردش میں آنے کے بعد وہ دوبارہ کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کی حالت میں یکدم ایسا تغیر رونما ہوا کہ بیان سے باہر۔ وہ دم دبا کر سکڑا سمٹا دروازے کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں باہر کو نکلی پڑتی تھیں۔ پھر وہ حلق سے ایسی آوازیں نکالنے لگا جیسے اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر کتے کو چمکارا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ معاً اس کی حالت ٹھیک ہو گئی اور چپ چاپ ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ کتا خلاف معمول میرے پیچھے ہی پیچھے چلتا ہے' آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کی پھرتی اور شوخی جیسے ختم ہو چکی تھی ۔ نہایت ڈرا ڈرا سہما سہما سا نظر آتا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کتے بلیوں کو بعض ایسی چیزیں دکھائی دے جاتی ہیں جنہیں انسان نہ دیکھ سکتا ہے نہ ان کی موجودگی سے باخبر ہو سکتا ہے۔ اب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ یہ مسئلہ اتنا سرسری نہیں جتنا میں سمجھ رہا ہوں اور یہاں میرا واسطہ شعبدے بازوں سے نہیں واقعی بدروحوں سے ہے۔

فرانسس کی حالت بھی کتے ہی سے ملتی جلتی تھی۔ عادت کے خلاف خاموش تھا' حالانکہ کوئی اور موقع ہوتا' تو اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی۔ میں سب سے پہلے مکان کے گہرے اور تاریک تہہ خانے کو دیکھنا چاہتا تھا' چنانچہ

فرانس نے جلتی ہوئی لالٹین کی بتی اونچی کی اور تہ خانے کو جانے والا آہنی دروازہ پوری قوت سے کھولا۔ گڑگڑاہٹ کی مہیب آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔۔۔ ہمارے سامنے لکڑی کی نہایت بوسیدہ اور گھن لگی ہوئی سیڑھیاں تھیں جو نیچے تاریکی میں غائب ہو جاتی تھیں۔ میں نے فرانس کے ہاتھ سے لالٹین لے لی اور خدا کا نام لے کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ لکڑی چرچرائی، ایک لمحے کے لیے احساس ہوا کہ سیڑھی ٹوٹنے والی ہے اور میں تحت الثریٰ میں جا پہنچوں گا، لیکن فوراً ہی میں سنبھلا اور دوسری سیڑھی پر قدم رکھا۔ کتا اب مدھم آواز میں غرا رہا تھا، مگر اس کی آواز سے غصے کے بجائے خوف کا اظہار ہوتا تھا۔

"خدا کی پناہ کس قدر سیلن اور بدبو ہے۔" فرانس بولا اور اس کی آواز تہ خانے میں گونجی۔ دس بارہ سیڑھیاں طے کر کے ہم تہ خانے کے فرش پر اتر گئے۔ میں نے لالٹین اونچی کی اور اس کی کانپتی ہوئی سوگوار زرد روشنی میں تہ خانے کا معائنہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں صدیوں سے کوئی انسان نہیں آیا۔ ہر طرف مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تن رکھے تھے۔ فرش کہیں کہیں سے کھدا اور ادھڑا ہوا تھا اور یہ یقیناً چوہوں کی کارستانی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی دو موٹے تازے چوہے ایک گوشے سے نکلے اور دوڑتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ وہ اپنے پنجوں اور دانتوں سے لکڑی کا فرش کھرچ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہماری آمد سے دوسرے چوہوں کو بھی خبردار کر رہے ہیں۔

تہ خانے کی دیواریں گیلی اور بوسیدہ تھیں۔ پلستر جا بجا سے اکھڑا ہوا تھا اور پرانی خستہ اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ فرش پر بھی گرد کی ایک دبیز تہہ جم چکی تھی اور جب ہم چلتے تو پیچھے ہمارے قدموں کے واضح نشان بنتے چلے جاتے تھے۔ تہ خانے میں لکڑی کی بنی ہوئی چند بڑی بڑی پیٹیوں اور صندوقوں کے سوا کچھ نہ تھا یا شراب کی خالی بوتلوں کا ایک ڈھیر کونے میں لگا ہوا تھا۔ تہ خانے کی شمالی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا۔ میں نے اسے کھولنے کے لئے جونہی ہاتھ بڑھایا، کتا بے چین ہو کر میرے قدموں میں لوٹنے لگا، گویا مجھے دروازہ کھولنے سے روکتا ہے۔

"ماسٹر، یہاں سے چلیے صبح آ کر دیکھیے گا۔" فرانس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ڈر گئے؟" میں نے پوچھا

"جناب، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔" اس نے رک رک کر کہا۔ "ذرا دیکھیے تو یہ کیا چیز ہے؟" اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا اور جونہی میں نے لالٹین کا رخ اس طرف کیا دہشت سے میرے بدن میں تھرتھری چھوٹ گئی۔ نظروں کے عین سامنے فرش پر چھوٹے چھوٹے انسانی قدموں کے ایسے نشان بنتے چلے جا رہے تھے جیسے کوئی آٹھ نو سال کا بچہ ادھر سے ادھر دوڑ رہا ہو۔ چند لمحوں میں یہ نشان سامنے والی دیوار کے قریب پہنچ کر غائب ہو گئے۔ فرانس کا حال کیا ہوا، میں کہہ نہیں سکتا، لیکن اب میرے لیے اس تہ خانے میں ٹھہرنا دشوار تھا۔ فوراً ہی ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے اور اب میں نے دیکھا کہ کتا ہمارے آگے آگے ہے۔ غالباً وہ سب سے پہلے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ لمحہ بہ لمحہ فرانس کی حالت غیر ہوتی جا رہی ہے۔ میں تو اسے نڈر اور

بے خوف آدمی سمجھتا تھا' مگر اب نہ جانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ تہہ خانے سے باہر آ کر اس نے گردن گھما کر گرد و پیش کا جائزہ لیا کہ کوئی بھوت تو موجود نہیں۔ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا:

"تم نے تہہ خانے میں پڑی ہوئی شراب کی خالی بوتلیں دیکھیں؟ کیا خیال ہے بدروحیں بھی شراب پینے سے دلچسپی رکھتی ہیں؟"

"جہنم میں جائیں بدروحیں۔" وہ بڑبڑایا "ماسٹر' میری رائے تو یہ ہے کہ یہاں سے نکل چلیے معاملہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ آپ نے کتے کی حالت نہیں دیکھی۔ ڈر کے مارے بیچارے کا دم نکلا جا رہا تھا۔"

"اب آئے ہیں' تو کچھ دیکھ بھال کر ہی جائیں گے۔" میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "تمہیں ڈر لگتا ہے تو تم شوق سے چلے جاؤ۔ میں تو آج رات یہیں رہوں گا۔"

مکان پر ہیبت ناک سکوت طاری تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سناٹا ہمیں نگل لے گا۔ میں فرانس کے دل سے ڈر نکالنا چاہتا تھا' اس لئے پہلی منزل کے مختلف کمروں کو دیکھنے بھالنے کے ارادے سے صحن کی طرف چلا۔ ڈائننگ روم اور اس سے ملے ہوئے دو کمرے دیکھے۔ ان میں بھی بیش قیمت اور نہایت عمدہ فرنیچر سجا ہوا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری اور گرد و غبار سے پاک تھی۔

"تم نے صفائی تو بڑی محنت سے کی ہے۔" میں نے تعریفی نظروں سے فرانس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس نے چند لمحے تک کوئی جواب نہ دیا' البتہ پھٹی پھٹی نظروں سے کمرے کی دیواروں' چھتوں' فرش اور فرنیچر کو گھورتا رہا۔ پھر اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے۔ کہنے لگا:

"ماسٹر قسم لے لیجئے جو میں اس کمرے میں آیا بھی ہوں اور صفائی میں نے ہرگز نہیں کی' بلکہ جب میں نے مکان میں آ کر یہ کمرے دیکھے تھے' تو یہاں گرد و غبار اور گندگی کے سوا کچھ نہ تھا اور اب یہ جھاڑ فانوس یہ فرنیچر' خدا رحم کرے عقل کام نہیں کرتی۔"

"وہ اور کمرے ہوں گے' تم بھول رہے ہو۔ آؤ اب ڈرائنگ روم میں چلیں۔ یہ کمرہ بھی خاصا فراغ اور خوشنما تھا۔ قیمتی صوفے اور آرام دہ کرسیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ فرانس ہر شے کو گھور گھور کر دیکھتا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا تھا: "شاید میں اندھا ہو گیا ہوں۔ پہلے بھی تو اس کمرے میں آیا تھا۔ اس وقت یہاں کچھ نہ تھا۔ ایک سوئی تک نہ تھی۔ کیا میں پاگل ہو گیا ہوں۔" میرے کہنے پر اس نے لالٹین بجھا دی۔ جیب سے موم بتی نکال کر روشن کی اور میز پر رکھ دی۔ پھر دروازہ بند کرنے مڑا۔ اس کے مڑتے ہی سامنے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی ایک اور کرسی آہستہ سے حرکت میں آئی اور مجھ سے تقریباً تین فٹ کے فاصلے پر اس طرح گری جیسے کسی نے زور سے پٹخی ہو۔ کتے کے حلق سے قاؤں قاؤں کی گھٹی گھٹی آواز نکل رہی تھی۔ فرانس دروازے کے ساتھ پتھر کے بت کی مانند کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ کرسی خود بخود سیدھی ہو گئی اور پھر میری آنکھوں کے سامنے انسانی ڈھانچے کے نہایت مدھم اور غیر واضح خطوط ابھرنے لگے اور دوسرے ہی لمحے یہ ڈھانچہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

"یہ کرسی اٹھا کر سامنے رکھ دو۔" میں نے

فرانس کو حکم دیا۔ اس نے فوراً تعمیل کی۔ کرسی اٹھاتے وقت اس کی پشت میری جانب تھی۔ یکایک وہ درد سے دُھرا ہو گیا اور میری طرف نفرت بھری نظروں سے دیکھ کر بولا:

"ماسٹر یہ آپ نے میری پیٹھ پر گھونسا کیوں مارا؟"

"ابے پاگل ہوا ہے۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "مجھے کیا ضرورت ہے گھونسا مارنے کی۔ میں تو تجھ سے اتنی دور بیٹھا ہوں۔"

"جناب صریحاً کسی نے میری پیٹھ پر گھونسا مارا ہے۔ میرا تو سانس ہی رک گیا۔" کرسی دیوار کے ساتھ رکھنے کے بعد اس نے کہا۔ اس کی شکل سے ظاہر ہوتا تھا کہ جھوٹ نہیں کہتا ہو گا لیکن گھونسا مارنے والا تھا کون---

"چلو۔ اب نکلو یہاں سے۔ موم بتی جلنے دو اور باہر دروازے میں تالا ڈال دو۔" میں نے کہا۔ اب ہم پھر اسی کمرے میں آئے جس میں فرانس نے میرے سونے کا انتظام کیا تھا۔ آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی اور کمرہ خوب گرم تھا۔ باہر بارش اور ہوا کا شور رک گیا تھا اور ہر طرف چاند کی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

آتش دان کے دائیں بائیں دو الماریاں بھی رکھی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک الماری کھولی۔ اس میں بوسیدہ کپڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ دوسری الماری میں پرانے برتن بھانڈے اور چینی کے چند صحیح سالم ظروف پڑے تھے۔ پھر میں نے دیواروں کو ٹھونک بجا کر معائنہ کیا کہ شاید ان میں کوئی خفیہ دروازہ ہو، مگر ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اب میں اس بند دروازے کی طرف بڑھا جو کسی اور کمرے یا غسل خانے میں کھلتا تھا اور اس سے پیشتر کہ میں اسے ہاتھ لگاتا دروازہ ایک جھٹکے سے خود بخود کھل گیا۔ فرانس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دبی آواز میں بولا:

"ٹھہر جائیے ماسٹر، ٹھہر جائیے۔ آگے جانا ٹھیک نہیں--- خدا معلوم وہاں کیا ہے۔"

"اب جو کچھ بھی ہو دیکھے بغیر یہاں سے جانے والے پر لعنت ہے۔" میں نے جھنجلا کر کہا--- یہ خیال دل میں آرہا تھا کہ یہ شعبدے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں اور شعبدے بازوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا تاریک کمرہ تھا جس کا فرش لکڑی کا بنا ہوا تھا لیکن نہایت خستہ اور بوسیدہ حالت میں--- ایک گوشے میں بڑے بڑے گرد آلود صندوق پڑے تھے اور قریب ہی ایک کھڑکی نظر آئی جس کے پٹ نہ جانے کب سے بند تھے کیونکہ ان پر مکڑیوں نے جالے تن رکھے تھے۔ یکایک وہ دروازہ جس سے گزر کر ہم اس کمرے میں آئے تھے دھماکے سے بند ہو گیا۔ فرانس کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور وہ دیوانوں کی طرح بند دروازے سے زور آزمائی کرنے لگا مگر دروازہ اس سختی سے بند تھا کہ فرانس کے قوی بازوؤں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ فرانس کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ وہ بڑے مضبوط اعصاب کا مالک اور لوہے لاٹھ آدمی تھا جس نے خوفزدہ ہونا سیکھا ہی نہ تھا، لیکن اب اس کی حالت پانی میں بھیگے ہوئے چوہے سے مشابہہ تھی جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ کمرے کی فضا اور تاریک ہو گئی اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نادیدہ شخص ہمارے ارد گرد گھوم رہا ہے۔

"فرانس، کہاں ہو تم؟" میں نے اونچی آواز سے کہا۔ جواب میں اس کی آواز سنائی

دی: "دروازے کے پاس کھڑا ہوں۔" دفعتاً ایک دھکے سے دروازہ کھل گیا اور فرانس لڑھکتا ہوا میرے قدموں میں آن گرا۔ دوسرے ہی لمحے ہم واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ زرد روشنی کا ایک انسانی ہیولہ کمرے میں حرکت کر رہا ہے، پھر وہ سمٹ کر ایک چکر کی صورت اختیار کر گیا اور مسہری پر چند ثانیے منڈلانے کے بعد چھت کی جانب غائب ہو گیا۔

اب میں نے مسہری کا معائنہ کیا۔ اس پر بچھا ہوا بستر اٹھا دیا۔ تکیوں اور گدوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ آخر مسہری کی پرانی نواڑ میں ایک جگہ کوئی چیز چھپی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے ہاتھ ڈال کر اسے نکالا۔ کپڑے میں لپٹے ہوئے دو بوسیدہ کاغذ تھے۔ ابھی میں انہیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کسی نادیدہ ہاتھ نے یہ کاغذ چھیننے کی کوشش کی، مگر میں نے مٹھی بھینچ لی---- کتا آتش دان کے قریب چپ چاپ سر جھکائے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرے اشارے پر فرانس اس کے پاس گیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ لالٹین کی روشنی میں ان بوسیدہ کاغذوں کو ایک نظر دیکھنے سے اندازہ ہو گیا کہ یہ خط ہیں جو ۳۵ سال پہلے تحریر کیے گئے تھے۔ مضمون سے ظاہر ہوا کہ کسی نے اپنی بیوی یا محبوبہ کو لکھے ہیں۔ لکھنے والا کوئی ملاح تھا جس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان اور شکستہ قلم سے بے ربط اور پر اسرار جملے لکھے تھے۔ جو الفاظ پڑھے جا سکے، وہ یہ تھے:

"ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے---- اپنے کمرے میں رات کے وقت کسی کو مت سونے دینا کیونکہ تم نیند کے عالم میں باتیں کرتی ہو---- جو کچھ ہوا سو ہوا، آپ کیا کیا جا سکتا ہے---- ہمارے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہاں صرف اس وقت جب کہ مرنے والے اپنی قبروں سے لوٹ آئیں....."

اس جملے کے ساتھ ہی کسی عورت نے اپنے قلم سے لکھا تھا:

"بے شک مرنے والے زندہ ہو جاتے ہیں---- ۴ جون کو سمندر میں ڈوب گیا---- اسی دن----"

عجیب معمہ تھا۔ میں دیر تک اسے حل کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر ذہن کام نہیں کرتا تھا۔ فرانس ایک آرام کرسی پر پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر آتش دان میں سلاخ سے آگ کریدی، میز سرہانے گھسیٹ کر لالٹین اس پر جمائی، پستول اور گھڑی نکال کر قریب رکھی اور کتاب پڑھنے لگا کیونکہ نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

آدھا گھنٹہ بخیر و عافیت گزر گیا۔ اب میں کتاب میں اس قدر محو ہو چکا تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ فرانس کس وقت اٹھا اور کمرے سے باہر نکل کر نہ جانے کہاں چلا گیا---- میں سمجھا شاید پانی وانی پینے گیا ہو گا۔ معاً خون کو جما دینے والی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ میں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور روشن دان خاصی بلندی پر تھا۔ ہوا کا جھونکا کدھر سے آیا؟ آتش دان میں آگ کے شعلے کپکپا رہے تھے اور پھر میری آنکھوں کی پتلیاں جیسے ٹھہر گئیں۔ ایک فٹ کے فاصلے پر اٹھی ہوئی میری گھڑی پہلے تو حرکت میں آئی پھر آہستہ آہستہ چھت کی طرف معلق ہوتی ہوئی نظروں

سے غائب ہو گئی۔ کتے کی طرف نگاہ گئی تو اس کے کان آگے پیچھے ہل رہے تھے۔ آنکھیں نکلی ہوئی اور زبان باہر کو اتنی لٹک آئی تھی جیسے حلق سے جدا ہو کر فرش پر گر پڑے گی۔ ابھی میں کتے کو دیکھ ہی رہا تھا کہ دھماکے سے دروازہ کھلا اور فرانس ہانپتا ہوا اندر آیا۔ اس کا چہرہ دہشت زدہ تھا۔

"وہ آرہا ہے ---- وہ آ رہا ہے ----" اس نے چیخ کر کہا۔ پھر دھڑام سے فرش پر گرا اور اس کے ہاتھ پیر اکڑ گئے۔ آنکھوں کی پتلیاں پھر گئیں اور بھنچے ہوئے دانتوں میں سے سفید سفید جھاگ اڑنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ مر چکا تھا اور اس کی لاش اس طرح اکڑ گئی تھی جیسے برسات میں بھیگی ہوئی چارپائی۔ فرانس کی اچانک اور عبرت انگیز موت نے میرا دل و دماغ ہلا کر رکھ دیا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس جیسا کڑیل جوان کیونکر موت کی آغوش میں [illegible] لیکن یہ بہرحال حقیقت تھی کہ وہ میرے سامنے مرا پڑا تھا۔ میں نے مسہری پر سے کمبل اٹھایا اور فرانس کے اوپر ڈال دیا۔ اب میں اور کتا اس منحوس عمارت میں بد روحوں کے رحم و کرم پر تھے۔ تنہا رہ جانے کا یہ احساس اتنا بد حواس کن اور اذیت دہ تھا کہ بیان سے باہر؟ تاہم میں نے پستول ہاتھ میں لے لیا اور "آنے والے" کا انتظار کرنے لگا مگر کوئی نہ آیا۔ میں دیر تک آتش دان کے پاس کھڑا رہا۔ کتا مسلسل ہانپ رہا تھا۔ اب اس کے منہ سے بھی رال بہنے لگی تھی۔ میں نے اسے پچکار کر اپنے پاس بلانا چاہا۔ لیکن اس نے میری ایک نہ سنی اور نہ مجھے پہچانا۔

میں پھر مسہری پر لیٹ گیا اور کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ صبح کا اجالا ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے اور وقت کی نبضیں جیسے تھم گئی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس مکان میں بہت عرصے سے مقید ہوں اور جب تک میری روح بدن کا ساتھ نہ چھوڑ دے اس وقت تک یہاں سے رہا نہیں ہو سکتا۔

دفعتاً کتاب کے حروف دھندلا گئے اور پھر ان حرفوں نے ایک سایے کی شکل اختیار کرلی۔ خدا کی پناہ ---- میرا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک انسانی ڈھانچہ جس کا قامت فرش سے چھت تک بلند تھا، میرے قریب ہی کھڑا تھا اور اس کی کھوپڑی میں لگی ہوئی آگ کی مانند دہکتی ہوئی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی مگر آواز ہی نہ نکلی۔ البتہ [illegible] ابھی تک برقرار تھے۔ کمرہ تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ [illegible] ذرا گردن گھما کر دیکھا، میز پر رکھی [illegible] آہستہ آہستہ بجھتی جا رہی تھی جیسے اس میں تیل ختم ہو رہا ہو۔ آتش دان کی طرف نگاہ گئی تو اس کا بھی یہی حال تھا۔ کوئلے سرد پڑ چکے تھے۔ اس ہولناک گھپ اندھیرے میں انسانی ڈھانچے کی سرخ سرخ آنکھیں خوب چمک رہی تھیں۔ یک لخت میں چلا اٹھا:

"بھاگ جاؤ ---- بھاگ جاؤ ---- مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو ---- میری روح تمہارے ان ہتھکنڈوں سے آزاد ہے۔"

اپنی ہی آواز نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ منتشر اعصاب پرسکون ہو گئے اور رگوں میں جما ہوا خون پھر گرم ہونے لگا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ میں حرکت کر سکتا ہوں۔ میں جھپٹ کر مسہری سے کودا اور دروازہ کھول دیا۔ چاند کی تیز

روشنی کا سیلاب کمرے میں گھس آیا۔ میں نے دیکھا باہر گلی میں سرکاری بتیاں بھی جل رہی ہیں اور آسمان پر نصف شب کا چاند پوری آب و تاب سے روشن ہے۔ فضا خاموش تھی اور مزید بارش کے کوئی آثار نہ تھے؛ البتہ سرد ہوا کے جھونکے مسلسل آرہے تھے۔

یکایک میز کے نیچے سے جھریاں پڑا ہوا ایک انسانی ہاتھ نمودار ہوا اور میز کی طرف بڑھا جس پر دونوں بوسیدہ خطوط پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پستول اٹھا کر اس کا دستہ پوری قوت سے اس ہاتھ پر رسید کیا' جواب میں ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی اور پھر کمرہ جیسے پرسکون ہو گیا۔ وہ پر اسرار ڈھانچہ غائب ہو چکا تھا۔ لیکن یہ سکون چند لمحے کے بعد ہی شور قیامت میں تبدیل ہو گیا۔ دروازے پر کسی نے تین بار دستک دی۔ کمرہ اس طرح جنبش میں آیا جیسے بھونچال آگیا ہو' اور پھر سرخ' زرد' نیلی اور سبز روشنیوں کے بگولے' دائرے اور گھومتے ہوئے بھنور اٹھتے دکھائی دیئے جو برف کے گالوں کی طرح کمرے میں ادھر سے ادھر رقص کر رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی وہی آرام دہ کرسی دوبارہ حرکت کرنے لگی اور میرے نزدیک آکر رک گئی جیسے کسی نے اٹھا کر رکھی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے کرسی پر ایک جوان اور خوبصورت عورت کا ہیولہ نمودار ہوا۔ اس کا خوبصورت صراحی دار گلا اور نازک شانے عریاں تھے؛ البتہ بقیہ جسم ایک ڈھیلے ڈھالے مگر بیش قیمت لباس میں مستور تھا۔ عورت کا چہرہ حزن و ملال کی تصویر تھا اور وہ مجھ سے بے نیاز کھلے دروازے کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی آنے والا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور میں سمٹ کر ایک گوشے میں جا کھڑا ہوا۔ یکایک دروازے میں ایک نوجوان آدمی کا سایہ نظر آیا۔ اس کا لباس یقیناً سو سال پرانا تھا۔ یہ سایہ عورت کے نزدیک پہنچا تو اس کے عقب میں وہی انسانی ڈھانچہ موجود تھا۔ چند ثانیے کے لیے وہ تینوں کمرے کی ان پُر اسرار رنگ برنگی روشنیوں میں تحلیل ہو گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ عورت اور مرد دونوں اس انسانی ڈھانچے کی گرفت میں ہیں۔ عورت کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا اور مرد اپنی خون آلود تلوار پر جھکا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ڈھانچے نے ان دونوں کو نگل لیا۔ کمرے میں اب چکر کھاتے ہوئے روشنی کے ان دلفریب ہالوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اچانک دروازہ بند ہوا اور کسی غیر مرئی ہاتھ نے تین بار پراسرار انداز میں دستک دی۔ میز پر رکھی ہوئی موم بتیاں آپ ہی آپ روشن ہو گئیں اور آتش دان میں آگ کے بل کھاتے ہوئے شعلے دوبارہ بھڑکنے لگے۔ میری نگاہ کتے کی طرف گئی۔ وہ حسب معمول اسی جگہ خاموشی سے دبکا بیٹھا تھا۔ اس میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ قریب جا کر دیکھا تو مر چکا تھا۔ اس کی زبان فرش کو چھو رہی تھی اور منہ جھاگ سے تر تھا۔ فرانسس کی لاش بھی اسی جگہ تھی اور کمبل اس پر اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ میں نے کُتے کو اٹھایا اور فرانسس کے پاس لا کر لٹا دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی موت دہشت سے واقع ہوئی ہے' مگر فوراً ہی اس کی گردن کو دیکھ کر یہ خیال بدلنا پڑا۔ اس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی جیسے کسی قوی ہاتھ نے مروڑا ہو۔ واپس مسہری کی طرف آیا تو گھڑی میز پر رکھی تھی۔ اس کی سوئیاں ساکت تھیں۔ گھڑی ابھی میرے ہاتھ میں تھی کہ

دو قوی نادیدہ ہاتھوں نے میرا گلا دبا لیا۔ میں ہلکی سے مزاحمت بھی نہ کر سکا اور پھر گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

-----O-----

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اپنے ہی گھر میں اور اپنے ہی پلنگ پر پڑے پایا۔ باہر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور ٹریفک کا شور میرے کانوں میں پہنچ رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ آسیبی مکان سے مجھے اٹھا کر یہاں کون لایا ہے۔ گزشتہ رات کی لرزہ خیز تصویریں میرے آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ میں پلنگ پر ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ایک شخص ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے سنبھالے اندر آیا۔

"فرانس۔" میں چلایا۔ "اوہ خدایا' کیا یہ تم ہی ہو؟"

"جی ہاں' یقین کیجئے' ناشتے کی ٹرے لانے والا وہی میرا نوکر فرانس تھا جس نے گزشتہ رات آسیبی مکان میں میرے سامنے دم دیا تھا۔ فرانس کے پیچھے پیچھے میرا پالتو کتا دم ہلاتا چلا آ رہا تھا۔ فرانس نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا:

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ماسٹر' کیا ڈاکٹر کو بلواؤں؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم اس منحوس مکان میں مرے کیوں کر تھے؟ اور یہ کتا' یہ بھی تو مر گیا تھا۔ پھر تم دونوں زندہ کیسے ہوئے اور مجھے یہاں کون لایا؟"

"آہ' شاید آپ نے رات کو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔" فرانس نے کہا۔

ڈراؤنا خواب--- نہیں--- نہیں--- وہ خواب ہرگز نہیں تھا--- یہ کیسے ممکن ہے---" میرا جی چاہتا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرا دوں۔ "اچھا ابھی جاؤ اور سرجان کو ان کے گھر سے بلا کر لاؤ۔"

"سرجان؟" فرانس کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ "مگر جناب--- آپ کے وہی دوست جو گزشتہ تین سال سے آسٹریلیا گئے ہوئے ہیں--- کیا لندن آ گئے؟"

"کیا کہتے ہو؟" میں پھر چیخا۔ "ابھی پرسوں سرجان مجھ سے مل کر گئے ہیں اور انہوں نے مجھے اس آسیبی مکان کا پتہ بتایا تھا۔"

"آہ--- آپ نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے۔" فرانس ہنسا اور ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ کر چلا گیا۔ میرا پالتو کتا پلنگ کے نیچے بیٹھا محبت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ناشتہ بھی نہ کیا۔ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدلنے لگا۔ اوور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے انگلیاں مس ہوئیں۔ کیا دیکھتا ہوں یہ وہی بوسیدہ خطوط ہیں جو آسیبی مکان سے ہاتھ لگے تھے۔ اب تو کوئی شبہہ نہ رہا کہ رات کا واقعہ خواب نہیں ایک جیتی جاگتی حقیقت تھی' لیکن افسوس کہ یہ راز آج تک سربستہ ہے کیونکہ سرجان کا انتقال آسٹریلیا میں ہو چکا ہے اور آکسفورڈ سٹریٹ میں کوئی آسیبی مکان موجود نہیں اور نہ مسٹر جیکسن نامی کوئی شخص اس نام نہاد مکان کا مالک رہا' لیکن سوال یہ ہے کہ کاغذ کے دو بوسیدہ ٹکڑے' جن پر الٹے سیدھے جملے لکھے ہوئے تھے' میرے کوٹ کی جیب میں کیسے آئے؟

اُس شخص کی بپتا، جس کو مستقبل کا علم ہو گیا تھا، جو آنے والے وقت کی پیش گوئی کر سکتا تھا، ایک عجیب و غریب کہانی۔

مستقبل بینحہ

محمد اقبال

نیم غنودگی کی حالت میں مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے نرس میرا تکیہ درست کر رہی ہو یا میرا درجۂ حرارت لے رہی ہو۔ پھر مَیں جاگ اُٹھا اور خود کو ہسپتال کے ایک نیم تاریک کمرے میں بستر پر لیٹے ہُوئے پایا۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

"مجھے کیا ہُوا؟" مَیں نے نرس سے دریافت کیا۔

"آپ تیس فٹ کی بلندی سے گر گئے تھے۔ یہ آپ کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ جان بچ گئی۔"

تب مجھے یاد آیا کہ مَیں ایک مکان میں سفیدی کرتے ہُوئے نیچے گر گیا تھا جس سے سر میں شدید چوٹ آئی اور بائیں کندھے کی ہڈی ٹُوٹ گئی۔ اب مَیں ہیگ کے ایک ہسپتال میں زیرِ علاج تھا۔

میرے ساتھ والے بستر پر ایک اور مریض لیٹا ہُوا تھا۔ اُس پر نظر پڑتے ہی مَیں نے محسوس کیا جیسے مَیں اُس کے متعلق بہت کچھ جانتا ہُوں، حالانکہ مَیں نے پہلے اُسے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔

"تم کوئی اچھے آدمی نہیں ہو۔" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"وہ کیوں؟" وہ ناگواری سے بولا۔

"وہ اس لیے کہ تم نے ترکے میں چھوڑی ہُوئی اپنے مرحوم باپ کی نہایت قیمتی گھڑی فروخت کر دی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہُوا؟" اب اُس کے سوال میں خفگی کے بجائے حیرت کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

"بس جانتا ہُوں۔ مَیں نے غلط تو نہیں کہا؟"

اُس نے سر کی جنبش سے میری بات کا جواب ہاں میں دیا، مگر چہرے پر خوف طاری تھا جیسے اُس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ پھر جب ذرا حواس درست ہُوئے، تو اُس نے مجھے تفصیل سے اپنے متعلق بتایا۔ سونے کی گھڑی اُس کے مرحوم والد کو بہت عزیز تھی جسے فروخت کر کے وہ خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا اور یہ اُس کا احساسِ جرم ہی تھا جس کا علم مجھے اُس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ہو گیا تھا۔

اپنے بستر پر لیٹے لیٹے مَیں نے ایک اور مریض کو ہال میں سے گزرتے اکثر دیکھا تھا۔ ہسپتال میں قیام کے چوتھے یا پانچویں روز وہ مجھے الوداع کہنے آیا، مگر جونہی اُس نے خدا حافظ کہتے ہُوئے مجھ سے مصافحہ کیا مجھے نہ جانے کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک برطانوی جاسوس ہے اور چند روز بعد کاور اسٹریٹ میں جرمنوں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ یہ محسوس کرتے ہی غیر ارادی طور پر مَیں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، مگر وہ جلدی سے چھڑا، تیز تیز قدم چلتا ہُوا کمرے سے نکل گیا۔

"اُس آدمی کو روک لو۔ وہ برطانوی جاسوس ہے۔ جرمنوں کو اس کا علم ہے اور وہ اُسے قتل کر دیں گے۔" مَیں نے چلّاتے ہُوئے نرس سے کہا، مگر میری چیخ پکار پر ایک ڈاکٹر بھاگا ہُوا آیا اور اُس نے مجھے آرام سے لیٹے رہنے کی تاکید کی۔

دو روز بعد ہی برطانوی جاسوس کو گسٹاپو کے کارندوں نے کاور اسٹریٹ میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہسپتال کے عملے سے میری پیشین گوئی کا علم ہالینڈ کی زیرِ زمین تنظیم کو بھی ہو گیا۔ اُس جاسوس کی موت کے چند روز بعد ایک سہ پہر میرا انچارج ڈاکٹر اور نرس ایک اجنبی کے ہمراہ کمرے میں آئے۔

"برطانوی جاسوس کے متعلق تمہاری پیشین گوئی درست تھی، لیکن اس کا پتہ کیسے چلا؟" اجنبی بولا۔ وہ لب و لہجے سے ہالینڈ کا شہری معلوم نہیں ہوتا تھا۔

"مَیں اس کا جواب دے چکا ہُوں۔"

"کیا اُس کا ہاتھ چُھونے سے تمہیں پتہ چل گیا تھا؟"

"ہاں۔"

"ہمیں بیوقوف مت بناؤ اور سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

"یقین مانو مَیں سچ کہہ رہا ہُوں۔ مَیں نے تو اُسے روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔"

"ہاں بعض اوقات ایک غدار کے دل میں بھی اپنے کسی ساتھی کے لیے ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے۔" وہ نفرت بھرے انداز سے بولا۔

"مَیں غدار نہیں ہُوں تین سال سے خفیہ تنظیم کے ساتھ کام کر رہا ہُوں اور اپنے وطن کا ہمیشہ وفادار رہا ہُوں۔" مَیں نے احتجاج کیا۔

اُس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ گیلری میں ایک اور آدمی

فرش پالش کرنے والی مشین لیے کھڑا تھا۔ اپنے ساتھی کا اشارہ پاتے ہی اُس نے مشین چلا دی۔ مَیں سمجھ گیا کہ مشین کے شور میں میرے کمرے سے نکلنے والی چیخوں کو دبانا مقصود ہے۔ پھر نرس اور ڈاکٹر نے میرے بازوؤں کو مضبوطی سے جکڑ لیا اور اجنبی نے ساتھ والے بستر سے تکیہ اُٹھا کر میرے مُنہ پر رکھّا اور زور سے دبانا شروع کر دیا۔ اب میرے لیے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ موت کو اِس قدر قریب محسوس کرتے ہُوئے مَیں نے کوشش کر کے اپنا ایک بازو آزاد کرایا اور اُس سے تکیہ دبانے والے ہاتھ کو پیچھے دھکیلتے ہُوئے ہسپانوی زبان میں کہا: "کسی کو مارنا کتنے دُکھ کی بات ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اُس نے یک لخت تکیہ میرے چہرے سے ہٹاتے ہُوئے پُوچھا۔ ڈاکٹر اور نرس بھی حیران تھے کہ میرے قاتل نے اپنا ہاتھ کیوں روک لیا تھا۔ وہ اُن کی طرف متوجہ ہوتے ہُوئے بولا:

"اس نے جو کچھ کہا ہے، وہی مَیں سوچ رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی کی جان لیتے ہُوئے مجھے اس فعل سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ لیکن اسے میرے خیالات کا آخر علم کیسے ہو گیا؟"

اُس نے ڈاکٹر اور نرس کے سامنے وضاحت کر دی، مگر اُس کی آنکھیں پھٹی ہُوئی تھیں۔ ادھر مَیں خود بھی حیران تھا، کیونکہ مَیں ہسپانوی زبان سے بالکل نابلد تھا۔ بالآخر اجنبی بولا:

"دوست ہمیں معاف کر دو۔ ہم نے بلاوجہ تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی۔"

موت کے مُنہ سے میرے بچ نکلنے کی وحشت ناک کہانی آناً فاناً سارے ہسپتال میں پھیل گئی اور ماہرِ نفسیات ڈاکٹر پیٹرس کئی روز تک مجھ سے پُوچھ گچھ اور میرا معاینہ کرتا رہا۔ اُس کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سر میں سخت چوٹ لگنے سے میری چھٹی حِس بیدار ہو گئی ہے۔ سائنسدانوں اور ماہرینِ نفسیات نے ماضی اور مستقبل کے متعلق جاننے کی اس صلاحیت کو مختلف نام دے رکھے ہیں، مثلاً ٹیلی پیتھی، غیب دانی وغیرہ تاہم اس کی موجودگی کا سب اعتراف کرتے ہیں۔

جب آپ کسی اجنبی سے مصافحہ کریں یا اُس سے آنکھیں چار کریں تو اپنے ہاتھ پر اُس کے ہاتھ کے دباؤ، اُس کے دیکھنے کے انداز، چہرے کے تاثرات اور لب و لہجے سے آپ اُس کی شخصیت کے متعلق کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں۔ مَیں کسی اجنبی سے مصافحہ کرتا ہُوں تو اُسی لمحے مجھے اُس کی شخصیت، کردار، نجی زندگی اور ماضی اور مستقبل کے حالات کا علم ہو جاتا ہے۔ بس یُوں سمجھ لیں کہ اُس کی زندگی کے مختلف مناظر میری نظروں کے سامنے فلمی ریل کی طرح پھرنے لگتے ہیں۔ سائنسی اصطلاح میں اِس کو سائیکومیٹری کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ میرے اندر یہ صلاحیت دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔

جنگ کے بعد ایک روز میری گرل فرینڈ مجھے اپنے ہمراہ شعبدے باز کا تماشا دکھانے لے گئی۔ وہ اسٹیج پر اپنی معاون خاتون کے ساتھ کھڑا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ بیوی تماشائیوں سے تحریری پیغامات وصول کر کے اُس کے پاس لے جاتی۔ جنہیں پڑھے بغیر وہ پاس رکھی دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی میں پھینک دیتا اور جلتے کاغذ کے دُھوئیں اور راکھ سے عبارت کا مفہوم اخذ کر کے بتا دیتا۔ میرے لیے اُس کا یہ کمال بہت دلچسپی اور حیرانی کا باعث تھا اور مَیں پُورے انہماک سے تماشا دیکھنے میں محو تھا کہ میری گرل فرینڈ نے سرگوشی کی: "کاغذ جلتا نہیں، بلکہ ایک پائپ میں سے گزر کر نیچے چلا جاتا ہے۔"

کچھ دیر بعد شعبدے باز نے اپنی معاون سے ایک تہہ کیا ہُوا کاغذ لے کر آگ میں ڈالا اور کہا:

"یہ پیغام پیٹر ہرکوس نامی شخص کا ہے۔ اُس کا دعوٰی ہے کہ اُس کا غیب دانی کا علم مجھ سے بھی زیادہ ہے۔"

تماشائیوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔

"مَیں نے تو ایسا پیغام نہیں بھیجا۔" مَیں نے سوالیہ نظروں سے اپنی گرل فرینڈ کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

"بھیجا تو تھا۔" اُس نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا۔

مَیں اُسے سرزنش کرنے ہی والا تھا کہ شعبدے باز کی آواز سُنائی دی:

"مسٹر ہرکوس! براہِ مہربانی آپ کھڑے ہو جائیں۔"

مجھ پر سکتہ طاری تھا کہ میری گرل فرینڈ نے کہنی مار کر مجھے

کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا اور شعبدے باز نے مجھے کھڑا دیکھ کر اسٹیج
پر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ اب میرے لیے اسٹیج پر جانے
کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور مَیں بادلِ نخواستہ اُن دونوں میاں
بیوی کے برابر جا کھڑا ہُوا۔

"تمہارا طریقۂ کار کیا ہے؟" شعبدے باز نے پُوچھا۔

"مَیں کسی چیز کو ہاتھ سے چُھو کر اُس کے متعلق سب کچھ
بتا سکتا ہُوں۔"

"میری گھڑی ٹھیک رہے گی؟" یہ کہہ کر اُس نے اپنی گھڑی
میری طرف بڑھا دی۔

گھڑی کو ہاتھ میں لیتے ہی کئی مناظر میری نگاہوں کے سامنے
گھومنے لگے اور مَیں کچھ جھجکتے ہُوئے بولا۔ "تمہاری گھڑی بہت کچھ
بتا رہی ہے۔ اس کے اندر ایک حسینہ کے بالوں کی لٹ محفوظ
ہے۔ یقیناً یہ تمہاری بیوی کے بال نہیں۔ اُس لڑکی کا نام گریٹا
ہے تم اُس کو ہر شہر اور قصبے میں اپنے ساتھ لیے پھرتے ہو اور
وہ اس وقت بھی تماشائیوں کے درمیان موجود ہے۔"

اُس کا رنگ اُڑا جا رہا تھا اور اُس کی بیوی سوالیہ نظروں
سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ بالآخر وہ ملتجیانہ انداز سے بولا: "مسٹر
ہرکوس! براہِ مہربانی آپ اپنی نشست پر تشریف رکھیں
تاکہ ہم اپنا شو جاری رکھ سکیں۔"

مگر مَیں گھڑی ہاتھ میں لیے گریٹا کو تماشائیوں میں ڈھونڈنے
لگا۔ شعبدہ باز بار بار مجھ سے اپنی نشست پر بیٹھنے کی التجا کر
رہا تھا اور مَیں اُس کی پروا کیے بغیر گریٹا کو تلاش کر رہا تھا۔ آخر کار
جب مَیں نے اُس کو ڈھونڈ ہی لیا تو وہ اُٹھ کر ہال سے باہر نکل
بھاگی اور تماشائیوں نے شور و غل مچاتے ہُوئے مجھے آن گھیرا۔

❋

مَیں اپنے گھر ہی میں لوگوں سے فیس لے کر اُن کے ماضی
اور مستقبل کے حالات بتاتا رہا۔ پھر مشہور مزاحیہ اداکار برنارڈ بارنز
کے طائفے میں شامل ہو گیا۔ اپنے پہلے ہی شو میں تماشائیوں سے
مَیں نے کہا کہ اُن میں سے کوئی مجھے اپنی کوئی چیز مثلاً گھڑی یا انگوٹھی
وغیرہ دے دے تاکہ مَیں اُس کے مالک کی شخصیت کے بارے
میں کچھ بتا سکوں۔ اس پر پہلی قطار میں سے ایک خاتون نے
اپنی انگلی سے انگوٹھی اُتار کر میری طرف بڑھا دی جسے ہاتھ میں
لے کر مَیں نے بولنا شروع کیا:

"تم شادی شدہ عورت ہو۔ تمہارے دو بچے ہیں۔ اس وقت
تمہارا خاوند گھر میں اُن کی دیکھ بھال کر رہا ہے اور تم اپنی بیمار
والدہ کی عیادت کا بہانہ کر کے اپنے بوائے فرینڈ کے ہمراہ تماشا
دیکھنے آئی ہو۔"

اُس خاتون نے خفت اور شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

اُس دن سے مَیں محتاط ہو گیا اور اس بات کا خاص خیال
رکھتا کہ میری وجہ سے کسی کو دوسروں کے سامنے شرمندہ نہ
ہونا پڑے۔

❋

اب میری شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی حتّٰی کہ
۱۹۴۷ء میں رلبرگ کے پولیس حکام نے ایک کیس کی تفتیش میں
مجھ سے مدد مانگی۔ ڈونگ نامی ایک کان کُن ڈیوٹی سے فارغ ہو کر
گھر جا رہا تھا کہ کسی نے اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ پولیس حکام نے
مقتول کا کوٹ دے کر مجھ سے قاتل کے متعلق دریافت کیا، تو
مَیں نے اُنھیں بتایا کہ قاتل ایک ادھیڑ عمر کا مونچھوں والا شخص
ہے جس کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے اور وہ عینک لگاتا ہے۔
میری باتیں سُن کر پولیس افسر بولا:

"تم نے یقیناً ہمارے کسی اہل کار سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔
جس شخص کی نشانیاں تم نے بیان کی ہیں اُسے تو ہم گرفتار بھی
کر چکے ہیں اور وہ مقتول کا باپ ہے۔"

"قتل کا مقصد یہ تھا کہ قاتل مقتول کی بیوی حاصل کرنے
کے لیے اُسے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔" مَیں نے کچھ اور
تفصیل مہیا کی۔

"یہ بات تو رلبرگ کا بچّہ بچّہ جانتا ہے ۔۔۔"

"تو پھر آلۂ قتل کہاں ہے؟" میرے اس سوال کا پولیس کے
پاس کوئی جواب نہ تھا، مگر مَیں نے پُورے اعتماد کے ساتھ کہا:
"مقتول کے مکان کی چھت پر سے آلۂ قتل مل جائے گا۔"

پولیس نے جا کر چھت کا جائزہ لیا تو پرنالے میں سے
بندوق برآمد ہُوئی جس میں کارتوس کے دو خول تھے اور بندوق
پر قاتل کی انگلیوں کے نشان بھی مل گئے۔ اُس شخص کو عمر قید کی
سزا ہُوئی۔

اُسی سال بیلجیم کے قصبے برگراٹ کی پولیس نے بھی مجھ سے ایک قتل کی تفتیش کے سلسلے میں مدد مانگی۔ ایک روز مقامی کیتھولک پادری کے گھر سے راہ گیروں نے اُس کی بوڑھی ملازمہ کی چیخیں سُنیں۔ اُنہوں نے اندر جا کر دیکھا تو پادری کی لاش ایک طرف پڑی تھی اور اُس کی خادمہ کرسی کے ساتھ بندھی تھی۔ اُس کا بیان تھا کہ ڈاکو پادری کو قتل کر کے اُسے باندھ کر چلے گئے۔ قتل کا الزام بڑھیا نے اُن دو اجنبیوں پر لگایا جو اُسی روز چند گھنٹے قبل کاروبار کے لیے پادری سے رقم ادھار مانگنے آئے تھے۔ اُس چھوٹے سے قصبے میں پولیس نے اُنہیں فوراً ڈھونڈ نکالا اور گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

پادری کو اپنے ایک دولت مند رشتے دار سے ترکے میں خاصی دولت ملی تھی اور اُس کی وصیت کے مطابق اُس دولت کا بیشتر حصہ بوڑھی خادمہ کو ملنا تھا، لیکن خادمہ سے بعض اختلافات کی بنا پر پادری نے اپنی وصیت تبدیل کرنے کا ارادہ بھی کئی لوگوں پر ظاہر کر دیا تھا۔ ان حقائق نے کیس کو اُلجھا دیا۔ اس مرحلے پر پولیس نے میری مدد طلب کی۔ مقتول پادری کے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے محسوس ہُوا کہ دونوں اجنبی بے گناہ ہیں اور بڑھیا اس قتل میں ضرور ملوث ہے۔ مقتول اور بڑھیا کی اشیا کو چھونے سے حقیقت مجھ پر عیاں ہو گئی۔

گزشتہ کئی برس سے پادری اپنی خادمہ کے نوجوان بیٹے کی مالی اعانت کرتا رہا تھا۔ اب اُس نے یہ سلسلہ بند کر دیا تھا۔ قتل کے روز بڑھیا کے بیٹے نے آ کر اصرار کیا کہ جو دولت پادری کی وفات کے بعد اُس کی ماں کو ملنے والی تھی، اُس کا کچھ حصہ اپنی زندگی ہی میں دے دے۔ پادری نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو ہاتھا پائی ہوئی۔ بوڑھے پادری کا سر آہنی انگیٹھی سے ٹکرایا اور وہ چل بسا۔ اب ماں بیٹے نے الزام سے بچنے کے لیے دو اجنبیوں کے قتل میں ملوث ہونے کی کہانی گھڑی۔ ایک مفلر مقتول کی گردن کے گرد کس کر لپیٹا اور پھر اُتار کر پھینک دیا تا کہ یہ گمان ہو کہ موت گلا گھٹنے سے واقع ہوئی ہے۔

اتنا کچھ کرنے کے بعد بیٹے نے ماں کو کرسی سے باندھا اور خود وہاں سے غائب ہو گیا۔ اُس کے جاتے ہی ماں نے شور مچا کر راہگیروں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

پولیس میری فراہم کردہ معلومات سے بہت متاثر ہوئی۔ مکان میں تلاشی لینے پر خون آلود مفلر بھی مل گیا۔ اب بڑھیا کے لیے اعترافِ جرم کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا، مگر اس دوران میں اُس کا بیٹا جنوبی امریکہ جا چکا تھا۔ بڑھیا کے دل و دماغ پر پادری کی موت کا اتنا اثر ہُوا کہ اُس کے اعصاب جواب دے گئے اور اُسے ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کرانا پڑا۔

اس کے فوراً بعد میرا واسطہ ایک ایسے کیس سے پڑا جس میں مجھے بتانا تھا کہ مرنے والا طبعی موت مرا بھی ہے یا نہیں۔

اپریل [illegible] میں کارنیلس نام کا ایک شخص بیلجیم کے شہر گینٹ سے لاپتہ ہو گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں وہ بیلجیم کی زیرِ زمین تنظیم کا سرگرم اور نڈر کارکن رہا تھا۔ اُس کے اہلِ خاندان اور دوستوں نے پولیس کو اُس کی گمشدگی سے مطلع کیا، لیکن پولیس اُس کا پتہ چلانے میں ناکام رہی۔

کارنیلس کی گمشدگی کے دو ہفتے بعد دریائے لائی میں چلنے والی ایک لانچ کے کپتان نے جب لنگر اُٹھایا تو اُس کے ساتھ ایک لاش بھی کھنچی ہوئی تھی جسے کپتان نے پولیس کے سپرد کر دیا تھا۔ لباس اور جیبوں سے ملنے والے کاغذات کے مطابق یہ کارنیلس کی لاش تھی۔ اُس کی کھوپڑی کچلی ہوئی تھی، لیکن پولیس سرجن یہ بتانے سے قاصر تھا کہ کھوپڑی کی یہ حالت موت سے پہلے ہوئی یا بعد میں۔ لاش کا بائیں پاؤں کا جوتا بھی غائب تھا۔

پولیس کا خیال تھا کہ کارنیلس کی موت کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے، مگر مرنے والے کے خاندان والے اس سے متفق نہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جنگ کے دوران میں کارنیلس نے نازیوں اور اُن کے مقامی معاونین کی دُشمنی مول لے لی تھی اور اُنھی میں سے کسی نے اُسے قتل کر کے لاش دریا میں پھینک دی۔

اتفاق سے اُنھی دنوں میں گینٹ میں اپنی غیب دانی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ لوگوں کو جس کسی کے متعلق کچھ معلوم کرنا ہوتا، وہ اُس کا بند لفافے میں فوٹو مجھے پکڑا دیتے۔ مَیں یہ لفافے کھولے بغیر مطلوبہ معلومات فراہم کر دیتا۔ اسی طرح جب ایک لفافہ مجھ تک پہنچا تو میں نے لانے والے شخص کو روک لیا اور اُسے بتایا کہ تصویر ایک ایسے شخص کی ہے جو ڈوب کر نہیں مرا تھا بلکہ اُسے قتل کیا گیا ہے۔

شو ختم ہونے کے بعد مَیں چند افراد کے ہمراہ پولیس اسٹیشن گیا۔ وہاں سے مقتول کا دائیں پاؤں کا جوتا لے کر مَیں نے اپنے ہاتھ سے ٹٹولا، تو معلوم ہُوا کہ کارنیلس کے قاتلوں کا تعلق ہالینڈ کے شہر بریڈا سے ہے۔ ہم نے وہاں جاکر پولیس کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ تھے، لیکن مَیں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ مجھے بریڈا کی پولیس سے کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ بہرحال کچھ سوچ کر مَیں نے پولیس سے نازیوں کے ایجنٹوں کی تصویریں طلب کرلیں۔ پولیس نے تصویریں مہیا کر دیں تو مَیں نے اُن میں سے کارنیلس کے قتل میں ملوث دو افراد کی نشاندہی کر دی۔ اب یہ دونوں مجرم بیلجیم کے شہر اینٹورپ جا چکے تھے جہاں سے اُنھیں گرفتار کر کے گیلنٹ لے جایا گیا۔ مقدمے کی کارروائی سے معلوم ہُوا کہ دونوں قاتل نازیوں کے ایجنٹ تھے اور جنگ کے بعد کارنیلس کی نشاندہی پر اُنھیں جیل بھجوا دیا گیا تھا جیل سے رہا ہوتے ہی اُنھوں نے کارنیلس کو ٹھکانے لگا دیا عدالت نے اُن دونوں کو سزائے موت دی۔

*

مَیں نے پہلی دفعہ ایک بڑے مجمع کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ فرانس میں کیا۔ اس کا انتظام ریٹائرڈ فوجیوں کی تنظیم نے فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے کیا تھا۔ فرانسیسی اخبارات میرے کمالِ فن سے بہت متاثر ہُوئے اور اُنھیں مطمئن کرنے کے لیے مجھے ایک پریس کانفرنس بھی بلانا پڑی۔

میری ان سرگرمیوں نے فرانسیسی پولیس کو بھی متوجہ کر لیا اور ایک روز پیرس کے ایک پولیس افسر نے فون پر مجھے بتایا کہ مَیں نے پرمٹ کے بغیر تفریحی پروگرام میں حصہ لے کر قانون کی خلاف ورزی کی ہے، لیکن فون پر گفتگو کے دوران ہی مجھے پتہ چل گیا کہ دراصل پولیس کا مقصد کچھ اور ہے۔ وہ بذاتِ خود میرے کمالات کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے؛ چنانچہ اس مقصد کے لیے اُسی روز شام چار بجے کا وقت مقرر ہُوا۔ مَیں جب وہاں پہنچا، تو ہال نصف سے زیادہ بھرا ہُوا تھا۔ کارروائی کا آغاز ہونے تک مزید ساٹھ ستر افراد آکر خاموشی سے نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ حاضرین میں بیس جج اور پولیس کے ڈائریکٹر بھی شامل تھے۔

فون پر مجھ سے بات کرنے والا پولیس افسر اپنی نشست سے اُٹھا اور بولا: "مسٹر ہرکوس! ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہے۔ ہم اُس کے متعلق آپ کو کچھ نہیں بتائیں گے اور آپ بھی کوئی سوال نہیں کریں گے۔ ہم آپ کی غیب دانی کی صلاحیت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے ایک چھوٹی سی میز پر رکھی ہُوئی پانچ چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔ مَیں نے میز کی طرف نظر دوڑائی تو وہاں کنگھا، قینچی، گھڑی، سگریٹ لائٹر اور بٹوا پڑے ہُوئے تھے۔ مَیں نے باری باری اُن پانچوں کو ہاتھوں سے چھوا اور کہا:

"ان میں سے صرف تین چیزوں کا تعلق آپ کو درپیش مسئلے سے ہے۔ مجھے سفید کوٹ میں ملبوس ایک گنجے سر والا آدمی نظر آرہا ہے۔ وہ ڈاکٹر یا انجینیئر ہے۔ مجھے ریل کی پٹڑی اور پہاڑی بھی نظر آرہی ہے۔ پہاڑی سے نیچے جاکر چند درخت اور ایک چھوٹا سا مکان ہے۔"

پھر مَیں نے پنسل سے کاغذ پر ریل کی پٹڑی، پہاڑی اور مکان کا نقشہ بنا کر حاضرین کے سامنے رکھ دیا، لیکن کسی نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔

"مَیں مویشیوں کا باڑہ بھی دیکھ رہا ہُوں۔ مکان اور باڑے کے وسط میں ایک لاش پڑی ہے۔ یہ ایک عورت کی لاش ہے اُسے گولی مار کر ہلاک نہیں کیا گیا۔ لاش کے پاس دُودھ کی بوتل پڑی ہے گنجے سر والا آدمی حوالات میں بند ہے۔ قاتل وہی ہے۔"

کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا حاضرین خاموشی سے میری باتیں سُن رہے تھے۔ بالآخر مَیں بولا:

"حوالات میں بند آدمی فوت ہو چکا ہے۔ بس مجھے اتنا معلوم ہو سکا ہے۔"

لمحے بھر کے لیے سب خاموش رہے اور پھر جیسے یکدم وہ خواب سے بیدار ہو کر پُورے جوش و خروش سے باتیں کرنے لگے جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ مَیں آزمائش میں پُورا اُترا ہُوں۔

ہنگامہ ذرا سا تھما تو وہی پولیس افسر اُٹھا اور بولا: "بیشتر تفصیلات درست ہیں۔ مقتولہ کو اُس کے خاوند نے دُودھ کی بوتل میں زہر ملا کر دیا تھا، مگر یہ کہنا غلط ہے کہ ملزم مر چکا ہے۔ وہ اس وقت

حفاظت حوالات کی کوٹھڑی میں بند ہے۔"

چند روز بعد اُسی پولیس افسر نے مجھے فون پر بتایا کہ مجرم نے گلے میں پھندا ڈال خودکشی کر لی تھی۔

اس واقعے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک شب تقریباً ایک بجے پولیس نے فون کر کے مجھے قصرِ انصاف بُلایا۔ مَیں ٹیکسی لے کر پہنچا تو وہاں اُنہوں نے پچاس چوروں کی تصویریں دے کر مجھ سے اُن مجرموں کی شناخت کرنے کو کہا جنھوں نے پچھلی روز پہلے ایک لبنانی کے ۲۶ لاکھ فرانک مالیت کے ہیرے ہتھیا لیے تھے۔ اس سلسلے میں پولیس نے تین مشتبہ افراد حراست میں لے لیا تھا، لیکن ہیروں کا سُراغ نہ ملا تھا۔

مَیں نے تمام تصویریں اُلٹے رُخ میز پر پھیلا دیں اور ہر ایک کو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے چھونے لگا۔ پھر اُن میں سے تین تصویریں علیحدہ کر کے مَیں بولا:

"آپ حضرات نے ان تین افراد کو گرفتار کیا ہے لیکن اس جرم میں پانچ افراد ملوث ہیں — چار مرد اور ایک عورت۔"

اس کے بعد مَیں نے دو اور تصویریں نکالیں اور کہا:

"اصل مجرم یہ دو ہیں۔ ان میں سے ایک اس وقت پیرس میں موجود ہے، لیکن ہیرے اُس کے پاس نہیں۔ دوسرا مجرم بذریعہ ٹرین مارسیلز جا چکا ہے۔ وہ ہیرے اپنے ہمراہ لے گیا ہے اور ملک سے بھاگنے کی فکر میں ہے۔ مَیں اُسے مارسیلز میں ایک جنوبی امریکی ملک کے سفارت خانے میں ویزا لینے جاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔"

ہیروں کا مالک ایک لبنانی تھا جو دس سال سے پیرس میں رہائش پذیر تھا۔ تین برس سے پیرس کی ایک حسینہ بھی اُس کے ساتھ رہتی تھی۔ اب لبنانی نے اپنے وطن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنی گرل فرینڈ سے کہا تھا کہ ہیرے فروخت کر کے وہ اسے اتنی رقم دے گا جو زندگی بھر گزر اوقات کے لیے اُسے دے گا۔

واردات کے روز لبنانی بریف کیس میں ہیرے لے کر گھر سے چلا۔ راستے میں پولیس کے دو سپاہیوں نے اُسے روکا اور قصرِ انصاف لے گئے۔ وہاں اُنہوں نے اُس کو ایک ذیلی کمرے میں بٹھایا اور بریف کیس اپنے افسرِ اعلیٰ کو دکھانے کے بہانے لے گئے۔ مگر جب دیر تک وہ نہ لوٹے تو لبنانی کو فکر ہوئی اور وہ اُنہیں ڈھونڈنے نکلا۔ سارا قصرِ انصاف چھان مارا مگر کہیں ہاتھ نہ آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ وہ دونوں پیرس پر جرمنی کے قبضے کے وقت پولیس افسر تھے، لیکن بعد میں اُنہیں سبکدوش کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے فوراً لبنانی کی گرل فرینڈ کو تفتیش میں شامل کر لیا اور اس واردات میں ملوث ہونے کے الزام میں تین اور اشخاص گرفتار کیے جن میں سے ایک بے گناہ تھا۔

میرے انکشافات کے اگلے روز ایک پولیس افسر نے مارسیلز جا کر ہیرے لے جانے والے مجرم کو تلاش کیا تو معلوم ہُوا کہ دو روز قبل ہی اُس نے جنوبی امریکہ کے ایک ملک کا ویزا لیا، رات ایک قحبہ خانے میں گزاری اور ایک ماہی گیر کشتی کے ذریعے مارسیلز سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆☆

۱۹۵۲ء کا موسمِ خزاں شروع ہو چکا تھا۔ مَیں اُن دنوں میڈرڈ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہُوا تھا۔ ایک شب مَیں نے خواب میں دیکھا کہ میرے وطن میں مویشی اور مکانات پانی میں گھر گئے ہیں۔ دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ہالینڈ کی سرزمین کو ایک خوفناک سیلاب نے آ لیا۔ اسپین میں ہالینڈ کے سفارت خانے نے سیلاب زدگان کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم چلائی اور اس سلسلے میں مجھ سے بھی ایک شو منعقد کرنے کی درخواست کی۔ یہ شو کامیاب بنانے کے لیے اسپین کی حکومت نے ہر ممکن تعاون کیا۔ صدر فرانکو کی بیوی خود شو دیکھنے تشریف لائیں اور حکومت نے تماشائیوں کے لیے مشروبات مفت فراہم کیے۔

اس شو کے اگلے ہی روز صدر کے سیکرٹری نے مجھے فون کیا اور جنرل فرانکو کے ذاتی معالج ڈاکٹر کارلوس کی رہائش گاہ پر چیدہ چیدہ لوگوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کو کہا۔ اُسی روز پانچ بجے شام کا وقت مقرر ہُوا۔ ہم وہاں پہنچے تو بڑے ہال میں اعلیٰ حکام اور معززینِ شہر جمع تھے۔ سب سے آخر میں جنرل اور سینورا فرانکو تشریف لائے اور اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اپنے طور پر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس تقریب کا اہتمام سینورا

فرانکو نے کیا ہے جو اپنے شوہر کو بھی زبردستی کھینچ لائی تھیں۔
اس مظاہرے کا آغاز کرتے ہوئے مَیں نے سینورا فرانکو سے کاغذ پر کچھ لکھنے کی درخواست کی جسے دیکھے بغیر ہی مَیں نے بتا دیا کہ اسپین کی خاتونِ اوّل نے کوئی عدد لکھا ہے۔ تھوڑے وقت کے بعد مَیں نے وہ عدد بھی صحیح بتا دیا پھر موصوفہ نے ایک انگوٹھی مجھے پکڑائی جسے ہاتھ میں لے کر مَیں نے احتیاطاً اُن کی نجی زندگی اور خیالات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، لیکن اُس دُکان کا ٹیلیفون نمبر بتا دیا جہاں سے وہ انگوٹھی خریدی گئی تھی۔ یہ چھ ہندسوں والا پیچیدہ نمبر تھا جن میں سے میرے بتائے ہوئے پانچ ہندسے بالکل صحیح نکلے۔

جنرل فرانکو اس کارروائی میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہے تھے اور بڑی بے چینی سے اس کے ختم ہونے کے منتظر تھے، اس لیے مَیں نے تقریب کو مزید طول دینا مناسب نہ سمجھا اور مجلس برخواست کر دی گئی۔

اسپین میں اپنے قیام کے دوران میں ایک روز بذریعہ ریل میڈرڈ جا رہا تھا کہ مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے مجھ سے پہلے ہٹلر بھی اس علاقے سے گزر چکا ہو۔ یہ جنگ ختم ہونے کے طویل عرصے بعد کی بات معلوم ہوتی تھی۔ مَیں اُسے ایک پادری کے بھیس میں سفر کرتے ہُوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت یعنی ۱۹۵۲ء میں وہ اسپین میں موجود نہیں تھا، لیکن وہ اسپین کے مذکورہ علاقے میں خاصا عرصہ ٹھہرنے کے بعد کہیں اور گیا تھا اور مَیں اُسے مرا ہُوا نہیں دیکھ رہا تھا۔ مَیں نے اپنی اس دریافت سے اسپین کے چند اخبار نویسوں کو آگاہ کیا، تو اگلی ہی شب دو آدمی ملنے آئے۔ اُن میں سے ایک رابرٹ اسٹرنر تھا اور دوسرا لیون ڈیگرے۔ یہ دونوں ہٹلر کے بہت قریب رہ چکے تھے اور جنگ کے بعد فرار ہو کر اسپین چلے آئے تھے۔ "اگر تم ہٹلر کے متعلق ایسی افواہیں اُڑانے سے باز نہ آئے، تو گولی سے اُڑا دیے جاؤ گے۔" اسٹرنر نے دھمکی دی اور پھر وہ دونوں چلے گئے، تاہم اسپین میں میرے بقیہ قیام کے دوران میں اسٹرنر مسلسل میری نگرانی کرتا رہا۔ دن ہوتا یا رات مَیں جب بھی ہوٹل سے نکلتا، اُسے اپنا منتظر پاتا۔ مَیں محسوس کرتا ہُوں کہ ہٹلر زندہ ہے، نہ جانے کیوں مجھے اُس کی موت کا یقین نہیں آیا۔
پیرس سے واپسی کے کچھ دن بعد مجھے ہیگ میں متعینہ ہندوستانی سفیر کا خط ملا۔ ہندوستان میں امیر والدین کا ایک نوعمر بیٹا لاپتہ ہو گیا تھا۔ سفیر نے مجھ سے وہ لڑکا ڈھونڈنے کے سلسلے میں مدد مانگی تھی۔ مَیں ابھی اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ میری والدہ کو بھی اسی نوعیت کا ایک خط ملا جو گمشدہ لڑکے کے والد نے لکھا تھا۔ اس خط کے ہمراہ لڑکے کے بالوں کی ایک لٹ بھی تھی۔ اب مَیں نے پریشان حال والدین کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ مَیں ہیگ جا کر ہندوستانی سفیر سے ملا اور لڑکے کی گمشدگی کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں۔ یہ لڑکا ایک شام دریائے گنگا میں اشنان کرنے گیا تھا کہ پھر واپس نہیں آیا۔ دریا کے کنارے اُس کے کپڑے اور جُوتے پڑے ملے تھے۔ مَیں نے جب لڑکے کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے مس کیا، تو معلوم ہُوا کہ وہ دریا میں نہیں ڈُوبا اور زندہ تھا اور بمبئی میں ایک سرکس میں کام کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے والدین کو خط بھی لکھے تھے، لیکن اُنہیں ڈاک کے حوالے نہیں کر پایا تھا۔ ہندوستانی سفیر کو ان حقائق سے آگاہ کر کے مَیں پیرس چلا آیا۔ تین ماہ بعد لڑکے کے والدین کا خط ملا کہ اُن کا بیٹا بمبئی سے مل گیا ہے اور جب مَیں نے اُس کا اتا پتہ بتایا تھا، واقعی وہ سرکس میں کام کر رہا تھا۔

❦

حادثے کے بعد دس برس تک مجھے یہی خدشہ رہا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاید مَیں اپنی خداداد صلاحیت سے محروم ہو جاؤں گا، مگر اس میں کمی آنے کے بجائے بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔
۱۹۵۵ء میں میرا واسطہ ایک نرس کی گمشدگی کے معاملے سے پڑا۔ اس سلسلے میں پولیس ناکام ہو چکی تھی اور کیس فائل کر دیا گیا تھا۔ یہ سات برس قبل کا واقعہ تھا، لیکن اُس نرس کے گاؤں کے لوگ اس واقعے کو بُھول نہیں پائے تھے اور ایک دن مجھے سویڈن کے اُس چھوٹے سے گاؤں سے بیک وقت نو خط ملے جن میں یہ استدعا کی گئی تھی کہ مَیں اس معاملے میں دلچسپی لوں۔
قصّہ یہ تھا کہ ۱۹۴۸ء میں ہفتے کی ایک شام نرس اپنے والد اور سوتیلی والدہ سے ملنے گاؤں گئی۔ جب وہ سوموار کو اپنی ڈیوٹی پر حاضر نہ ہُوئی تو ہسپتال والوں نے فون پر اُس کے والد سے براہِ راست دریافت کیا۔ والد نے بتایا کہ اُس کی بیٹی

اتوار کی شام ہی کو اُس سے لڑ جھگڑ کر بس سے واپس چلی گئی تھی۔ تحقیقات کرنے پر پتہ چلا کہ بشمول بس ڈرائیور کسی نے بھی اُس روز اُسے نہیں دیکھا۔ پولیس نے تو اپنے طور پر تفتیش کر کے کیس فائل کر دیا تھا، لیکن افواہوں کا سلسلہ نہ رکا۔ نرس کا والد اپنے کمینے پن اور بربریت کی وجہ سے بہت بدنام تھا۔ ایک پڑوسی نے تو کھلم کھلا اُس پر اپنی پہلی بیوی کے قتل کا الزام بھی لگایا تھا جس پر نرس کے باپ نے ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کیا، لیکن مقدمہ ہار گیا۔ گاؤں بھر میں مشہور تھا کہ اُس کی بیٹی اُس کے ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے نرس بن گئی تھی۔

سویڈن کے ایک اخبار کو جب اس معاملے سے میری دلچسپی کا علم ہوا تو اُس نے مجھے اُس لڑکی کی چند تصاویر فراہم کر دیں۔ اُن تصاویر کو ہاتھ میں لیتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ نرس کو قتل کیا گیا ہے۔ مَیں نے کاغذ پر اُس جگہ کا نقشہ بھی بنا دیا جہاں اُس کی لاش فرش کے نیچے دفن تھی۔ قاتل بندر نما شخص تھا اور بندر ہی کی طرح چلتا تھا۔

اب مَیں نے متعلقہ گاؤں جانے کا فیصلہ کیا اور اخبار والوں کے ہمراہ پانچ سو میل کا سفر کر کے وہاں پہنچا۔ منزلِ مقصود سے نصف میل اِدھر ہی مَیں کار سے اُتر کر پیدل چل دیا اور اپنی مخصوص صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے جائے واردات تلاش کرنے لگا۔ اپنی اسی دھن میں گاؤں کی گلیوں میں گزرتا ہوا مَیں ایک چھوٹے سے مکان تک پہنچا جس سے کچھ دُور مویشیوں کا ایک باڑہ بھی تھا۔ نرس کو اسی مکان میں قتل کیا گیا تھا۔ مَیں نے دروازے پر دستک دی تو ایک بندر نما شخص نے دروازہ کھولا جو مقتولہ کا باپ تھا۔ مَیں نے اُس کی بیٹی کو تلاش کرنے کے سلسلے میں اپنے تعاون کی پیشکش کی تو وہ بادلِ نخواستہ مجھے اپنے مکان کے اندر لے گیا۔

"تمہاری بیٹی قتل کر دی گئی ہے اور مَیں اُس کے قاتل کو تلاش کرنے آیا ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ میری بیٹی مری نہیں۔"

تب مَیں نے اُسے بتایا کہ ہفتے کی شام باپ بیٹی کا جھگڑا کیسے ہوا اور کس طرح اُس نے اپنی بیٹی کو قتل کیا تھا۔ مَیں نے یہ بھی بتایا کہ مَیں مقتولہ کے سر سے خون بہتے دیکھ رہا ہوں جسے قتل کرنے کے بعد اُس کی لاش باڑے میں لکڑی کے تختوں کے نیچے دبا دی گئی تھی۔

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

"مَیں ذرا تمہارے باڑے کا جائزہ لے لوں تو کیا حرج ہے۔ اگر تم نے قتل نہیں کیا تو گھبرانے کی بات ہی نہیں۔"

"بھلا مَیں کیوں گھبرانے لگا ___ تم باڑے میں توڑ پھوڑ کرنا ہی چاہتے ہو تو میرے نقصان کی تلافی کے لیے ایک لاکھ کرونر پیشگی ادا کر دو۔"

"میرے پاس اتنی رقم کہاں؟"

"پھر مَیں تمہیں اپنے باڑے میں توڑ پھوڑ کرنے کی اجازت نہیں دُوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ اور پھر کبھی ادھر کا رُخ نہ کرنا۔"

مجبوراً مجھے ناکام لوٹنا پڑا، تاہم اگلے ہی روز اخبار کے مالکان نے پیشکش کی کہ اگر وہ بُوڑھا پلیس کو باڑے کی تلاشی لینے کی اجازت دے دے تو وہ ایک لاکھ کرونر ادا کر دیں گے۔

اس مرتبہ گاؤں بھر کے مرد و زن ہمارے پیچھے پیچھے چلے۔ ابھی ہم اُس مکان سے کچھ فاصلے ہی پر تھے کہ لوگوں کے شور غل سے اُسے صورتِ حال کا علم ہو گیا اور وہ رائفل ہاتھ میں لیے مکان سے باہر میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

"مَیں رقم لے آیا ہوں اب ہم باڑے کی تلاشی لے کر ہی جائیں گے۔" یہ بات سُنتے ہی وہ غصّے سے بپھر گیا۔ اُدھر میری چھٹی حس نے خطرے کا احساس دلایا اور مَیں نے ہاتھ بڑھا کر رائفل کی نالی کا رُخ اُوپر کر دیا۔ اُسی لمحے گولی میرے سر کے اُوپر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ دھماکے کی وجہ سے میرا ہاتھ زور سے میری ناک پر لگا اور خون بہنے لگا۔ لوگوں نے سمجھا کہ مجھے گولی لگ گئی اور وہ مجھے دھکیلتے ہوئے ایک طرف کو لے گئے۔ قاتل اپنے مکان کے سامنے کھڑا مُکّے لہرا رہا تھا۔ اُس کی رائفل کا رُخ اب بھی میری طرف تھا۔

وہ جس مکان اور زمین کا مالک تھا قانوناً ہمیں اُس میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ اُس کے خلاف ہمارے پاس کوئی شہادت بھی نہ تھی جو تلاشی کا وارنٹ جاری کروانے کا جواز بن سکتی۔ بہرحال مَیں اُسے اپنی ہی بیٹی کا قاتل سمجھتا تھا اور اس

بارے میں اخبارات کو بے ضرورت معلومات نہ فراہم کر دیا۔ مجھے
توقع تھی کہ اخبارات میں اس نوعیت کی خبر چھپے۔ وہ میرے خلاف
ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کرے گا اور میں ... پہلے نے تفتیش
از سرِ نو شروع کروا سکوں گا، لیکن قاتل نے خاموش رہنے ہی
میں اپنی عافیت سمجھی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ میں کسی ... کو سلجھانے کی
کوشش میں کسی اور پیچیدہ مسئلے کی تہ تک پہنچ گیا۔ ایسا ہی
ایک واقعہ مجھے اپنی نئی زندگی کے ابتدائی ایام میں پیش آیا۔ ایک
روز ہالینڈ کے ایک دولت مند اور بااثر ... پرست کی بیوی
نے مجھے اپنے بنگلے پر بلایا اور چند مہمانوں کے سامنے اپنی صلاحیت
کا مظاہرہ کرنے کی دعوت دی۔ اس محفل ... میں نے اپنی
معاون سے کہا کہ مہمانوں کے پاس جا کر ان کی ذاتی اشیا لے
آئے۔ وہ یہ چیزیں لے آئی تو میں نے باری باری متعلقہ چیزوں
کی مالک شخصیتوں کے متعلق انکشافات کرنا شروع کر دیے جو
سب کے سب درست ثابت ہوئے۔ پھر میں نے چاندی
کی ٹرے میں پڑی ہوئی ایک زرد چیز کو چھو کر کہا:

"یہ اس گھر کی مالکہ کا لاکٹ ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ اگلے
ہفتے وہ کونسی تقریب منائے گی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"آپ اگلے ہفتے اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ منائیں
گی۔"

حاضرینِ مجلس تحسین آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے،
لیکن اس کا خاوند بولا:

"یہ کونسی مشکل بات ہے۔ آج ہی کے اخبار میں تو یہ خبر
چھپی ہے۔"

اب اس کی بیوی کو اسے میرے کمال کا معترف کرنے
کی سوجھی، چنانچہ اس نے فوراً اپنے خاوند کے ہاتھ سے سگریٹ
کیس لے کر میری طرف اچھال دیا جسے پکڑتے ہی مناظر میری
نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ یہ مناظر ایک دوسرے کے
ساتھ خلط ملط ہو رہے تھے، تاہم چند لمحوں کے بعد حقیقتِ حال
واضح ہوتی چلی گئی اور میں بے خودی کے عالم میں بولنے لگا:

"تم کیسے آدمی ہو؟ تم تو اپنے سولہ ہم وطنوں کے قاتل ہو۔"

اس انکشاف پر اس کا چہرہ غصے سے ایک دم سرخ ہو
گیا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا:

"تم کوئی پاگل معلوم ہوتے ہو۔ لاؤ میرا سگریٹ کیس مجھے
واپس کر دو۔" یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف بڑھا، مگر دو ہی قدم
چل کر فرش پر گر پڑا، لیکن میری زبان نہ رک سکی۔

"یہ غدار ہے۔ ہماری حکومت نے اسے وطن پرست سمجھا
اور اعزازات سے نوازا، لیکن اس نے ہمیں دھوکا دیا اور
نازیوں کے ساتھ مل گیا۔ بظاہر وہ اس کی فیکٹریوں پر قابض تھے،
جبکہ درپردہ وہ خود ہی ان کا مالک و مختار تھا۔"

اس مرحلے پر اس کی بیوی چلائی: "وہ مر چکا ہے۔ اور اس
کی موت کے ذمے دار تم ہو۔"

"میں نے بالکل سچ کہا ہے۔"

اگرچہ مجھے اپنے انکشاف کی صداقت کا مکمل یقین تھا، مگر
اس کا ثبوت فراہم کرنے میں مجھے پانچ برس لگ گئے۔ وہ واقعی
وطن کا غدار تھا اور درپردہ جرمنوں کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ ہالینڈ
کی زیرِ زمین تنظیم کے سولہ ارکان کو اسی نے گسٹاپو کے ذریعے گولی
سے مروایا تھا۔

انتہائی پیچیدہ اور الجھے ہوئے جرائم کے بارے میں
انکشافات سے میری شہرت دور دور تک پھیل گئی جس سے
متاثر ہو کر صنعت کار بھی میری خدمات سے استفادہ کرنے
لگے۔

اس سلسلے میں میرا واسطہ سب سے پہلے ایک شیشہ ساز
فیکٹری کے مالکوں سے پڑا۔ اس کارخانے کی بھٹیوں کو نامعلوم کارکن
سبوتاژ کر رہا تھا۔ ایک بھٹی میں شیشہ پگھلاتے وقت کوئی ایسا
کیمیکل پھینک دیا جاتا جس سے اس میں تیار ہونے والے شیشے کا
رنگ سبزی مائل ہو جاتا اور یہ نہ صرف کاروبار میں نقصان کا
سبب بن رہا تھا بلکہ متاثرہ بھٹی بھی کسی کام کی نہ رہتی تھی۔ میں نے
کارخانے میں جا کر متعلقہ جگہ کا جائزہ لیا اور ایک رات کا کچھ حصہ
بھی وہاں گزارا۔ نتیجتاً میں مجرم کا پتہ چلانے میں کامیاب ہو گیا
اور کارخانے کے مالکان کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ فی الحال مزید کارروائی

نہیں کرے گا، لیکن دو ماہ بعد ایک اور بھٹی کو سبوتاژ کرے گا، اس لیے سخت نگرانی کی ضرورت ہے۔

فیکٹری کے مالکوں نے میری بات مان لی اور ٹھیک دو ماہ بعد مجرم کو رنگے ہاتھوں پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

اب مجھے ہر مہینے تقریباً بارہ سو خطوط مل رہے تھے کہیں مجھ سے اپنے کسی معاملے کو سلجھانے کے لیے مدد کی درخواست ہوتی تو کوئی مخفی خزانہ تلاش کرنے کے لیے میری مدد کا خواہاں ہوتا، یا پھر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث افراد کی طرف سے اُن کے کاروبار میں شامل ہونے کی پیشکشیں ہوتیں۔

انہی دنوں مجھے ایک خط امریکہ کی ریاست مین کے شہر گلینکو سے ملا۔ یہ راؤنڈ ٹیبل فاؤنڈیشن کے ڈاکٹر پُہارِچ نے لکھا تھا۔ وہ انسانی دماغ کی نفسیاتی صلاحیتوں پر تحقیق کر رہا تھا اور اس کام کے لیے جدید ترین سہولتیں اُسے حاصل تھیں۔ اُس نے مجھے چھ ماہ اپنے ساتھ گزارنے کے لیے بلایا تھا۔ مجھے خود اس کام سے دلچسپی تھی؛ چنانچہ بلا تاخیر امریکہ روانہ ہو گیا۔

فاؤنڈیشن کی لیبارٹری اٹھارہ کمروں پر مشتمل ایک وسیع عمارت میں واقع تھی۔ اس عمارت کا نقشہ ہو بہو ویسا ہی تھا جیسا ڈاکٹر پُہارِچ کے خط پر ہاتھ رکھتے ہی میری نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا درحقیقت میں نے ایک کاغذ پر بنا بھی لیا تھا، تاہم لیبارٹری کا ابتدائی جائزہ لینے کے بعد مجھ پر ایک خوف سا طاری ہو گیا۔ ہر طرف کیمیکل، رقی تاریں اور دماغی لہریں ماپنے کے آلات نظر آ رہے تھے۔ ایک رف کونے میں مکعب شکل کا ایک بڑا سا بکس رکھا تھا۔ اُس کو ڈاکٹر ہارِچ نے فیراڈے کا پنجرہ نام دے رکھا تھا۔ اُس کی بیرونی سطح پر نبے کی ایک باریک جالی بہت نفاست سے لگی ہوئی تھی جس ں سے دو لاکھ پچاس ہزار وولٹ کی برقی رو گزر سکتی تھی۔ اس س کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ اُس کے اندر موجود انسان کو بجلی کا شکا نہیں لگتا تھا۔ اس پنجرے کے ذریعے زیرِ تجربہ انسان کا بیرونی یا سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کر کے اُس کی چھٹی حس اور غیر معمولی سیاتی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔

تجربات کا آغاز دماغی لہریں ماپنے والی مشین سے کیا گیا۔ ے ساتھ ہیری نام کا ایک اور شخص بھی اس کام میں شریک رہا۔ ڈاکٹر پُہارِچ یا ہیری کمرے میں ایک طرف میز لگا کر بیٹھ جاتے۔ اس میز پر پلاسٹک کے کچھ ڈبے پڑے ہوتے میں اُن سے کچھ فاصلے پر ایسی ہی ایک اور میز پر اس طرح بیٹھ جاتا کہ پہلی میز پر رکھے ہوئے ڈبے مجھے نظر نہ آتے۔ خود میری میز پر بھی ایسے ہی ڈبوں کا ایک سیٹ پڑا ہوتا۔ پھر مجھے اُن ڈبوں کو شناخت کرنے کو کہا جاتا جن کو اُن دونوں میں سے کوئی ایک اِدھر اُدھر ہلاتا یا اپنے دل ہی میں کسی ڈبے کے متعلق سوچتا۔ بعض اوقات میں دس میں سے آٹھ ڈبے شناخت کر لیتا اور کبھی دس میں سے صرف چار۔ مائع نمونوں کو بھی ہم نے آزمایا۔ پانچ ٹیسٹ ٹیوبوں میں بطخ، مرغ، انسان اور کُتّے کا خون اور سرخ رنگ کا محلول بھر کر رکھ دیے گئے اور میں نے ستر فیصد تک صحیح شناخت کر لیے۔

ایسے ہی تجربات ہم نے گتّے کے کارڈوں پر کیے۔ اُن پر مختلف اشکال بنی ہوتیں یا کوئی عدد درج ہوتا۔ پہلے روز میں اُن میں سے کوئی بھی شناخت نہ کر سکا۔ اگلے روز میرے نصف کارڈ درست نکلے۔ تیسرے دن پچاس میں سے اتالیس اور چوتھے دن ستائیس کارڈ صحیح شناخت کیے، مگر پانچویں روز نتیجہ پھر صفر نکلا۔

ان تجربات سے ڈاکٹر پُہارِچ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ میرا ان چیزوں کی صحیح شناخت کر لینا کوئی اتفاقی بات نہ تھی اور جب ایک مخصوص قسم کی روشنی کی شعاعوں کا رُخ میری آنکھوں کی طرف کیا جاتا، تو میری غیب دانی کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا۔ چونکہ مجھے یہ صلاحیت سر میں چوٹ آنے کے بعد عطا ہوئی تھی، اس لیے ڈاکٹر پُہارِچ اتفاقی چوٹ اور غیب دانی کی صلاحیت میں تعلق کی نوعیت معلوم کرنے کا خواہاں تھا، لیکن وہ اس مقصد میں ناکام رہا اور میں ہالینڈ لوٹ آیا۔

چند ماہ بعد ڈاکٹر پُہارِچ نے مزید چھ ماہ کے تجربات میں حصہ لینے کے لیے بلا بھیجا اور میں بلا تاخیر اُس کے پاس پہنچ گیا۔ تجربات کی نوعیت کم و بیش حسبِ سابق ہی تھی، تاہم اس مرتبہ ڈاکٹر پُہارِچ مجھے ساتھ لے جا کر سائنسدانوں اور ماہرینِ نفسیات کے سامنے میری غیب دانی کے مظاہرے کرواتا رہا۔ ایسے ہی ایک اجلاس میں چیئرمین نے مجھے ایک بازو بند دے کر اُس کے بارے میں پُوچھا۔ میں نے فوراً بتا دیا کہ وہ بازو بند ایک حبشی عورت کی ملکیت رہا تھا جو نارتھ کیرولینا کے کھیتوں میں کپاس چُنا کرتی

تھی اور اُسے ۶۰ء۱۹ یا ۷۰ء۱۹ کے لگ بھگ اور سیڈ نے مار مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ چیئرمین نے میری مہیا کردہ معلومات کو درست تسلیم کیا اور صرف اتنی تصحیح کی کہ اُس کی موت ۱۸۰۰ء میں واقع ہُوئی تھی۔

پھر اُس نے میرے ہاتھ میں دھات کا بھدا سا ٹکڑا تھما دیا۔ اس ٹکڑے سے مجھے کسی کی شخصیت کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا، لیکن جو کچھ مجھے محسوس ہُوا، اُس کا اظہار مَیں نے اس طرح کیا:

"مَیں گرد و غبار کے بادل دیکھ رہا ہُوں۔ دھماکہ بھی ہُوا ہے۔ کسی شخص یا عمارت کو اس دھماکے سے نقصان نہیں پہنچا۔ صرف دھماکہ اور اُس کے فوراً بعد اُٹھنے والے عجیب و غریب بادل دکھائی دے رہے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ایٹم بم کا دھماکہ ہُوا ہے۔" بعد میں چیئرمین نے بتایا کہ دھات کا ٹکڑا ریاست نیواڈا کے اُس علاقے سے حاصل کیا گیا تھا جہاں ایٹمی تجربات کیے جا رہے تھے۔

لمحہ بھر کے لیے کسی چیز کو چھُونے سے مجھے ساری معلومات حاصل ہو جاتیں اور سارے مناظر میری نگاہوں کے سامنے پھر جاتے، بس اُن کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا۔

مَیں نے امریکی شہریت حاصل کر لی اور میامی میں اپنی بیوی اور بچّوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا۔ اُنہیں دنوں میامی ریڈیو کی مشہور شخصیت ایلن کورٹنی نے اپنے ایک پروگرام میں مجھے بُلایا۔ اس پروگرام میں مَیں نے آٹھ سامعین سے صرف ٹیلیفون پر بات کر کے اُن کے بارے میں درست انکشافات کیے۔ اُن میں سے ایک اپنی بیوی کے بارے میں پریشان تھا اور مَیں نے اُسے بتایا: "تمھاری بیوی ذہنی مریضہ ہے۔ اُس کے لیے نرس اور اپنے خاندانی معالج کو بلا لو اور اُسے تنہا مت چھوڑو، کیونکہ وہ تنہائی ملتے ہی خودکشی کر لے گی۔"

ایک روز میامی پولیس کے ٹام لائپ نے مجھے فون کیا: "پیٹر! گزشتہ رات ایک ٹیکسی ڈرائیور سر میں گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا ہے۔ ہمیں اس واردات کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا، تم ہی کچھ مدد کرو۔"

"مجھے ٹیکسی ڈرائیور کی تصویر چاہیے۔" مَیں نے کہا اور وہ اُسی وقت کیس کی فائل لے کر آ گیا۔ اُس میں مقتول کی تصویر بھی تھی۔ فائل ہاتھ میں لے کر مَیں نے خواب کی سی کیفیت میں بولنا شروع کیا:

"مَیں اُسے ہوانا جاتے اور واپس آتے ہُوئے دیکھ رہا ہُوں۔ قاتل بھی نظر آ رہا ہے۔ وہ ڈیٹرائٹ شہر کا رہنے والا ہے۔ اُس کا قد چھ فٹ اور جسم دُبلا ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک قتل کر چکا ہے۔ یہ شخص میامی میں گرفتار نہیں ہوگا، بلکہ کسی اور جگہ بینک ڈکیتی میں پکڑا جائے گا۔ اُس کے دو نام ہیں، لیکن عام طور پر اسمٹی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔"

"لیکن میری معلومات کے مطابق تو صرف ایک قتل ہُوا ہے۔" ٹام لائپ بولا۔

"نہیں۔ اس سے پہلے وہ ایک اور شخص کو قتل کر چکا ہے، لیکن میامی میں نہیں، کی ویسٹ میں۔ وہاں وہ ایک ریٹائرڈ کرنل کے گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہُوا ہی تھا کہ مالکِ مکان سامنے آ گیا اور نقب زن نے اُسے گولی مار دی۔ اُسی پستول سے اُس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ختم کیا ہے۔"

ٹام لائپ نے کی ویسٹ کی پولیس سے رابطہ قائم کیا، تو

پیاسا کوّا

حکایت ابنِ انشا

ایک پیاسے کوّے کو ایک جگہ پانی کا مٹکا پڑا نظر آیا۔ بہت خوش ہوا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ پانی بہت نیچے فقط مٹکے کی تہہ میں تھوڑا سا ہے۔ سوال یہ تھا کہ پانی کو کیسے اُوپر لائے، اپنی چونچ تر کرے۔ اتفاق سے اس نے حکایاتِ لقمان پڑھ رکھی تھیں۔ پاس ہی بہت سے کنکر پڑے تھے۔ اس نے اٹھا کر ایک کنکر اس میں ڈالنا شروع کیا۔ کنکر ڈالتے ڈالتے صبح سے شام ہو گئی۔ پیاسا تو تھا ہی نڈھال ہو گیا۔ مٹکے کے اندر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ کنکر ہی کنکر ہیں۔ سارا پانی کنکروں نے پی لیا ہے۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا: "ہت تیرے لقمان کی۔" پھر بے سُدھ ہو کر زمین پر گر گیا اور مر گیا۔

اگر وہ کوّا کہیں سے ایک نلکی لے آتا تو مٹکے کے منہ پر بیٹھا بیٹھا پانی کو کھینچ لیتا، اپنے دل کی مراد پاتا، ہرگز جان سے نہ جاتا۔

میری فراہم کردہ معلومات درست ثابت ہوئیں۔
بعد میں وہی قاتل ڈیٹرائٹ کے ایک بنک سے ملحقہ ریستوران میں ڈاکہ ڈالتے ہوئے پکڑا گیا۔

جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں میری غیب دانی کا ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جنوری ۱۹۵۹ء میں ریاست ورجینیا میں مسٹر اور مسز جیکسن مع اپنی دو بچیوں کے لاپتہ ہو گئے۔ انہیں آخری مرتبہ ۱۱ جنوری کو دیکھا گیا تھا۔ اگلے روز اُن کی کار اُن کے گھر سے آٹھ میل دُور راستے کی ایک جانب کھڑی ملی۔ گاڑی میں مسز جیکسن کا پرس اور بچیوں کی گڑیاں پڑی تھیں۔ پولیس نے تفتیش شروع کی، لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

۴ مارچ ۱۹۵۹ء کو جیکسن اور ڈیڑھ سالہ بچی جینٹ کی لاشیں جھاڑیوں کے ایک ڈھیر سے ملیں۔ جیکسن کو گولی مارنے کے بعد کسی وزنی ہتھیار سے سر اور گردن پر شدید ضربات لگائی گئی تھیں۔ اس کے اٹھارہ روز بعد مسز جیکسن اور دوسری بچی کی لاشیں بھی قریبی ریاست میری لینڈ کے جنگل سے دو لڑکوں کو شکار کے دوران میں مل گئیں۔ لاشیں ملنے کی دونوں جگہوں کا درمیانی فاصلہ ستر میل تھا۔ چونکہ واردات کا تعلق دو ریاستوں سے ثابت ہو گیا تھا اس لیے تفتیش وفاقی تحقیقاتی ادارے کے سپرد کر دی گئی۔ سال بھر میں وفاقی اور ریاستی حکام نے تقریباً پندرہ سولہ مشتبہ افراد سے پوچھ گچھ کی، لیکن مجرم کا پتہ نہ چل سکا۔ تب واشنگٹن کے ہسپتال کے ماہرِ نفسیات نے میری خدمات سے استفادہ کرنے کی ٹھان لی اور میری فیس اور اخراجات اپنی جیب سے ادا کرنے کی حامی بھر لی۔

جون ۱۹۶۰ء سے مَیں نے ڈاکٹر ریزنمین کی رفاقت میں کار ملنے کی جگہ، لاشیں ملنے کی دونوں جگہوں اور مقتولین کے گھر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بالآخر مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ قاتل پاگل تھا، اس نے مسٹر جیکسن کی کار صرف انہیں لُوٹنے کے لیے روکی تھی، لیکن جب چھوٹی بچی نے رونا شروع کر دیا، تو وہ اُن چاروں کو جبراً اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ راستے میں جیکسن اُس سے بحث میں اُلجھ گیا جبکہ بچی ابھی تک روئے جا رہی تھی۔ اس لیے قاتل نے پہلے اُن دونوں کو قتل کیا۔ اس کے بعد وہ کئی گھنٹے تک مسز جیکسن اور دوسری بچی کو لیے پھرتا رہا اور پھر اُنہیں بھی قتل کر کے لاشیں چھپا دیں۔ مَیں نے پولیس کو قاتل کی نشانیوں سے بھی آگاہ کر دیا۔ اُسے گرفتار کر کے دماغی امراض کے ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ بعد میں عدالت نے اُسے سزائے موت دی۔

میرے مداحوں نے اکثر مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مَیں اپنی غیب دانی اور دوسروں کے خیالات پڑھنے کے باوجود جوا کھیل کر یا ریس وغیرہ میں شرط بد کر رقم کیوں نہیں کماتا۔ مَیں خود بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس طرح بڑی دولت کما سکتا تھا، لیکن مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ صلاحیت اچھے کاموں کے لیے عطا کی ہے، صرف دولت کمانے کے لیے نہیں۔

میرے دوست احباب کو یہ معلوم کرنے کا بھی بہت اشتیاق رہا ہے کہ مَیں یہ سب کچھ کیسے کر پاتا ہوں اور اُن لمحات میں میرے دل و دماغ کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ کاش! مَیں اپنی غیب دانی اور نفسیاتی صلاحیت کا اظہار آسان اور قابلِ فہم زبان میں کر سکتا تاکہ دوسرے لوگ بھی میری طرح اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں۔ مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ ان لمحات میں مَیں دنیا اور اپنے گرد و پیش کو صرف اُس شخص کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں جسے میں وقتی طور پر اپنے ذہن پر طاری کر لیتا ہوں اور یہ لمحات وہ ہوتے ہیں جب میرا اپنی ذاتی زندگی اور خیالات سے رابطہ بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔ مَیں نے مجرموں، مظلوموں، قاتلوں اور مقتولوں کی نگاہوں سے ایسے ایسے دردناک مناظر کا مشاہدہ کیا ہے کہ رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ مَیں اپنی اسی صلاحیت کو حسبِ خواہش بروئے کار لانے پر بھی پُوری طرح قادر نہیں۔ ہاں، جب مَیں بالکل خالی الذہن ہوتا ہوں تو میری یہ حس نقطۂ عروج پر ہوتی ہے؛ البتہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ صلاحیت کسی نہ کسی حد تک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے اور جوں جوں وہ اُسے بروئے کار لاتا ہے کارکردگی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

خوفناک کہانی

میرا دل کھا لو

(سعید الدین)

اِس کہانی کے راوی محترم سعید الدین دہلی ہندوستان میں پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ہجرت کرکے پاکستان آگئے تھے۔ چند سال بعد پولیس سے ریٹائر ہوگئے اور اب بڑھاپا فراغت سے گزار رہے ہیں۔ عمر پولیس میں گزرنے کی وجہ سے جرائم اور سراغ رسانی میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے انہیں "حکایت" میں شائع ہونے والے دنیا کے عجیب و غریب جرائم" کے سلسلے کی اور جناب احمد یار خان کی کہانیاں پڑھنے کو دیں تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ایسی بے شمار بھی وارداتیں سنا سکتے ہیں جو ان کی نوکری کے دوران ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ بعض جرائم اتنے حیران کن ہوتے ہیں کہ خود پولیس کو یقین نہیں آتا کہ کسی انسان نے یہ جرم کیا ہے۔ انہوں نے ایک کہانی سنائی جو میں اُن کی زبان میں پیش کرتا ہوں۔

قیصر آباد ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ تھانے کا انچارج سب [illegible] ایک عیسائی تھا۔ بڑا سخت مزاج اور ظالم تھانیدار تھا۔ موقع محل دیکھ کر رشوت لیا کرتا تھا، لیکن کوئی واردات خطرے والی ہو تو بہت سختی کرتا تھا۔ ڈیوٹی کا پکا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ایک روز قیصر آباد کے ایک قریبی گاؤں سے یہ رپورٹ آئی کہ ایک روز پہلے ایک دودھ پیتا بچہ، عمر تین ماہ، مر گیا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بچہ تھا۔ شام کو اُسے دفن کر دیا گیا تھا۔ بچے کی ماں دوسرے دن صبح سویرے اپنے بچے کی قبر پر گئی۔ اس نے دیکھا کہ قبر کی شکل بُری طرح بگڑی ہوئی ہے۔ مٹی اندر کو دھنسی ہوئی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ قبر کھودی گئی ہے اور اسے جلدی جلدی سے پُر کیا گیا ہے۔

ماں گھر دوڑی گئی۔ گھر والوں کو بتایا۔ گھر والے قبرستان گئے۔ گاؤں کے چند اور آدمی بھی ساتھ چلے گئے۔ مختلف آدمیوں نے مختلف رائیں دیں۔ یہ کسی درندے کا کام نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ قبر بھری ہوئی تھی۔ آپس میں مشورہ کر کے انہوں نے قبر کھودی۔

دیکھا کہ مٹی لحد کے اندر بھی گئی ہوئی تھی۔ بچے کی لاش مٹی میں بنی ہوئی تھی۔ لاش باہر نکالی تو یہ دیکھا گیا کہ کفن جو لاش کے ساتھ بھی تھا کھلا ہوا تھا اور عجیب چیز یہ دیکھی گئی کہ بچے کی نیچے والی آخری پسلی سے پیٹ پھٹا ہوا تھا۔ چاقو یا چھری سے چیرا گیا تھا۔ یہ کسی انسان کا کام تھا۔

لاش وہیں قبر کے قریب پڑی رہنے دی گئی اور بچے کا باپ دو تین آدمیوں کے ساتھ تھانے آگیا۔

سب انسپکٹر جیمز مجھے ساتھ لے کر قبرستان میں گیا۔ پولیس والے لاشوں سے نہیں ڈرا کرتے۔ میں نے اس سے زیادہ بری حالت میں لاشیں دیکھی ہیں لیکن تین ماہ کے معصوم بچے کی لاش کا پیٹ چاک کیا ہوا دیکھا تو میرے دل پر عجیب سا بوجھ پڑ گیا۔

بچہ ایک ہی دن پہلے مرا تھا۔ اُس کا کلی جیسا چہرہ اتنا پیارا تھا جیسے مرا ہوا نہیں سویا ہوا ہو۔ حیرت اس پر تھی کہ لاش کو قبر سے نکال کر کس نے چیرا پھاڑا ہے۔ یہ شک پیدا ہوا کہ بچے کو قتل کر کے دفنایا گیا ہوگا۔ اس کی یہ وجہ ہو سکتی تھی کہ خاوند کو شک ہوگا کہ یہ بچہ اُس کا نہیں۔ یہ شک جیمز نے قبرستان میں رفع کر لیا۔ بہت سے لوگوں نے بتایا کہ بچہ بخار سے مرا ہے۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوائی گئی۔ پتہ چلا کہ بچے کا دل غائب ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کسی نے قبر کھود کر بچے کی لاش نکالی اور پسلیوں کے نیچے سے سینہ چاک کر کے دل نکالا ہے۔ پھر اُس نے لاش لحد میں رکھ کر اینٹیں نہیں رکھیں، قبر مٹی سے بھر دی۔

سب انسپکٹر جیمز نے یہ فیصلہ دیا کہ کسی نے کوئی ٹونہ کیا ہے۔ آپ ہندوؤں کی توہم پرستی اور ٹونے وغیرہ سے واقف نہیں ہوں گے۔ ہندوؤں کے اکثریتی علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں نے بھی ان کی کئی بیہودہ رسمیں اور ٹونے ٹوٹکے وغیرہ اپنا لیے تھے۔ مجھے بھی یہی شک تھا جو جیمز نے ظاہر کیا تھا۔ بے اولاد عورتیں کئی ایک ٹونے کیا کرتی تھیں جن میں ایک یہ تھا کہ ایک خاص قسم کے مرے ہوئے سانپ کے اُوپر ٹوکرا رکھ کر عورت ٹوکرے پر بیٹھ کر نہایا کرتی تھی۔ انسانی کھوپڑیوں کے ٹکڑے بھی دوائی میں استعمال ہوتے تھے۔ یہ ٹکڑے حاجت مند عورت کو خود قبرستان سے لانے پڑتے تھے۔ ایک ٹونہ یہ بھی تھا کہ دودھ پیتے بچے کی لاش پر ٹوکرا رکھ کر بے اولاد عورت کو ٹوکرے پر بیٹھ کر نہانے کو کہا جاتا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے کوئی بھی اپنے مرے ہوئے بچے کی لاش نہیں دیتا۔

اس حد تک خطرناک ٹونہ بھی بتایا جاتا تھا کہ بے اولاد عورت کسی کے نوزائیدہ بچے کو اپنے ہاتھوں قتل کرے اور اس کا خون پیئے۔ پسماندہ اور جنگلی لوگ اس قسم کے بھیانک ٹونے کر گزرتے تھے۔ ہندوؤں میں یہ خوفناک ٹونے زیادہ چلتے تھے لیکن مسلمانوں نے بھی ان پر عمل شروع کر دیا تھا۔ مسلمان چونکہ دلیر ہوتے ہیں اس لیے وہ لاشوں کی بے حرمتی بھی کر دیا کرتے تھے۔

میری سروس میں تین وارداتیں ہوئی تھیں جو الگ الگ کہانیاں ہیں۔ اب ایک بچے کی مدفون لاش کا دل نکال لیا گیا تو یہی سمجھا گیا کہ یہ کسی بے اولاد عورت کا کام ہے لیکن عورت کتنی ہی دلیر کیوں نہ ہو وہ کسی بچے کا دل نہیں نکال سکتی۔ لاش رات کے دوران نکالی گئی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ رات کے وقت قبرستان میں جانے سے لوگ ڈرتے ہیں، مگر اس واردات میں تو لاش نکالی گئی اور اس کی چیر پھاڑ کی گئی تھی۔ لہٰذا یہ کام کسی دلیر آدمی کا تھا۔

ہمیں معلوم تھا کہ سنیاسی اور سادھو وغیرہ جو اکثر خانہ بدوش رہتے تھے قبرستانوں سے انسانی ہڈیاں اُٹھا لے جایا کرتے تھے۔ یہ سنیاسی وغیرہ عموماً ویرانوں میں غاروں اور گپھوں میں رہتے تھے۔ حاجت مند اُن کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ ان کا تعلق صرف ہندو مذہب کے ساتھ ہوتا تھا۔ ہندو عورتیں، خصوصاً بے اولاد ہندو عورتیں ان کی بہت ٹہل سیوا کرتی تھیں اور بے حیائی کی حد تک انہیں خوش رکھتی تھیں۔ افسوسناک بات یہ دیکھنے اور سننے میں آئی کہ بعض مسلمان بھی ان کے معتقد ہو جاتے تھے۔

سب انسپکٹر جیمز نے رپورٹ (ایف۔ آئی۔ آر) لکھ کر بھجوا

کو دو کام دیتے۔ ایک یہ کہ متعلقہ گاؤں میں اُس بے اولاد عورت کو تلاش کریں جو اولاد کے لیے پریشان ہو اور ٹونے اور تعویذ وغیرہ کر رہی ہو۔ دوسرا کام یہ کہ تمام علاقے میں گھومیں پھریں۔ اگر کہیں سنیاسی یا سادھو ڈیرے ڈالے ہوئے ہوں تو فوراً اطلاع دیں۔ گاؤں چھوٹا نہیں تھا لیکن یہ گاؤں ہی تھا۔ کسی کے گھر کے حالات کسی سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ ایک ہی دن میں ایک بے اولاد عورت کے متعلق پتہ چل گیا کہ اُس نے نہ کوئی خانقاہ چھوڑی ہے نہ کوئی پیر فقیر چھوڑا ہے اور وہ سنیاسیوں، سادھوؤں اور پنڈتوں کے پاس بھی جاتی رہتی تھی۔

اُس کے متعلق، اُس کے خاوند کے متعلق اور اُس کے خاندان کے سب افراد کے متعلق رپورٹیں لی گئیں۔ کسی رپورٹ سے یہ شک نہیں ہوتا تھا کہ اس خاندان کا کوئی فرد یا یہ عورت اس قسم کا بھیانک جرم کر سکتی ہے۔ جیمز نے گہری چھان بین کی لیکن یہ عورت بے گناہ نکلی۔ مجرم یا مجرمہ کسی دوسرے گاؤں کی بھی ہو سکتی تھی۔ مخبروں سے کہا گیا کہ وہ ارد گرد کے چھوٹے بڑے گاؤں میں بے اولاد عورتوں کو تلاش کریں۔ مسلمانوں کے عامل اور پیر بھی تھے۔ ہمارے علاقے میں ان کی تعداد آٹھ یا نو تھی۔ ان پر بھی نظر رکھی گئی۔ مخبروں سے کہا گیا کہ وہ ان کے پاس یہ مراد لے کے جائیں کہ ان کے اولاد نہیں ہوتی، کوئی تعویذ دیں یا کوئی ٹونہ بتائیں۔

ایک مخبر اطلاع لایا کہ متعلقہ گاؤں سے کوئی ایک میل دور کھنڈ تالوں، چٹانوں اور ٹیلوں کا علاقہ ہے۔ وہاں ایک ٹیلے میں قدرتی غار ہے۔ اس میں پانچ سادھو ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ خانہ بدوش سادھو سارے جسم پر راکھ مل کر رکھتے تھے۔ اکثر ننگے بھی رہتے تھے۔ سر پر انہوں نے موٹے موٹے مصنوعی بال چپکائے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ لوگ جڑی بوٹیوں کی دوائیاں بھی بناتے تھے۔ بہرحال یہ عجیب مخلوق تھی جو ہندوستان میں اب بھی اُسی طرح موجود ہے جس طرح میرے زمانے میں ہوتی تھی۔

جیمز نے ان پانچ سادھوؤں پر شک کیا لیکن اُن پر چھاپہ مارنے کی بجائے اُن کے پاس ایک مخبر عورت کو بھیجنے کا ارادہ کیا۔ ہمارے ہاتھ میں ایک جوان اور بڑی اچھی شکل و صورت والی مخبر عورت تھی۔ وہ ایک غریب سے مسلمان کسان کی بیوی تھی۔ اس کا خاوند بھی اپنی بیوی کی طرح بہت چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ ان کے دو یا غالباً تین بچے تھے۔ اس عورت کو تھانے بلا کر سب انسپکٹر جیمز نے یہ کام دیا کہ وہ سادھوؤں کے پاس بے اولاد عورت بن کر جائے اور ان پر یہ ظاہر کرے کہ وہ امیر عورت ہے اور اولاد کی خاطر وہ منہ مانگا انعام دے سکتی ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ وہ ان سے ٹونے ٹوٹکے معلوم کرے۔ اگر وہ خود ہی تازہ مرے ہوئے دودھ پیتے بچے کا دل نکال کر اُسے استعمال کرنے کا ٹونہ بتائیں تو ٹھیک ہے۔ اگر نہ بتائیں تو اُن سے کہے کہ اُس نے سُنا ہے کہ دودھ پیتے بچے کا دل کسی ٹوٹکے میں استعمال ہوتا ہے۔

اس عورت کو واردات کا علم تھا۔ اپنے کام کی وہ اُستاد تھی۔ اُسے زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ چلی گئی۔ اُسی شام کو جب شام اندھیری ہو چکی تھی وہ تھانے میں آئی۔ میں تو اُسے پہچان نہیں سکا۔ اُس نے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ منہ دُھلا دھلایا تھا اور چمک رہا تھا۔ وہ کسی آسودہ حال گھر کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کا عام حلیہ ایک غریب کسان کی بیوی جیسا ہوتا تھا جس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اُس کے جسم سے گوبر اور مٹی کی بدبو آیا کرتی تھی، لیکن اُس شام کو وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ جیمز کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے وہ سادھوؤں کے پاس امیر عورت بن کر گئی تھی۔ اتفاق سے اُس کی شکل و صورت اچھی تھی اور جوان بھی تھی، اس لیے اس قیمتی لباس میں وہ غریب اور کسان لگتی ہی نہیں تھی۔

جیمز اُسے اندر لے گیا۔ میں ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ مجھے ایسا رُتبہ حاصل نہیں تھا کہ مجھے دفتر میں بٹھا کر ایس۔ ایچ۔ او اس عورت سے رپورٹ لیتا۔ بعد میں مجھے اتنا ہی پتہ چلا تھا کہ وہ سادھوؤں کے پاس گئی تھی۔ اُس نے اُن کے آگے رونے کی اداکاری بھی

کی تھی اور اس نے سادھوؤں پر اعتبار جما لیا تھا۔ وہ دوسرے دن بھی سادھوؤں کے پاس گئی اور شام کو اس نے تھانے میں آکر رپورٹ دی۔ سادھوؤں نے اسے کوئی ٹونہ بتایا تھا۔ ابھی مرے ہوئے بچے کے دل کا راز سامنے نہیں آیا تھا۔ اسے اگلے روز بھی جانا تھا۔ وہ شام کو تھانے میں نہ آئی۔ جیمز اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ نہ آئی تو ہم سمجھے کہ وہ پیدل چلتے چلتے تھک گئی ہو گی۔ گھر جا کر سو گئی ہو گی۔ صبح آجائے گی۔

صبح اس کی بجائے اس کا خاوند آیا۔ اسے دیکھتے ہی جیمز نے اس سے پوچھا۔ "تم آگئے ہو، تمہاری بیگم صاحبہ کیوں نہیں آئیں؟"

خاوند کے چہرے پر گھبراہٹ اور حیرت آگئی۔ اس نے کہا "میں تو اسے یہاں دیکھنے آیا تھا۔ کیا وہ یہاں نہیں ہے؟"

جیمز نے اسے بتایا کہ وہ تھانے میں نہیں آئی۔ خاوند نے بتایا کہ وہ گذشتہ شام اسے یہ بتا کر گھر سے نکلی تھی کہ سادھوؤں نے اسے اس وقت آنے کو کہا ہے جب سورج اندر یا باہر ہو۔ وہ گھر واپس نہیں آئی۔ وہ تھانے میں بھی نہیں آئی تھی۔ وہ بچی تو نہیں تھی کہ راستہ بھول گئی ہو۔ وہ یقیناً اغوا ہو گئی تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ اسے کوئی اغوا کر کے کہیں دور لے جا کر فروخت کر دیتا۔ جیمز دانشمند آدمی تھا۔ اس نے یہ شک ظاہر کیا کہ سادھوؤں کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ عورت مخبر ہے اور بچے کے دل کی سراغرسانی کے لیے ان کے غار میں جاتی ہے۔ اس قسم کے سادھوؤں میں جرائم پیشہ آدمی بھی ہوا کرتے تھے۔ جیمز نے کہا کہ یہ عورت سادھوؤں کے ساتھ دل کے ٹونے کی بات کر بیٹھی ہو گی۔ اس سے انہیں اس پر شک ہوا ہو گا۔

جیمز نے اسی وقت سادھوؤں پر چھاپہ مارنے کا انتظام کر لیا۔ آگے آگے دیہاتی لباس میں مخبر بھیجے تا کہ وہ سادھوؤں پر نظر رکھیں اور اگر وہ چھاپے سے پہلے ہی بھاگنے کی کوشش کریں تو انہیں پکڑ لیں۔ وہ علاقہ ایسا تھا کہ دور سے نظر نہیں آسکتا تھا کوئی آ رہی ہے۔ چھاپہ مارا گیا۔ میں بھی ساتھ تھا۔ تمام سادھو غار میں موجود تھے۔ جیمز نے انہیں غار سے باہر نکال دیا۔ یہ غار اونچا تھا۔ چونکہ یہ مٹی کے ٹیلے میں تھا اس لیے اسے اندر سے کھود کر کچھ وسیع اور اتنا بلند کر دیا گیا تھا کہ اچھے قد کا آدمی اندر کھڑا ہو سکتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور غار تھا۔ ہم نے ان کے سامان کی تلاشی لی۔ مرے ہوئے سانپ اور بچھو بھی برآمد ہوئے۔ پچھلے غار میں گئے۔ وہیں کوئی مشکوک چیز نہ ملی۔

سادھوؤں کا جو مہا سادھو یا مہنت تھا وہ جیمز کو اپنی مخصوص زبان اور مخصوص انداز سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جیمز عیسائی تھا۔ وہ ان کے جنتر منتر اور پھونکوں سے نہ ڈرا۔ اگر جیمز ہندو ہوتا تو ان سادھوؤں کا اتنا احترام کرتا کہ ان پر ہاتھ ہی نہ ڈالتا۔ اور اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس ڈر سے سادھوؤں پر چھاپہ نہ مارتا کہ ہندو اسے اپنے مذہب کی توہین کا مسئلہ بنا لیں گے۔ جیمز نے اپنی عادت کے مطابق کوئی پرواہ نہ کی۔ اس نے مہا سادھو کو الگ کر لیا اور کہا۔ "تمہارے پاس تین دنوں سے ایک عورت آ رہی ہے۔ وہ کہاں ہے؟"

"ہمارے پاس ہر روز عورتیں آتی ہیں"۔ سادھو نے جواب دیا۔ "اور اتنی زیادہ آتی ہیں کہ میں کسی کو چہرے سے پہچان نہیں سکتا کہ یہ بھی یہاں آئی ہے۔" اس نے ایسے بے نیاز اور بے پرواہ سے انداز سے باتیں کیں جیسے اسے عورتوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔

جیمز نے اسے مخبر عورت کا حلیہ بتا کر پوچھا۔ "وہ کل شام یہاں آئی تھی۔ یہیں بتا دو کہ اسے کہاں غائب کر دیا ہے تو میں معاملہ یہیں ختم کر دوں گا۔ اگر تھانے میں چل کر بتاؤ گے تو اغوا اور جبری آبروریزی کے جرم میں دس سال کے لیے جیل بھجوا دوں گا۔"

مہا سادھو نے پھر بھی انکار کیا۔

جیمز نے تھانیداروں کی طرح کہا۔ "سب کو تھانے لے چلو۔"

غار کے پہرے پر دو کانسٹیبل کھڑے کر کے ہم سادھوؤں کو تھانے لے گئے۔ وہاں بڑے سادھو کو یاد آ گیا اُس نے کہا۔ "یہ عورت شام کو آئی تھی۔ اُسے یہ عمل بتایا تھا کہ آدھی رات کے وقت دریا میں اُس جگہ کھڑی ہو جائے جہاں پانی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور درمیان میں خشکی ہوتی ہے۔ اُسے پڑھنے کے لیے کچھ بتایا تھا۔ وہ سورج غروب ہونے کے بعد چلی گئی تھی۔"

"اُس سے تم نے کوئی رقم لی تھی؟" جیمز نے پوچھا۔

"صرف بیس روپے۔" سادھو نے جواب دیا۔ "اُس نے وعدہ کیا تھا کہ مراد پوری ہو گئی تو ایک ہزار روپیہ دوں گی۔"

اس دوران اسسٹنٹ سب انسپکٹر بشمبر داس ایک اور سادھو کو الگ لے گیا تھا، اور ایک کو میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ہم دونوں نے اُن سے اگلوانے کی کوشش کی مگر دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ بشمبر داس میرے پاس آیا اور پوچھا کہ تمہارے سادھو نے کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ یہ مجھے چکر دے رہا ہے۔ بشمبر داس نے کہا کہ اسے لے آؤ۔ ہم پہلے ایک کو اندر لے گئے اور پولیس کا پہلا ہی ہاتھ دکھایا تو اُس کی زبان کھل گئی۔ وہ تشدد کا پہلا وار ہی برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے پہلی بات یہ بتائی کہ وہ اصلی سادھو نہیں ہے۔ پھر اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ ان پانچوں میں کوئی ایک بھی سادھو اصلی نہیں۔ سب نوسرباز اور فریب کار ہیں۔

ہمارے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ یہ سب فراڈیے تھے۔ جس طرح ہمارے ملک میں جعلی پیر ہوتے ہیں اسی طرح ان سنیاسیوں اور سادھوؤں میں جرائم پیشہ لوگ بھی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اصلی سادھوؤں جیسی اداکاری کرتے اور انہی کی طرح باتیں کرنے کے ماہر ہوتے تھے۔ یہ ہندوؤں کو اسی طرح لوٹتے تھے جس طرح جعلی پیر مسلمانوں کو لوٹا کرتے ہیں۔

بشمبر داس نے دوسرے سادھو کو بلایا۔ اُس نے بھی پہلے حیل و حجت کی لیکن دوسرے سادھو کے کہنے پر مان گیا۔ یہ پانچوں مسلمان تھے۔ ان کا سرغنہ جو مہا سادھو بنا ہوا تھا جیمز کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔ پکا ڈھیٹ معلوم ہوتا تھا۔

میں اور بشمبر داس جیمز کے پاس گئے تو بشمبر داس نے اس سادھو سے کہا۔ "اب جانے دو استاد۔ تمہارے شاگرد مان گئے ہیں۔ ہم تمہیں اس جرم میں نہیں پکڑیں گے کہ تم نوسربازی کر رہے ہو۔ ہمیں تمہارے خلاف کوئی رپورٹ نہیں ملی۔ صرف یہ بتا دو کہ وہ عورت کہاں ہے۔"

بشمبر داس نے جب جیمز کو بتایا کہ اس کے دوسرے ساتھیوں نے کیا بیان دیا ہے تو جیمز غصے سے اُٹھا اور لپک کر مہا سادھو کے بال مٹھی میں پکڑ لیے۔ بال مروڑ کر اُسے اٹھایا اور بڑی زور سے اُسے فرش پر پٹخ دیا۔ وہ پیٹھ کے بل گرا تھا۔ جیمز اُس کے پیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ مہا سادھو بلبلا اٹھا اور چلانے لگا۔ "وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں سادھو نہیں ہوں۔"

اُس نے بتایا کہ یہ عورت اُن کے غار میں جاتی رہی ہے۔ گمشدگی کی شام بھی آئی تھی پھر چلی گئی تھی۔ سادھو نے کوئی نئی بات نہ بتائی۔ اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ اس عورت پر اُس کی نیت خراب تھی لیکن عورت اتنی چالاک تھی کہ آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ جیمز نے اِس پر بہت جرح کی۔ تشدد سے ڈرایا دھمکایا بھی مگر وہ اسی بیان پر قائم رہا جو وہ دے چکا تھا۔ پانچ چھ گھنٹے اسی ایک آدمی پر صرف ہو گئے۔ دوسرے سادھوؤں سے الگ الگ تحقیقات کی گئیں۔ انہوں نے بھی کوئی فالتو بات نہ بتائی۔ وہ اپنے جرائم کی پوری پوری بات سناتے رہے۔ مثلاً انہوں نے گِن کر دو ہندو عورتیں بتائیں جنہیں انہوں نے خراب کیا تھا۔ انہوں نے جو رقم بٹوری تھی وہ بھی بتائی۔ کچھ اور بدمعاشیاں بھی بتائیں۔ ہماری مخبر عورت کے متعلق انہوں نے یہی بتایا کہ اس سے بھی رقم بٹورنا اور اُسے خراب کرنا چاہتے تھے۔ اغوا یا قتل اُن کے جرائم میں شامل نہیں تھا۔ ان کے سرغنہ نے کہا کہ اُن

کے پاس بڑی خوبصورت لڑکیاں آتی رہتی ہیں۔ ان میں سے ایک دو کو آسانی سے غائب کر کے آگے چلایا جا سکتا تھا۔ قیمت بھی اچھی ملتی۔ یہ عورت اتنی قیمتی نہیں تھی۔

رات کو یہ یقین ہونے لگا کہ ان مجرموں نے عورت کو غائب نہیں کیا لیکن انہیں جانے نہ دیا گیا۔ اب یہ شک ہونے لگا کہ ہماری عورت شام کے بعد سادھوؤں کے غار سے نکلی اور راستے میں کسی رہزن یا بردہ فروش کے ہاتھ چڑھ گئی۔ ہمارے لیے ایک واردات کے ساتھ ایک اور واردات آگئی۔ ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس راستے سے واپس گئی تھی۔ پانچوں سادھو اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ بات کرتے اُن کی زبانیں کانپتی تھیں۔ ان میں سے ایک سادھو نے وہ سمت بتائی جدھر وہ گئی تھی۔ جیمز نے انہیں سوالوں کے جال میں پھنسا کر ایک کارآمد سراغ حاصل کر لیا۔ وہ یہ تھا کہ اس سادھو نے بتایا کہ عورت جب غار سے نکلی تو وہ باہر کھڑا تھا۔ اُس نے عورت کو اپنی نوسر بازی کے جال میں اچھی طرح پھانسنے کے لیے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ اُن کا مہا سادھو معجزے کر سکتا ہے اور یہ بھی کہ یہ سادھو جو بھی فرمائش کرے عورت پوری کر دے۔ اس سادھو نے یہ نئی بات بتائی کہ وہ پندرہ بیس قدم اُس کے ساتھ گیا پھر رُک گیا۔ عورت چلی گئی۔

سادھو کو کچھ دُور آگے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ ویرانے میں اور رات کی خاموشی میں آواز بڑی صاف تھی۔ کسی آدمی نے کہا۔ "اوئے۔ تم ادھر کیا لینے آئی تھی؟"

عورت نے ہنس کر کہا۔ "تم کدھر جا رہے ہو؟"

آدمی نے کہا۔ "اری نیک بخت۔ اکیلی جاؤ گی؟ چلو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

دونوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ سادھو اندھیرے میں دیکھ نہ سکا کہ وہ آدمی کون تھا۔ سادھو نے پہلے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ اس نے وجہ یہ بتائی کہ وہ پولیس سے ڈرتا تھا۔ سب انسپکٹر جیمز نے یہ شک بتایا کہ یہ آدمی اُس کا خاوند ہوگا۔ اُس نے عورت کو بدکاری کے شک میں قتل کر دیا ہوگا۔ اگر خاوند نہیں تھا تو کوئی ایسا آدمی ہوگا جسے یہ عورت اچھی طرح جانتی ہوگی۔ اُس وقت اُس کا خاوند تھانے میں موجود تھا۔ اُس سے پوچھا گیا کہ وہ رات گھر سے کہیں باہر گیا تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ وہ اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ اُس سے یہ بھی پوچھا گیا کہ گاؤں میں کون ایسا آدمی ہے جس کی اس کی بیوی کے ساتھ زیادہ بے تکلفی تھی۔ خاوند نے پانچ چھ نام بتائے۔

یہ مسئلہ تو الگ رہ گیا تھا کہ مرے ہوئے بچے کے سینے سے دل کس نے نکالا تھا، اس عورت کے اغوا کا مسئلہ پریشان کرنے لگا۔ جیمز نے دو کھوجیوں کو بلایا اور انہیں اُس جگہ لے گیا جہاں سادھو کے بیان کے مطابق عورت کو وہ آدمی ملا تھا۔ امید تھی کہ زمین کچھ رہنمائی کرے گی۔ میں بھی ساتھ تھا۔ سادھو بھی ساتھ تھا۔ اُس نے ہمیں اُس جگہ کھڑا کیا جہاں تک وہ مجرم عورت کے ساتھ گیا تھا۔ وہاں سے اُس نے وہ سمت بتائی جدھر سے اُسے آوازیں سنائی دی تھیں۔ ہم اُدھر گئے تو ایک جگہ دو کھرے پاؤں کے نشان، صاف دکھائی دیئے۔ کھوجی نے بتایا کہ عورت ایک آدمی کے ساتھ کھڑی رہی ہے۔ دوسرے کھوجی نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر کچھ کھرے تلاش کر لیے اور کہا کہ آدمی اس طرف سے آیا ہے۔ پھر آدمی اور عورت ایک طرف چل پڑے مگر آگے زمین دھوکہ دے گئی۔ آگے سخت والی زمین تھی، کچی مٹی نہیں تھی۔ چالیس پچاس قدم آگے گئے تو زمین کچی آ گئی۔ کھرے پھر مل گئے۔

تقریباً ایک سو گز تک یہ پتہ چلتا رہا کہ وہ دونوں اِدھر ہی کو جا رہے ہیں۔ آگے پھر زمین پتھریلی آگئی۔ کوئی دو فرلانگ دُور گدھ زمین پر اُتر رہے تھے۔ جیمز شک کی بنا پر اُدھر چل پڑا۔ ڈیڑھ ایک سو گز فاصلہ طے کیا تو اُدھر سے ایک کتا دوڑتا آیا۔ ہمارے قریب آکر اُس نے راستہ بدلا۔ اُس کے منہ میں کسی انسان کا ایک بازو تھا جو کہنی سے توڑا ہوا لگتا تھا۔ اس

کے ساتھ پورا ہاتھ تھا۔ ہمارے ایک کانسٹیبل نے پتھر اُٹھا کر کُتّے کو مارا۔ ہم سب نے کُتّے کو گھیرنے کی کوشش کی اور اُسے پتھر بھی مارتے رہے۔ اُس کے منہ سے بازو گر پڑا جو ایک کانسٹیبل نے اُٹھا لیا۔ یہ کسی عورت کا بازو تھا۔ کُتّا اُدھر سے آیا تھا جہاں گدھ زمین پر اُتر رہے تھے لیکن اُتر کر نظر نہیں آتے تھے۔ وہاں شاید کھڈ تھا۔

ہمیں جیمز اُدھر لے گیا۔ وہاں واقعی کھڈ تھا اور یہ کھڈ گدھوں سے بھرا ہُوا تھا۔ ہم نے پتھروں کی بوچھاڑیں مار مار گدھوں کو اُڑا دیا۔ کھڈ میں جو کچھ رہ گیا وہ بڑا ہی بھیانک تھا۔ یہ انسانی جسم یکھڈیوں کا پنجر تھا۔ سر الگ پڑا تھا۔ بال بتاتے تھے کہ عورت کا سر ہے۔ چہرہ خراب ہو چکا تھا لیکن اتنا نہیں کہ پہچانا نہ جا سکے۔ یہ ہماری مخبر عورت تھی۔ جسم کے باقی حصوں کی حالت یہ تھی کہ صرف ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ دونوں ٹانگیں اور بازو الگ ہو چکے تھے۔ ایک بازو کُتّا اُٹھا لے گیا تھا جو اب ہمارے پاس تھا۔ کہیں کہیں گوشت نظر آتا تھا۔ گدھوں نے صفایا کر دیا تھا۔ کھڈ میں ایک گڑھا تھا۔ یہاں مٹی کچی تھی۔ ہم دیکھتے ہی جان گئے کہ گدھوں نے لاش اس گڑھے سے نکالی ہے۔ گڑھا گہرا نہیں تھا۔

لاش کی حالت ایسی تھی کہ یہ معلوم کرنا ناممکن تھا کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا ہے اور قتل سے پہلے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔ اس عورت کا خاوند ساتھ تھا۔ اُس نے کپڑوں کے ٹکڑوں سے اور جُوتی سے بھی پہچان لیا کہ یہ ہڈیاں اور جسم کے ٹکڑے اُس کی بیوی کے ہیں۔ چہرے سے تو ہم سب نے پہچان لیا تھا۔ کھڈ میں انسانی ٹکڑا ایک بھی سلامت نہیں تھا۔ گدھوں، کُتّوں اور گیدڑ وغیرہ نے ٹکڑے مٹا دیئے تھے۔ ہڈیوں میں غور سے دیکھا تو زیورات کی دو تین چیزیں مل گئیں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل رہزن نہیں تھا، ورنہ وہ سونے کی انگوٹھی اور اتنے وزنی کانٹے چھوڑ کر نہ جاتا۔ قتل کی وجہ کچھ اور تھی۔ اور وجہ کیا تھی؟

پہلا مشتبہ خاوند تھا۔ دوسرا شک اُس آدمی پر تھا جس کے ساتھ اس عورت کے تعلقات تھے۔ سادھو نے اندھیرے میں جو باتیں سُنی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمی مقتولہ کے ساتھ بے تکلف تھا۔ ایک شک یہ بھی تھا کہ مقتولہ نے سادھوؤں سے بچے کے دل کا راز حاصل کر لیا تھا جسے چھپانے کے لیے انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ لاش کی ہڈیاں اور ٹکڑے اکٹھے کر کے ہم تھانے لے گئے اور ڈاکٹر کے پاس بھیج دیئے۔ مقتولہ کے خاوند اور پانچوں سادھوؤں کو مشتبہ قرار دے کر شاملِ تفتیش کر لیا گیا اور تفتیش کا سلسلہ چل پڑا۔

سادھوؤں سے پوچھا گیا کہ وہ بے اولاد عورتوں کو کیسے کیسے ٹونے بتایا کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے اوٹ پٹانگ ٹونے بتائے۔ جیمز نے پوچھا کہ کوئی ایسا ٹونہ بھی ہے جس کا تعلق دودھ پیتے بچے کے دل سے ہو؟ اس گروہ کے سرغنہ نے بتایا کہ انہوں نے سنا ہے کہ نرینہ بچے کا دل نکال کر کسی محلول میں رکھا جاتا ہے، پھر اسے پکا کر بے اولاد عورت کو کھلایا جاتا ہے۔ جیمز نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اُس نے کسی عورت کو یہ ٹونہ بتایا ہے اُسے تشدد کی چکی میں ڈال دیا مگر وہ انکار کرتا رہا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ سادھو نہیں جرائم پیشہ ہے۔

اُس گاؤں میں جہاں کے بچے کا دل نکالا گیا تھا ہمارے دو مخبر موجود تھے۔ غالباً دو روز بعد ایک مخبر نے تھانے آکر یہ اطلاع دی کہ اس گاؤں میں ایک عامل رہتا ہے جس کے قبضے میں جنات بتائے جاتے ہیں۔ اُس کے پاس ایک جوان عورت چارپائی پر رسیوں سے باندھ کر لائی گئی ہے۔ اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ چارپائی عامل کے گھر میں لے جائی گئی۔ لوگ باہر کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد اندر سے اس عورت کی چیخیں اُٹھیں اور اُس نے چلا چلا کر یہ بھی کہا۔۔۔ "میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا جاؤ"۔۔۔ اُس کا منہ شاید پھر بند کر دیا گیا تھا۔

بہت دیر بعد اُسے اُسی طرح چارپائی کے ساتھ باندھ

کرنے گئے۔ دُگرس نے معلوم کر لیا کہ وہ کونسے گاؤں سے لائی
گئی ہے۔ مُخبر نے وہ گاؤں بتایا تو میں نے سب انسپکٹر جیمز سے
کہا کہ ہمارا ایک کانسٹیبل ساجد علی اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔
یہ کانسٹیبل پندرہ دنوں کی چھٹی لے گیا تھا اور ایک ہی روز پہلے
واپس آیا تھا۔ کسی عورت کو اس حالت میں کسی عامل کے پاس
لے جانا کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ عورت پاگل ہو گی، ہسٹیریا کی مریضہ
ہو گی یا وہ جنات کے قبضے میں ہو گی لیکن جیمز کا دماغ ان الفاظ پر
اٹک گیا — "میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا جاؤ" — وہ عقل مند
آدمی تھا۔ اُس نے اس گاؤں کے رہنے والے کانسٹیبل کو بلایا اور
پوچھا کہ اُس کے گاؤں کی کس عورت کو اس قسم کی تکلیف ہے۔ جیمز
نے یہ نہ بتایا کہ عورت نے کیا کہا تھا۔ کانسٹیبل نے لاعلمی کا اظہار کیا۔
جیمز کا دماغ اس عورت پر اٹک گیا۔ عامل کو تھانے بلایا
جا سکتا تھا لیکن جیمز نے بشمبر داس سے کہا کہ وہ رات عامل کے
گھر جائے اور اُس سے معلوم کرے کہ اس عورت کو کیا عارضہ ہے۔
بشمبر داس کے ساتھ مجھے بھی جانا تھا۔ ہم اپنے پرائیویٹ کپڑوں
میں گئے۔ عامل سے ملے۔ اُسے بتایا کہ ہم کون ہیں۔ وہ بشمبر داس کو
جانتا تھا۔ یہ عامل ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ چہرے پر تراشی ہوئی داڑھی
تھی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اُس کی آنکھوں میں کوئی جادو تھا یا کیا اثر
تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کی نظریں میرے جسم سے پار ہو
رہی ہوں۔ کائیاں آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ دوائیاں بھی دیتا تھا اور تعویذ
بھی اور وہ جن نکالنے میں مشہور تھا۔

بشمبر داس نے اُس سے پوچھا: "آپ کے پاس جس عورت
کو لایا گیا تھا اُسے کیا تھا؟"

"اُس پر ایک بدمعاش جن کا قبضہ ہے۔" عامل نے جواب دیا۔
"نکل جائے گا۔"

بشمبر داس نے چند اور باتیں پوچھیں تو عامل نے اپنے مخصوص
انداز میں جواب دیئے۔ اُس نے وجدانی سے لہجے میں کہا۔ "ہم
نے دیو نکال دیئے ہیں۔ یہ تو معمولی سا جن ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"میں آپ سے اس عورت کی خیر خیریت معلوم کرنے نہیں
آیا۔" بشمبر داس نے اُسے کہا۔ "میں آپ سے مشورہ اور راہنمائی
لینے آیا ہوں۔ مجھے یہ بتائیں کہ یہ عورت پاگل تو نہیں؟"

"نہ جی۔" اُس نے جواب دیا۔ "سولہ آنے جن ہے۔"

"یہ دل کا کیا معاملہ ہے؟" بشمبر داس نے پوچھا۔ "کس کا دل
کس نے نکالا ہے اور کون کس کا دل کھانا چاہتا ہے؟"

عامل چونکا۔ اُس نے کہا۔ "آپ اس بچے والی واردات
کی تفتیش کے لیے آئے ہیں؟"

"جی!" بشمبر داس نے کہا۔ "مَیں اسی سلسلے میں آپ کی
مدد حاصل کرنے آیا ہوں۔ اگر آپ کے قبضے میں واقعی جن ہیں
تو انہیں حاضر کر کے پوچھیں کہ بچے کا دل کس نے نکالا ہے۔ مَیں
نے سُنا ہے کہ جن اس قسم کے معمّے حل کر دیا کرتے ہیں۔ اگر
آپ کے جن صرف دھوکہ ہیں تو مجھے اس سوال کا جواب دیں کہ
اس عورت نے یہ کیوں کہا تھا کہ میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا جاؤ؟"

عامل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ اُس
نے جنات کو حاضر کرنے کی بات نہ کی۔ بہت دیر بعد اُس نے سر
اُٹھایا اور کچھ دیر بشمبر داس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ بشمبر داس
بھی چُپ رہا۔ عامل کے چہرے پر کوئی اور ہی رنگ آ گیا تھا۔ اُس
نے آہستہ سے کہا۔ "مَیں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ آپ جنات
کو بھول جائیں۔ بچے کا دل اس عورت کے پیٹ میں گیا ہے۔"

"آپ یقین سے کہہ رہے ہیں؟" بشمبر داس نے پوچھا۔

"اپنے تجربے کی بنا پر مجھے یقین ہے۔" عامل نے جواب دیا۔
"آپ مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ میرے قبضے میں جن اور چڑیلیں ہیں
یا نہیں۔ میرے پاس تجربہ بہت ہے۔ مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ
اس عورت نے کوئی ایسی ویسی چیز کھائی ہے۔ اس کے ساتھ جو
آدمی آئے تھے انہوں نے یہ بتایا تھا کہ اسے اچانک 'پکڑ' ہو
گئی ہے لیکن عورت جو واہی تباہی بک رہی تھی اس سے پتہ
چلتا تھا کہ اُسے کوئی ایسی چیز کھلائی گئی ہے جس نے اُس کے دماغ

پر اثر کیا ہے، یا وہ کہیں سے ڈر گئی ہے۔ ایسا ڈر عموماً ویرانوں میں یا قبرستان میں دل پر سوار ہوتا ہے۔ اب آپ نے اس بچے کے دل کا ذکر کیا ہے تو مجھے کچھ شک ہونے لگا ہے۔ مجھے یہ کرامات میرے والدِ بزرگوار نے دی تھی۔ انہوں نے مجھے ایک آدمی کا واقعہ سنایا تھا۔ کسی سنیاسی نے اُسے کہا تھا کہ وہ مُردے کی کھوپڑی کا ایک تولہ ٹکڑا پیس کر مکھن میں ملا کر کھا لے۔ اس آدمی کو کوئی بیماری تھی۔ اُس نے قبرستان سے کسی بہت ہی پرانی قبر سے کھوپڑی نکالی اور اس کا ایک ٹکڑا گھر لا کر پیسا، پھر اسے مکھن میں ملا کر کھا گیا۔ رات کو وہ ڈر گیا اور چیخیں مارنے لگا۔ وہ چھپتا پھرتا تھا۔ دیواروں سے سر مارتا اور کہتا تھا "میرا سر توڑ دو۔ میری کھوپڑی توڑ دو......

"گھر والے اُسے میرے والد کے پاس لائے اور بتایا کہ اس نے انسانی کھوپڑی کھائی ہے۔ وہ ٹھیک نہیں ہو سکا۔ بڑی بُری حالت میں مر گیا تھا۔ یہ عورت بار بار کہتی تھی کہ میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا جاؤ۔ میں معلوم کر سکتا ہوں کہ اس عورت کی یہ حالت کیوں ہوئی ہے۔ میرے پاس ایک دوائی ہے جو اُسے سونگھا کر میں اُس کے دماغ پر تھوڑی سی دیر کے لیے قابو پا سکتا ہوں۔ اُس کے گھر والوں سے بھی پوچھنے کی کوشش کروں گا کہ اسے کیا کھلایا گیا ہے۔"

عامل نے صاف الفاظ میں تو کوئی ایسی بات نہ کہی لیکن اُس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے قبضے میں کوئی جن نہیں ہے اور جو کچھ اُس کے قبضے میں ہے وہ اس کا تجربہ اور قیافہ شناسی کا فن ہے۔ بشمبر داس نے اُس سے پوچھا کہ کوئی ایسا ٹونہ بھی ہے جس میں دودھ پیتے بچے کا دل استعمال ہوتا ہے؟

"یہاں کیا نہیں ہوتا۔" اُس نے جواب دیا۔ "زیادہ تر ڈٹے بے اولاد عورتیں کرتی ہیں۔ اگر میں سب کو بتا دوں کہ بے اولاد عورتیں کیسے کیسے جتن کرتی ہیں تو تمام بے اولاد عورتوں کو شاید اولاد مل جائے۔ جن عورتوں کو یہ دھمکی ملتی ہے کہ اُسے بچہ نہ ہوا تو

طلاق مل جائے گی وہ تو کسی کے معصوم بچے کا دل نکالنے کی بجائے اُس کی آنکھیں نکالنے کو بھی تیار ہو جاتی ہیں۔" اُس نے کہا: "کل مجھے اس عورت کے گاؤں بلایا گیا ہے۔ میں صبح جا رہا ہوں۔ دوپہر تک آپ مجھ سے جواب لے لیں۔"

"آپ کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ میں پولیس کا افسر ہوں۔" بشمبر داس نے کہا: "میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ آپ مجھے چکر دینے کی کوشش نہیں کریں گے۔ آج بھی آپ نے شروع میں مجھے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔"

"میں آپ کی آمد کا مقصد غلط سمجھا تھا۔" اُس نے کہا۔ "میں یہ سمجھا تھا کہ آپ اپنے کانسٹیبل کی بیوی کے متعلق فکر مند ہیں اور مجھے پولیس کا رعب دے کر یہ کہیں گے کہ میں اُس کا علاج توجہ سے کروں۔"

میں حیران ہُوا کہ یہ کونسے کانسٹیبل کی بیوی کا ذکر لے بیٹھا ہے۔ بشمبر داس نے پوچھا: "میں کسی کانسٹیبل کی بیوی کے متعلق فکر مند نہیں۔ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

عامل میری اور بشمبر داس کی حیرت پر حیران ہُوا اور بولا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ عورت آپ کے تھانے کے کانسٹیبل ساجد علی کی بیوی ہے؟"

حیرت زدگی سے بشمبر داس نے منہ کھول کر مجھے دیکھا اور میں نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ مجھے یاد آگیا کہ سب انسپکٹر جیمز نے ساجد علی سے پوچھا تھا کہ تمہارے گاؤں کی کس عورت پر آسیب سوار ہے۔ ساجد علی نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ ساجد علی کو شادی کئے نو دس سال گزر گئے تھے اور وہ بے اولاد تھا۔ وہ بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ وہ تعویذوں، مزاروں، پیروں اور خانقاہوں کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اب وہ پندرہ دنوں کی چھٹی لے کر گیا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک خانقاہ پر یا غالباً کسی نئے پیر کے پاس جائیگا۔

عامل کو بشمبر داس نے کچھ باتیں بتائیں اور ہم وہاں سے تھانے کو چل پڑے۔ میں نے راستے میں بشمبر داس کو یاد دلایا کہ کانسٹیبل ساجد علی بھی بے اولاد ہے اور پریشان رہتا ہے اور یہ بھی کہ اُس نے کہا تھا کہ اُسے معلوم نہیں کہ اُس کے گاؤں کی کسی عورت کو آسیب ہے۔ بشمبر داس نے بھی شک کا اظہار کیا۔ تھانے جا کر ہم نے جیمز کو پوری رپورٹ دی۔ اُس نے مجھے اور بشمبر داس سے کہا کہ ساجد علی کو نظر میں رکھا جائے اور اُسے کہیں باہر نہ جانے دیا جائے اگر وہ بتا دیتا کہ اُس کی بیوی کو کوئی پُراسرار تکلیف ہو گئی ہے تو اُس پر شک نہ کیا جاتا۔ اُس نے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال لیا۔

جیمز نے کہا: "مجھے کچھ ایسے نظر آرہا ہے جیسے بچے کے دل والا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ مگر اپنی مخبر کے قاتل کی تلاش محال نظر آتی ہے۔"

دوسرے دن کانسٹیبل ساجد علی نے مجھ سے پوچھا کہ میں رات بشمبر داس کے ساتھ کہاں گیا تھا۔ میں نے جھوٹ بولا۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ زیادہ ہی پریشان نظر آرہا تھا۔ بعد دوپہر میں بشمبر داس کے ساتھ عامل کے گاؤں چلا گیا۔ اُس نے یہ خوشخبری سنائی کہ کانسٹیبل ساجد علی کی بیوی نے بچے کا دل بھون کر کھایا ہے۔ عامل نے اُسے الگ کمرے میں بند کر کے کوئی جڑی بُوٹی کھلائی یا سونگھائی۔ پھر اُس سے پوچھا کہ اُس نے کیا کھایا ہے یا کیا کیا ہے۔ عورت نے بتایا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ایک سادھو کے پاس گئی تھی۔ یہ کوئی اور سادھو تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ دو تین ماہ کی عمر کا کوئی بچہ مر جائے تو جس رات اُسے دفن کیا جائے اُسی رات اُس کا دل نکال کر آگ پر بھونا جائے اور یہ اسے کھلا دیا جائے۔

عامل نے ہمیں بتایا کہ عورت اتنا ہی بیان دے کر پھر چیخنے لگی: "میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا لو۔" اُس نے اپنے بال نوچے، اپنا چہرہ نوچا اور اُسے رسیوں سے باندھ دیا گیا۔

ہم نے جیمز کو رپورٹ دی تو اُس نے ساجد علی کو بلا کر کہا۔

تم پولیس کے آدمی ہو۔ اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہے کہ تم مجھے بیوقوف بنا لوگے تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تمہارے گاؤں میں کسی عورت کو کوئی خطرناک تکلیف ہے؟ تم مجھے جانتے ہو۔ میں جال پھیلا کر ملزم کو پکڑا کرتا ہوں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے مخبر ہر جگہ موجود ہیں اور ان سے تم کچھ بھی نہیں چھپا سکتے۔ آرام سے اقبالِ جرم کر لو ورنہ اپنا انجام تم جانتے ہو کیا ہوگا۔ میرے پاس پوری شہادت آ گئی ہے۔"

ساجد علی سب انسپکٹر جیمز سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں پاس کھڑا تھا۔ میں نے اُسے کہا۔ "ساجد! تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ میں اُس عامل کے گاؤں میں بہت سا وقت گزار آیا ہوں جس کے پاس تمہاری بیوی کو لے گئے تھے، اور میں تمہارے گاؤں سے بھی ہو آیا ہوں۔ تم ہمارے بھائی ہو۔ میں جیمز صاحب کے پاؤں پکڑ کر تمہاری مدد کے لیے کچھ کراؤں گا۔ واردات خود ہی سنا دو۔"

"آپ میری مدد کریں گے؟" اُس نے جیمز سے پوچھا۔

جیمز نے مدد کا وعدہ کیا تو ساجد علی نے ایک کی بجائے دو وارداتوں کا اقبال کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی بیوی اُس کے خاندان اور برادری کی نہیں۔ وہ کسی دوسرے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ شادی کو دو ہی سال ہوئے تھے کہ وہ بیوہ ہو گئی۔ اُس وقت ساجد علی اُس کے علاقے کے تھانے میں تھا۔ اُس نے اس عورت کے ساتھ مراسم پیدا کر لیے جو اتنے گہرے ہوئے کہ یہ عورت اس کے پیچھے گھر سے نکل آئی۔ ساجد علی نے اُسے اپنے گاؤں لا کر شادی کر لی۔ ساجد علی کی برادری نے اس عورت کو بہت پریشان کیا۔ ساجد علی کو اُس کے خلاف اکسایا اور بھڑکایا بھی گیا لیکن یہ دل محبت کا معاملہ تھا۔ ساجد علی نے اپنی بیوی کی ایسی حفاظت کی کہ رشتہ داروں کے ساتھ لڑائی جھگڑے تک بھی نوبت آئی۔ ساجد علی جرأت والا آدمی تھا۔ پولیس کا کانسٹیبل بھی تھا، اُس نے سب کو دبا لیا۔

تین چار سال گزر گئے تو اُس کے بچہ نہ ہوا۔ یہ اس کی بیوی کا ایسا جرم تھا جو کسی بھی بیوی کے سسرال معاف نہیں کیا کرتے۔ ساجد علی کے والدین نے ایک بار پھر کھسر پھسر شروع کر دی۔ قریبی رشتہ دار بھی اس نئی مہم میں شامل ہو گئے۔ ساجد علی حکیموں اور سیانوں کے پاس گیا جس نے جو نسخہ یا طریقہ بتایا اُس نے آزمایا مگر اثر صفر رہا اور سال گزرتے چلے گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ جس مرد کی اولاد نہ ہو وہ اس میں اپنی مردانگی کی توہین سمجھتا ہے۔ اسی لیے بے اولاد عورت کو طلاق مل جاتی ہے۔ نقص خواہ خاوند میں ہی ہو۔ ساجد علی کے دل میں بیوی کی محبت اتنی گہری اتری ہوئی تھی کہ اُس نے طلاق کا نام بھی دل میں نہ آنے دیا۔

محبت کے علاوہ ساجد علی نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اُس کے رشتہ دار پہلے روز سے اُسے کہہ رہے تھے کہ اسے طلاق دے دو مگر وہ ڈٹا رہا۔ اب رشتہ داروں کو ایک اور بہانہ مل گیا تھا۔ دو گھروں سے اُسے لڑکیاں پیش کی گئیں لیکن اُس نے اسے اپنی شکست سمجھا اور اُس نے یہ بھی سوچا کہ جو عورت اپنے گھر اور عزیزوں کو اُس کی خاطر ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی تھی وہ کہاں جائے گی اور اُس کے عزیز اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اُس کے ساتھ کوئی شادی نہیں کرے گا۔ ساجد علی نے اپنی بیوی کی قربانی کے جواب میں قربانی دینے کا ارادہ کر لیا۔ اُس نے ہمارے تھانے میں تبادلہ کرا لیا تھا۔ اس تھانے میں اُسے ایک ہی سال گزرا تھا۔

آخر یہ دن آ گئے۔ شادی کے نو دس سال گزر گئے تھے۔ ساجد علی نے پندرہ دنوں کی چھٹی لے لی۔ اُسے کسی نے پانچ چھ میل دُور ایک سادھو کا پتہ دیا تھا۔ ساجد علی اُس کے پاس گیا۔ سادھو نے جتنی رقم مانگی اُس نے دی۔ سادھو نے اُسے بتایا کہ تین ماہ کے اندر اندر کسی عمر کے بچے کا دل نکال کر بیوی کو کھلایا

جائے۔ اس کے سوا کوئی اور علاج نہیں۔ اس سے پہلے ساجد علی
کئی ٹونے کر چکا تھا۔ اُس نے جنگل میں گھوم پھر کر بڑی ہی مشکل سے
ایک سانپ مارا تھا اور اُس پر ٹونا کر کے پر بیوی کو نہلایا
بھی تھا۔ اُس نے رات کے وقت قبرستان سے ایسی قبر سے جو
بہت پرانی ہونے کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی، انسانی کھوپڑی کے ٹکڑے
اٹھائے اور ایک سیانے سے اس کی دوائی بنوائی [illegible] ناکام
ہو گئی تھی۔

کسی بچے کا دل حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ ایک ہی طریقہ
تھا کہ کسی کا دودھ پیتا بچہ اغوا کیا جائے، پھر اسے قتل کر کے
اس کا دل نکالا جائے۔ ساجد علی نے اپنی بیوی کو بتایا کہ یہ ٹونا کرنا
ہے اور کسی کا بچہ اٹھانا ہے۔ بیوی ڈر گئی۔ ساجد علی کی چھٹی میں
چند دن باقی تھے کہ ایک روز وہ اس گاؤں کے قریب سے گزرا
جس کے بچے کی لاش قبر سے نکالی گئی تھی۔ اُس نے قبرستان
کی طرف ایک جنازہ جاتا دیکھا۔ اُس نے دیکھ لیا کہ میت جو ایک
آدمی نے ہاتھوں پر اٹھا رکھی تھی چھوٹے سے بچے کی تھی۔ جنازے
میں شامل ہو گیا اور پوچھا کہ بچہ کس کا تھا اور عمر کتنی ہے۔ اُسے پتہ
چلا کہ بچہ ابھی تین ماہ کا نہیں ہوا تھا۔ ساجد علی نے بچے کا دل نکالنے
کا ارادہ کر لیا۔

جنازے سے فارغ ہو کر وہ اپنے گاؤں گیا۔ اگر اُس کے
گھر کے حالات اُس روز اور نہ بگڑ جاتے تو شاید وہ اتنا بھیانک
جُرم نہ کرتا۔ وہ گھر گیا تو اُس کی بیوی رو رہی تھی اور اُس کی ماں
گالیاں بک رہی تھی۔ وہ ساجد پر بھی برسنے لگی۔ اُس نے اُسے
بے اولاد ہونے کے طعنے دیئے۔ منحوس کہا اور جو منہ میں آیا بک
ڈالا۔ فضا اتنی زیادہ خراب تھی جس سے ساجد کا دماغ بھی خراب
ہو گیا۔ وہ کوئی تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا آدمی تو نہیں تھا۔ وہ تین جماعت
پاس کانسٹیبل تھا اور دیہاتی۔ اُس نے ماں کو للکار کر کہا کہ اُس کی
بیوی اسی گھر میں رہے گی اور وہ بچہ جنے گی۔ چنانچہ اُس کے
دل میں مرے ہوئے بچے کا دل نکالنے کا ارادہ اور زیادہ پختہ
ہو گیا۔

رات کو وہ بیوی کو بتا کر چلا گیا۔ اُس کے پاس ایک بیلچہ
اور ایک چاقو تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بچے کی قبر کہاں ہے۔ بچے
کی قبر خالی کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ تین ماہ کے بچے کی قبر چھوٹی
سی تھی یہ اُسی روز کی قبر تھی۔ ساجد علی کو مٹی نکالنے کو کوئی زیادہ
وقت بھی نہ لگا اور زیادہ مشقت بھی نہیں کرنی پڑی۔ لحد پر اینٹیں
تھیں۔ اُس نے اینٹیں ہٹائیں۔ بچے کی لاش باہر نکالی۔ چاقو
سے اُس کی نیچے والی پسلی سے پیٹ چاک کیا اور ہاتھ اندر ڈال کر
دل نکال لیا۔ چاقو تیز تھا۔ اندھیرے میں بھی اُس نے کام صحیح طریقے
سے کر لیا۔ لاش لحد میں رکھی اور اینٹیں جگہ پر جمانے کی بجائے
قبر میں رکھ دیں اور اوپر مٹی ڈال دی۔ مٹی لحد میں چلی گئی۔ قبر کی
شکل بگڑ گئی۔ ساجد علی اگر صحیح طریقے سے قبر بند کرتا تو شاید کسی کو
شک نہ ہوتا لیکن جرم کے ارتکاب کے لیے صرف دلیری اور جذبات
کی نہیں عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ دل نکال کر لے گیا۔ گھر میں سب سوئے ہوئے تھے۔
صرف بیوی جاگ رہی تھی کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا خاوند
کون سی مہم پر گیا ہے۔ خاوند آگیا۔ اُس نے بیوی سے کہا کہ چولہا
جلاؤ اور یہ بھون کر کھا جاؤ۔ ساجد علی نے اپنے اقبالی بیان میں
اپنی بیوی کا ردِ عمل یہ بتایا کہ اُس نے جب بچے کا ذرا سا دل اپنے
ہاتھ میں لیا تو اُس کا ہاتھ صاف کانپتا نظر آیا۔ اُس کا رنگ پیلا
پڑ گیا۔ اُس نے ساجد علی کی طرف دیکھا تو اس عورت کے آنکھوں
کے ڈھیلے باہر کو آ رہے تھے۔ مختصر یہ کہ خوف نے اُس کی جان
نکال دی۔ ساجد علی نے اُسے حوصلہ دیا بلکہ اپنے ہاتھوں دل کے
چار ٹکڑے کر کے گھی میں تلے اور بیوی کو کھلا دیئے۔ بیوی کی حالت
اُسی وقت غیر ہونے لگی۔

رات جاگتے گزار دی۔ صبح اُس کی دماغی حالت اور زیادہ
بگڑ گئی اور اُس نے ہذیان بکنا شروع کر دیا۔ گھر میں اور کسی کو بھی
معلوم نہیں تھا کہ اصل باعث کیا ہے۔ ساجد علی نے رات کے

اندھیرے میں جرم تو کر لیا مگر دن کی روشنی میں اُس کے دل پر خوف سوار ہو گیا۔ اُس نے اپنی بیوی کو چوری چھپے دیسی شراب پلا دی جو وہاں عام مل جاتی تھی۔ دیہاتی خود ہی کشید کیا کرتے تھے۔ اس سے وہ سنبھل گئی اور سو گئی۔ ساجد علی پولیس کا آدمی تھا۔ اُسے خیال آ گیا کہ وہ قبر کو صحیح طریقے سے بھر کر نہیں آیا تھا، ہو سکتا ہے اُس کا جرم بے نقاب ہو گیا ہو۔ وہ جاسوسی کے لیے اُس گاؤں کے قبرستان کی طرف چلا گیا۔ ابھی وہاں تک پہنچا نہیں تھا کہ ایک آدمی راستے میں ملا جس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے بتایا۔" بھائی صاحب! یہ ظلم دیکھو۔ انسان بھی بھیڑیے بن گئے ہیں۔ رات کو کوئی آدمی ایک بچے کی قبر کھود کر بچے کا دل نکال کر لے گیا ہے۔ قبرستان میں پولیس اُتری ہوئی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ بچے کا دل کسی انسان نے سینہ چاک کر کے نکالا ہے۔ کوئی درندہ اس طرح نہیں کر سکتا۔"

ساجد علی وہیں سے واپس آ گیا اور اُس نے جاسوسوں کی طرح یہ دیکھنا شروع کر دیا کہ پولیس کیا کارروائی کرتی ہے۔ تھانے کے ایک ہندو کانسٹیبل کا نام لے کر ساجد علی نے بتایا کہ اُس نے اس ہندو سے چوری ملاقات کر کے معلوم کر لیا کہ کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ دوسرے دن بچے کے گاؤں جا کر اُس نے چوکیدار سے بھی کچھ باتیں معلوم کریں۔ اُس کی ملاقات مقتولہ (مجرم عورت) سے بھی ہوئی۔ ساجد علی کو سب جانتے تھے۔ ہر کسی کو معلوم تھا کہ وہ کانسٹیبل ہے اس لیے اُس سے کوئی بھی کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ اُسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ مجرم عورت کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

یہ عورت پہلی بار سادھوؤں کے پاس گئی تو دوسرے دن کانسٹیبل نے اُس کے گاؤں جا کر اُس سے معلوم کر لیا کہ وہ کیا خبر لائی ہے۔

اس سے اگلے روز بھی وہ اس عورت سے ملا۔ سب انسپکٹر جیمز نے اُسے سختی سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی کو کوئی بات نہ بتائے۔ اس حکم کا ساجد علی کو علم نہیں تھا۔ عورت نے اُسے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ ساجد علی کے دماغ پر بڑا ہی ہیبت ناک جرم سوار تھا۔ گھر میں اُس کی بیوی کی دماغی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ساجد علی کی عقل ماری گئی۔ اُسے یہ وہم ہو گیا کہ اِس عورت نے کوئی سراغ لگا لیا ہے۔ تیسری شام وہ اُس غار کے قریب کہیں چھپ گیا جس میں یہ پانچ سادھو رہتے تھے۔ مجرم عورت کو وہاں جانا تھا۔ ساجد علی نے اُسے غار کی طرف جاتے دیکھا۔ واپسی کے وقت اندھیرا ہو گیا تھا۔ عورت واپس گئی تو ساجد علی اُسے راستے میں اس طرح ملا جیسے اچانک آمنا سامنا ہو گیا ہو۔

عورت نے اُسے پہچان لیا اور ان کے درمیان وہ باتیں ہوئیں جو ایک سادھو نے سُنی تھیں اور ہمیں بتائی تھیں۔ انہی باتوں سے ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ عورت کو ایسا آدمی ملا جو اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ ساجد علی نے اُسے کہا کہ وہ رات کے وقت اس بیابان میں اکیلی نہ جائے، وہ اُس کے ساتھ چلے گا۔ اُس نے عورت کو ایک اور راستے پر یہ کہہ کر ڈال دیا کہ یہ راستہ چھوٹا ہے اُس نے عورت سے پوچھا کہ وہ کیا کچھ حاصل کر چکی ہے۔ عورت

"میرے شوہر حالتِ جنگ میں دفتر گئے ہیں مگر دو منٹ میں یقیناً واپس آجائیں گے۔"

نے اُسے بتایا کہ سب انسپکٹر نے اُسے بڑا سخت حکم دیا ہے کہ کسی کو کچھ نہ بتانا۔ ساجد علی نے عقل سے کام نہ لیا، کانسٹیبل کا رعب جھاڑا۔ عورت بگڑ گئی۔ اُس نے کہا" تم دو ٹکے کے سپاہی ہو۔ میں تو داروغوں کو بھی مٹھی میں رکھتی ہوں:"

ساجد علی نے اور زیادہ رعب جھاڑ کر کہا کہ بتاؤ تمہاری رپورٹ کیا ہے۔ عورت نے جواب دیا۔ تم کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہو؟ گاؤں میں آکر مجھ سے بھید لیتے ہو۔ اب پھر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ تم شاید مجرم کو جانتے ہو۔"

تکرار اور بڑھی تو عورت نے کہا" میں داروغہ کو یہ بھی بتا دوں گی کہ تم مجھ سے بھید لیتے ہو۔"

ساجد علی نے اُس کی گردن دبوچ لی اور اُسے جان سے مار دیا۔ وہ اسی ارادے سے آیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں گز بھر لمبا ڈنڈا تھا جس کے ساتھ برچھی کی طرح چوڑی آنی لگی ہوئی تھی۔ اُس نے لاش کندھوں پر اٹھائی اور ایک کھڈ میں اُتر گیا۔ زمین پتھریلی نہیں تھی۔ اُس نے برچھی سے زمین کھودی۔ لاش وہاں رکھی اور اوپر مٹی ڈال دی۔ گڑھا گہرا نہیں تھا۔

وہ گھر چلا گیا۔ اُس نے بیوی کو نہ بتایا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔ بیوی کو تو ہوش ہی نہیں تھی کہ اُس کا خاوند گھر میں ہے یا کہاں ہے۔ وہ ہذیانی حالت میں مبتلا تھی۔ اُسی روز اُس کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنے بال اور چہرہ نوچنے لگی۔ اُس نے کپڑے پھاڑ ڈالے اور چلانے لگی"۔۔ میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا لو"۔۔ ساجد علی کی اپنی حالت بھی بگڑنے لگی۔ اُسی رات اُس نے خواب میں ایک بچہ دیکھا جس کی عمر تین ماہ تھی۔ بچہ اُس کے سینے پر لیٹا ہوا کبھی ہنستا تھا کبھی روتا تھا۔ پھر بچہ اُس کے سینے میں داخل ہو گیا۔ ساجد علی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اُس کا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔ اُس کی بیوی سو گئی تھی۔ وہ اچانک جاگ اُٹھی اور اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

گھر والے جاگ اُٹھے۔ گاؤں کی تین چار عورتیں آگئیں۔ اُس وقت تک اسی گاؤں کا کوئی آدمی بیوی پر دم درود کر رہا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ یہ جنات کا قبضہ ہے۔ پھر اُسے ایک اور جگہ لے گئے۔ وہاں سے بھی تعویذ لئے اور تصدیق ہوئی کہ جنات کا قبضہ ہے۔ اس کے بعد اس عامل کی باری آئی جو بچے کے گاؤں میں رہتا تھا۔ اب تو عورت کی حالت اتنی بگڑ گئی تھی کہ مردوں کے قابو میں بھی نہیں آتی تھی۔ سب جنات کا قبضہ سمجھ رہے تھے۔ ساجد علی کی چھٹی پوری ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو اسی حالت میں چھوڑ کر تھانے میں حاضر ہو گیا۔ وہ ہار گیا تھا۔ اُس کی دلیری اور جوانمردی جواب دے گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اقبالِ جرم کرتے دیر نہ لگائی ورنہ پولیس کے کسی آدمی سے اقبالِ جرم کرانا آسان نہیں ہوتا۔

عامل نے ہماری بہت مدد کی تھی۔ اُس نے اپنی وہ دوائی ڈاکٹر کو بھی دکھائی تھی جو اُس نے ساجد علی کی بیوی کو دی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اس کا اثر عارضی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے کمرے میں مریضہ کو تنہا کر کر کہا تھا کہ جب تک وہ بتائے گی نہیں کہ اُس نے کیا کھایا یا کیا غلط حرکت کی ہے اُس کی جان عذاب میں رہے گی۔ اُس نے بتا دیا کہ اُس کے خاوند نے اُسے انسان کے بچے کا دل کھلایا ہے۔

جیمز نے ساجد علی سے وعدہ کیا تھا کہ اُس کی مدد کرے گا لیکن اُس کے دو نو جرائم اتنے بھیانک تھے کہ جیمز نے پوری محنت اور دیانتداری سے مقدمہ تیار کیا۔ کہیں کوئی کمی نہ رہنے دی۔ ساجد علی کو بچے کا دل نکالنے کے جرم میں سات سال اور قتل کے جرم میں عمر قید/عبور دریائے شور (کالا پانی) کی سزا ہوئی۔ اُس کی بیوی ٹھیک نہیں ہو سکی تھی۔ تھوڑے سے ہی عرصے بعد مر گئی تھی۔

خوفناک کہانیوں سے غیر ملکی منتخب کہانی۔

آسیب زدہ عمارت

ڈونلڈ ہونگ

یہ ذکر ہے ۱۹۰۲ کا — میں اس زمانے میں کرۂ ارض کے تاریک دَور سے متعلق ایک تحقیقی کتاب لکھنے کی فکر میں تھا۔ اس سلسلے میں میں نے تمام مواد جمع کر لیا تھا اور اب اس تگ و دو میں تھا کہ شہر کے ہنگاموں سے دُور کوئی ایسی جگہ ملے جہاں سکون سے بیٹھ کر یہ کتاب لکھ سکوں۔ جائداد کی خرید و فروخت کرنے والی ایک ایجنسی نے جب نیویارک ٹاؤن کے ایک مکان کینن ہال کا پتہ بتایا اور میں یہ عمارت دیکھنے گیا تو اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ ایسی الگ تھلگ اور پُرسکون جگہ آسانی سے کہیں اور نہ مل سکے گی۔

کینن ہال تین منزلہ نہایت عالی شان قدیم طرز کی عمارت تھی اور گزشتہ چالیس برس سے بالکل خالی پڑی تھی۔ اس کے چاروں طرف کسی زمانے میں نہایت پُرفضا باغ ہوگا جو اب دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث بھیانک جنگل میں بدل چکا تھا۔ نچلی منزل کی کھڑکیاں لمبی لمبی گھاس خودرو پودوں اور جھاڑ جھنکار کی کثرت سے نظر نہ آتی تھیں۔ دیواروں پر سیاہ رنگ کی کائی کی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں سے پلاستر بھی اُکھڑ چکا تھا اور خستہ اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ لوہے کے دروازے اور ان پر لگی ہوئی سلاخیں زنگ آلود تھیں۔ جا بجا مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تان دیے تھے اور حشرات الارض کی بھرمار تھی۔

جب میں نے کینن ہال کی عمارت سستے داموں خرید لی اور اس کی مرمّت اور صفائی کا ارادہ کیا تو گاؤں کا کوئی شخص بھی اس کے اندر داخل ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے یہ عمارت خرید کر سخت غلطی کی ہے، کیونکہ یہ آسیب زدہ ہے۔ اندھیری راتوں میں اس کے اندر سے چیخنے چلّانے اور رونے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اکثر لوگوں نے قسمیں کھا کر کہا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے ایک بھیانک شکل کے آدمی کو اُوپر کی منزل میں چلتے پھرتے دیکھا ہے۔

میں یہ قصے سُن کر ہنس دیتا اور لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ یہ سب واہمے ہیں۔ بھوت پریت یا آسیب کا کوئی وجود نہیں

ہوتا، لیکن میری ان باتوں کا گاؤں والوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر میں نے شہر جا کر بھاری معاوضے پر چند آدمی جمع کیے اور انہیں ساتھ لا کر کینن ہال کی صفائی اور مرمت کرائی۔ اس کام میں دو ماہ لگے۔ اس دوران میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا اور میں نے کسی بد روح کو نہ دیکھا، تاہم یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کینن ہال کو ایک عجیب سوگوار اور اندوہگیں ماحول نے جکڑ رکھا تھا۔ لمبی غلام گردشوں اور بڑے بڑے کمروں میں ہر وقت اداسی سی چھائی رہتی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عظیم عمارت میں رہنے والا صرف ایک ہی شخص تھا اور وہ میری ذات تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ گاؤں کے لوگوں کو کسی طرح کینن ہال میں آنے اور کچھ دیر بیٹھنے کی دعوت دوں مگر ہر شخص نے وہاں آنے سے انکار کیا اور میں جس سے بھی ذکر کرتا، وہ فوراً اپنے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بناتا اور چلا جاتا۔

انہی دنوں میری ملاقات ڈاکٹر البرٹ مارلیسن سے ہوئی اور چند دن کے اندر اندر ہمارے تعلقات بے تکلفی کی حدوں کو چھونے لگے۔ ڈاکٹر مارلیسن کا مکان کینن ہال سے کوئی ایک فرلانگ دور تھا اور اس اعتبار سے وہ میرا سب سے قریبی پڑوسی تھا۔ اس کی عمر اسی بیاسی برس کے لگ بھگ تھی مگر صحت نہایت اچھی اور مزاج بے حد شگفتہ تھا۔ اس عمر کو پہنچ کر اکثر بڈھے بد مزاج اور چڑچڑے ہو جایا کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر مارلیسن میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ جب بھی ملتا، خوش اخلاقی سے پیش آتا۔ ایک دو بار اس نے مجھے اپنے مکان پر بھی بلایا اور خاطر تواضع کی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں نے کینن ہال خرید لیا ہے اور میں اس عمارت میں مستقل طور پر رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تو اس نے کسی حیرت کا اظہار نہ کیا، بلکہ مجھ سے کہا:

"یہ مکان گزشتہ چالیس برس سے بے آباد اور ویران پڑا ہے۔ بہت اچھا ہوا کہ آپ یہاں آ گئے۔"

"جی ہاں، یہ عمارت مجھے پسند آئی اور میں نے خرید لی۔ اس کی صفائی اور مرمت وغیرہ کرانے میں دو ماہ لگے ہیں۔ آپ کسی روز تشریف لائیے اور دیکھیے۔"

میں نے یہ بات ڈرتے ڈرتے کہی تھی، کیونکہ احساس تھا کہ ڈاکٹر مارلیسن فوراً آنے سے انکار کر دے گا، لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"اگر آپ مجھے کینن ہال آنے کی دعوت نہ دیتے، تب بھی میں ضرور آتا۔ میں خود اس مکان میں خاص دلچسپی رکھتا ہوں۔"

یہ سن کر میں حیران ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اب ڈاکٹر مارلیسن بھوتوں کے قصے چھیڑے گا، لیکن وہ سر ہلاتا ہوا اپنی گھوڑا گاڑی کی طرف گیا اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا:

"میں کل شام کو کینن ہال میں حاضر ہوں گا۔"

اگلے روز وہ وعدے کے مطابق میرے ہاں آیا۔ میں نے اسے نچلی منزل کے بڑے کمرے میں بٹھایا۔ وہ حیرت سے ارد گرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے کی حالت دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا:

"آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ کینن ہال کی حالت ہی بدل دی۔ یقین کیجیے آج میں چالیس سال بعد یہاں آیا ہوں۔ میرے دوست مورک کینن کا انتقال بھی اسی زمانے میں ہوا تھا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ شاید زندگی میں دوبارہ یہاں آنے کا موقع نہ ملے گا اور نہ اس جگہ اب کوئی شخص آن کر رہے گا، مگر عجیب اتفاق ہے کہ میرے یہ دونوں نظریے غلط ثابت ہوئے۔"

"آخر یہ نظریے آپ نے کس بنیاد پر قائم کیے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"آہ، یہ ایک دردناک داستان ہے۔" ڈاکٹر مارلیسن نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

"یہ داستان میں نے کتنی ہی مرتبہ گاؤں کے مختلف لوگوں کی

زبان سے سن چکا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ کینن ہال کے مالک ہورک کینن نے بعض پُراسرار حالات کے تحت گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی اور اب اس کی روح اس عمارت میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر سے کہا:

"جس داستان کی طرف آپ اشارہ کرتے ہیں، وہ داستان میں گاؤں کے تقریباً ہر فرد کی زبانی سن چکا ہوں اور اب میری درخواست ہے کہ آپ بھی اس بارے میں جو کچھ جانتے ہیں مجھے بتا دیں۔"

ڈاکٹر مارلین نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ چند لمحے تک اس کی نیلی آنکھیں چھت کو گھورتی رہیں، پھر اس نے مدھم لہجے میں کہنا شروع کیا:

"واقعہ یہ ہے کہ اصل حادثے کا علم میرے سوا کسی کو نہیں ہے اور میں نے اب تک اس بارے میں کسی سے ایک لفظ نہیں کہا۔ شاید اس لیے کہ کوئی اس پر یقین نہ کرتا۔ مگر آپ صاحب علم وفضل ہیں، اس لیے آپ کو بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ یوں بھی میں اس راز کو چالیس سال سے اپنے سینے میں دفن کیے ہوئے ہوں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس راز کو اپنے سینے کی قبر سے نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں، کیونکہ آپ کینن ہال کے مالک بن چکے ہیں۔"

چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد اس نے انگلی سے چھت کے ایک روشن دان کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"یہ وہ جگہ ہے جہاں بدنصیب ہورک کینن نے رسّا باندھا اور اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ جہاں تک ہورک کی روح کا تعلق ہے، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس عمارت میں بھٹکتی پھرتی ہے یا اسے سکون مل گیا ہے۔ تاہم چالیس برس پیشتر جو واقعہ بیان ہوا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہورک کینن کے والد نے یہ عظیم عمارت بنوائی تھی۔ جب اس کا والد وفات پا گیا تو ہورک اس کا مالک بن گیا۔ ہورک عجیب وغریب ذہنیت کا آدمی تھا۔ اس کی شخصیت کا الفاظ کی مدد سے نقشہ کھینچنا میرے لیے دشوار ہے۔ کبھی جوش وخروش اور غیظ وغضب کی تصویر نظر آتا اور کبھی بالکل مسکین بکری کی طرح۔ بچپن میں اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کھیل کود سے بھی کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ اپنے ہم جماعت بچوں کو پیٹنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کئی بار میں بھی اس کے ہاتھوں زخمی ہوا ہوں۔ جب وہ جوان ہوا تو بہت مضبوط ہاتھ پیر کا مالک تھا۔ اب وہ دنیا کی سیاحت کے منصوبے بنانے لگا جو کبھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچے۔ اس نے کئی مرتبہ مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ایک طویل بحری سفر کرنا چاہتا ہے۔ پھر اس نے کہا وہ دنیا کی مشہور ومعروف درس گاہوں میں داخل ہو کر علم حاصل کرے گا، مگر اس نے اس پر بھی عمل نہ کیا۔ انہی دنوں اس کی شادی ہیلن نام کی ایک حسین لڑکی سے ہو گئی۔ وہ اسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ نہایت خاموش، متین اور سنجیدہ مزاج۔ اس میں غصّہ نام کو نہ تھا۔ ہورک اور ہیلن کی یہ شادی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ دونوں کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ علیحدگی ہو گئی۔ اس وقت ہورک کی زندگی میں ایک اور انقلاب برپا ہوا۔ اس نے کینن ہال سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ دن رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ یہ حالت دیر تک رہی۔ پھر وہ باہر نکلنے لگا۔ کسی روز موسم اچھا ہوتا تو وہ گھوڑے پر بیٹھ کر گرد ونواح کی سیر کے لیے چلا جاتا یا جھیل پر جا کر مچھلی کا شکار کھیلتا۔ کبھی کبھی گاؤں میں آکر لوگوں سے بات چیت بھی کرتا۔ لیکن برف باری کے زمانے میں وہ ہفتوں کیا مہینوں گھر سے باہر نہ آتا اور اسی کمرے میں، جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں،

آتش دان کے پاس آرام کرسی میں دھنسا کوئی کتاب پڑھتا رہتا۔
آتش دان کے بارے میں اس نے نوکروں کو سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ اس میں کسی بھی لمحے آگ مدھم پڑنے نہ پائے اور اگر اس معاملے میں ذرا سی بھی غفلت ہو جاتی تو وہ نوکروں پر بری طرح برس پڑتا۔ گالیاں دیتا اور بعض اوقات تو ہاتھ بھی چلا دیتا۔

"شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اندر بھی آگ بھڑک رہی تھی اور وہ آتش دان میں لپکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر تسکین حاصل کرتا تھا۔" میں نے کہا۔

"آپ کا خیال صحیح ہے۔" ڈاکٹر مارلین نے کہا: "بہرحال آپ قصہ سنیئے۔ ہورک کے علاوہ کینین ہال میں ایک اور عجیب شخصیت بھی موجود تھی۔ اس کا نام تھا کیور۔ یہ شخص ہورک کا ذاتی خادم ہونے کے ساتھ ساتھ خانساماں بھی تھا اور مالی بھی۔ اس کے علاوہ دوسرے ملازموں کی نگرانی بھی کیور ہی کے سپرد تھی۔ کیور کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے۔ اپنے بارے میں اس نے کبھی کچھ نہ بتایا۔ گاؤں والے اس کے بارے میں بھی طرح طرح کی باتیں بنایا کرتے تھے لیکن کیور نے کبھی زبان نہ کھولی۔ بلا ضرورت وہ کسی سے بات نہ کرتا تھا اور غیر متعلقہ سوالوں کو یوں نظر انداز کر دیتا جیسے سنا ہی نہیں۔ پہلے پہل مجھے باورچن کی زبانی معلوم ہوا کہ کیور نام کا ایک شخص کینین ہال میں ملازم رکھا گیا ہے جس کی حرکتیں نہایت پراسرار ہیں۔ پھر ایک روز میں نے کیور کو دیکھا۔ ان دنوں ہورک کا موڈ کچھ اچھا تھا، چنانچہ اس نے گاؤں کے چند سرکردہ افراد کو کینین ہال میں رات کے کھانے پر بلایا تھا۔

کیور ادھیڑ عمر کا ایک دبلا پتلا آدمی تھا۔ دھنسی ہوئی زرد آنکھیں۔ مڑی ہوئی ناک اور پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ۔ جب وہ چلتا تو اس کے پیروں کی آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ کھانے کے دوران میں وہ کئی مرتبہ کمرے میں آیا لیکن اس نے ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہا۔ اگر کوئی مہمان اس سے مخاطب ہو کر کسی چیز کی فرمائش کرتا تو کیور ادب سے گردن جھکا کر تعمیل کر دیتا۔
میں نے دیکھا کہ وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے اور حتی الامکان کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتا۔ ہورک نے بھی اس کی تعریف میں چند الفاظ مہمانوں سے کہے، لیکن میں نے اندازہ کیا کہ اندرونی طور پر ہورک اس شخص کیور کو پسند نہیں کرتا اور کسی قدر اس سے خائف رہتا ہے۔

اسی روز ہورک نے مجھے بتایا کہ کیور کی بیوی مر چکی ہے، اور وہ اپنے دو لڑکوں کو لے کر کینین ہال میں ملازمت کے لیے آیا ہے۔ بڑے لڑکے ٹام کی عمر بارہ سال اور چھوٹا لڑکا ہنری دس سال کا تھا۔ کیور نے ان لڑکوں پر کبھی کوئی پابندی نہ لگائی؛ چنانچہ یہ بچے گاؤں کے لڑکوں میں جا کر کھیلتے اور بہت جلد سب میں گھل مل گئے۔

سردیوں کی ایک تاریک اور سرد رات تھی جب اس خوفناک حادثے کا آغاز ہوا جس نے ہورک کی زندگی تلخ کر دی۔ ہیلن کو علیحدہ ہوئے کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے اور ہورک اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس کیفیت کو تمام نوکروں نے بھانپ لیا تھا اور وہ کوشش کرتے تھے کہ ہورک کے سامنے جانے کا زیادہ موقع نہ ملے۔ غالباً اس چیز کو سامنے رکھ کر کیور نے اپنے لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ ہورک کے کمرے میں آتش دان کی آگ مدھم نہ ہونے دیں۔

اس رات ہورک جب سونے کے لیے اس کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ لیمپ بجھا ہوا ہے اور آتش دان بھی کچھ زیادہ روشن نہیں ہے۔ کیور کا ایک لڑکا آتش دان کے قریب کھڑا لوہے کی سلاخ سے راکھ کرید رہا تھا۔ ہورک کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر لڑکے کو اس زور کا طمانچہ مارا کہ بدنصیب لڑکا چکرا کر آتش دان میں گرا۔ اس کا سر پتھر کی دیوار سے ٹکرایا۔ ہورک نے چیخ کر کہا۔ جلدی سے آتش دان میں کندے

جھونکو اور لیمپ جلاؤ، مگر لڑکے نے کوئی حرکت نہ کی۔ تب ہورک نے ٹھوکر مار کر لڑکے کو اٹھانے کی کوشش کی، مگر اس نے جنبش بھی نہ کی۔ یہ دیکھ کر ہورک غیظ و غضب سے کانپتا ہوا باہر نکلا اور اس نے دیکھا کہ برآمدے میں کیوبر کھڑا ہے۔

"یہ کیا تماشا ہے ....." ہورک چلایا۔ "آتش دان سرد پڑا ہے اور لیمپ بھی بجھا ہوا ہے۔ جاؤ اپنے لڑکے کی خبر لو۔ میں نے اسے ہلکا سا تھپڑ مارا تو وہ آتش دان کے پاس لیٹ گیا اور اب مکر کیے پڑا ہے۔"

کیوبر نے ایک لفظ نہ کہا اور ہورک کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ چند منٹ بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے آقا کے پاس آیا اور پُرسکون لہجے میں کہا:

"جناب میرا لڑکا ... ٹام .... مر چکا ہے .... اس نے دم توڑ دیا۔"

"مر گیا ....." ہورک دہشت سے چلا اٹھا۔ "خدا کی پناہ ... کیوبر یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں یہ عرض کر رہا ہوں سرکار کہ ٹام مر گیا۔" کیوبر نے پھر اسی انداز میں جواب دیا جیسے ڈنر تیار ہو جانے کا اعلان کر رہا ہو۔

ہورک کے اعصاب جواب دے گئے۔ دیر تک کوئی لفظ اس کے منہ سے نہ نکل سکا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر کیوبر کو گھورتا رہا۔ پھر دھڑام سے زمین پر گرا۔ کیوبر نے اسے سنبھالا اور اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ہورک کی حالت غیر تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا:

"کیوبر، خدا کے لیے مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارے لڑکے کو جان بوجھ کر نہیں مارا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ہاتھ لگاتے ہی وہ آتش دان میں جا گرے گا۔"

کیوبر نے اطمینان سے جواب دیا:

"سرکار، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ آپ کوئی رنج نہ کریں۔ ٹام میرا لڑکا تھا اور میں سب معاملہ سنبھال لوں گا۔ اب آپ یہاں آرام کریں اور کسی سے اس بارے میں کچھ نہ کہیں۔"

ہورک کو وہیں چھوڑ کر کیوبر اس کے کمرے میں گیا اور لڑکے کی لاش اٹھا کر اس جگہ لے آیا جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ پھر اُسی رات کیوبر نے ایک گھوڑا گاڑی منگوائی۔ لاش اس میں رکھی اور اپنے دوسرے لڑکے کو بھی ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ تین ہفتے غائب رہنے کے بعد وہ واپس کینن ہال میں آیا اور ہورک کو بتایا کہ اس نے ٹام کو اس کی ماں کی قبر کے پاس دفن کر دیا ہے اور دوسرے لڑکے ہنری کو بعض رشتے داروں کے سپرد کر آیا ہے۔ ہورک نے بہت پوچھا کہ تمہارے رشتے دار کہاں رہتے ہیں تاکہ ہنری کے کل اخراجات وہاں بھیج دیے جائیں، مگر کیوبر نے اپنا منہ سختی سے بند کر لیا اور ہورک کو پتہ نہ بتایا۔

آہستہ آہستہ دن گزرتے رہے۔ کیوبر دوسرے تیسرے ہفتے چھٹی لیتا اور کسی نامعلوم مقام پر روانہ ہو جاتا۔ دو تین دن بعد واپس آتا اور خاموشی سے اپنے کام میں لگ جاتا۔ ہورک کا خیال تھا کہ وہ اپنے بیٹے ہنری کو دیکھنے جاتا ہو گا۔

ایک دن ہورک خلافِ معمول میرے مکان پر آیا۔ میں اُس وقت باہر برآمدے میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ ایک لخت خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خاصا فکرمند ہے۔ چہرے کا رنگ بھی کس قدر اُڑا ہوا ہے۔ اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہوں، وہ اچانک بول پڑا:

"ڈاکٹر مارسین، کیا آپ کو معلوم ہے کہ کیوبر کا لڑکا ٹام مر گیا؟"

"کب، کیسے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"معمولی سا حادثہ تھا۔ میں نے سے طمانچہ مارا، وہ آتش دان

میں گرا اور مر گیا۔"

"تعجب ہے۔ لیکن یہ حادثہ کب پیش آیا؟"

"کوئی چھ ماہ قبل۔"

"چھ ماہ قبل! مگر آپ نے پہلے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"ذکر کرنے سے بھلا کیا فائدہ تھا۔"

"بندۂ خدا، ہم لوگ کم از کم کیوڈر سے چند تعزیتی کلمات ہی کہہ دیتے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن کیوڈر نے خود مجھ سے کہا تھا کہ اس حادثے کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ وہ ٹام کی لاش یہاں سے لے گیا اور کسی جگہ دفنا آیا۔"

"اور ہنری کہاں ہے؟"

"کیوڈر اسے اپنے چند رشتے داروں کے سپرد کر آیا ہے۔"

"خدا رحم کرے۔" میں نے کہا۔ "بے چارے کیوڈر کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہوگا۔"

"یقینی بات ہے۔ لیکن بظاہر اسے کوئی غم نہیں۔ حسبِ معمول اپنے کام کاج میں لگا رہتا ہے۔"

ہمارے درمیان بس اتنی ہی بات ہوئی۔ اس کے بعد ہورک رخصت ہوگیا۔ میں دیر تک کیوڈر کے بارے میں سوچتا اور ہورک کے بیان کی صداقت پر غور کرتا رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ آخر حادثے کے چھ ماہ بعد ہورک کو یہ خیال کیوں آیا کہ مجھ سے ذکر کیا۔ بہرحال میں نے گاؤں میں کسی سے اس بارے میں بات نہ کی۔

دو مہینے گزر گئے۔ ایک رات میرے مکان کے آگے گھوڑا گاڑی رکی، اس کا دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ ہورک باہر نکلا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میرے خادم نے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور اندر کمرے میں لایا۔ پانی کے دو گلاس پی لینے کے بعد اس کے حواس کچھ درست ہوئے۔

"ڈاکٹر مارلیسن! معاف کرنا۔ میں نے بے وقت آپ کو زحمت دی، مگر خدا را مجھے یہ بتاؤ کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ کیا میں فریبِ نظر کا شکار ہو سکتا ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے اعصاب خاصے مضبوط ہیں۔"

"پھر یہ کیا ماجرا ہے کہ مجھے بھوت نظر آتے ہیں؟" اس نے مسکرا کر کہا۔ یہ مسکراہٹ بالکل بے جان اور بے اثر تھی۔

"بھوت؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "میں ان واہیات باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتا۔" ہورک دفعتہً اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے میرا بازو سختی سے تھام کر کہا:

"مگر میں نے اسے دیکھا ہے ڈاکٹر.... اپنی ان آنکھوں سے..... اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔"

اس کی آواز کانپ رہی تھی اور آنکھوں سے خوف کا اظہار ہوتا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ کرسی پر بٹھایا اور پوچھا:

"آپ نے کسے دیکھا؟"

"ٹام کو.... کیوڈر کے لڑکے ٹام کو.... گزشتہ رات۔"

"کہاں، کس جگہ؟"

"اپنے مکان کینن ہال میں۔" ہورک نے جواب دیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر سسکیاں لینے لگا۔

"ڈاکٹر مجھے پورا یقین ہے کہ وہی تھا!"

"کینن ہال تو بہت بڑی عمارت ہے۔ آپ نے ٹام کو کس جگہ دیکھا تھا؟"

"اپنے کمرے میں۔ آتش دان کے پاس ـــــ"

"وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟"

"چپ چاپ.... بے حس و حرکت کھڑا تھا۔"

"اور اس وقت آپ کہاں تھے؟"

"میں گھوڑے کو اصطبل میں بند کروا کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ کیوڈر میرے ساتھ تھا۔ جب میں کمرے کی بڑی کھڑکی کے سامنے پہنچا جہاں اونچے اونچے پودے لہلہا رہے تھے، تو

دفعتہ کیور کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ وہ ان پودوں پر جھکا اور چند سفید ریشمی دھاگے اٹھا کر میرے پاس لایا۔ میں نے پوچھا یہ کیا چیز ہے۔ تب اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

"سرکار، یہ اس کپڑے کے دھاگے معلوم ہوتے ہیں جس میں میں نے اپنے بڑے لڑکے ٹام کو کفنایا تھا۔"

"لیکن اسی لمحے میری نگاہ کھڑکی میں سے ہو کر اپنے کمرے میں گئی۔ اور میں نے دیکھا کہ آتش دان کے قریب ٹام کھڑا مجھے گھور رہا ہے۔ خوف کے مارے میرا جسم پتھر کا ہو گیا۔ یہ کیفیت صرف چند ثانیے ہی قائم رہی۔ اس کے بعد میں نے کیور سے کہا کہ آتش دان کے نزدیک ٹام کھڑا تھا۔ یہ سن کر وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر کمرے میں گیا اور کہنے لگا:

"سرکار، یہاں تو کوئی بھی نہیں۔"

ہورک کی زبانی یہ قصہ سن کر میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے اُسے دماغی طاقت کی ایک دوا استعمال کرنے کا مشورہ دے کر رخصت کر دیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہورک اپنے ضمیر کی ملامت کے باعث پریشان ہے اور ٹام کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے۔

ابھی مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہو گا کہ ہورک دوبارہ میرے پاس آیا۔ اس مرتبہ اس کی حالت پہلے سے بھی ابتر تھی۔ چہرہ ہلدی کی مانند زرد تھا اور وہ خشک تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے ہانپتے ہوئے کہا:

"ڈاکٹر، گزشتہ رات میں نے اُسے پھر دیکھا ہے..... میں ڈائننگ روم میں سے گزر رہا تھا کہ دفعتہ مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ڈائننگ روم کے دروازے کے ساتھ ہی سیڑھیاں ہیں۔ جب میں نے نگاہ اٹھائی تو وہ سب سے اوپر کی سیڑھی پر کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں تاروں کی مانند چمکتی تھیں اور سر ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ اُف خدایا..... مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قلب کی حرکت بند ہو جائے گی۔ میں بے اختیار چیختا ہوا وہاں سے باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ باورچن اس وقت ہاتھوں میں شوربے کا بھرا ہوا برتن لے کر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے اس حال میں دیکھا تو برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے کیور کو اس کے کوارٹر میں پایا۔ وہ فوراً میرے ساتھ ڈائننگ روم میں آیا، لیکن ٹام جا چکا تھا۔ کیور کہنے لگا کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے، مگر میں نے قسمیں کھا کر کہا کہ ابھی چند لمحے پہلے میں نے اُسے سیڑھیوں پر کھڑے دیکھا ہے۔"

میں نے ہورک کو گرم گرم قہوے کی ایک پیالی پلائی، تب اُسے کچھ سکون ہوا۔ پھر اس نے کہا:

"ڈاکٹر، خدا کے واسطے میری مدد کرو..... میں واقعی اس معصوم بچے کا قاتل ہوں..... لیکن میں نے اسے جان کر نہیں مارا۔ وہ تو اتفاقی حادثہ تھا۔ اب اس کی روح زندگی بھر اسی طرح مجھے ستاتی رہے گی۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کینن ہال میں رہنا چھوڑ دیں؟"

"آہ..... یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔" ہورک نے کہا۔ "مگر اس میں کئی قباحتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ گاؤں والے چہ میگوئیاں کریں گے اور دوم یہ کہ میں خواہ کہیں چلا جاؤں ٹام کی روح میرا تعاقب کرے گی۔"

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ میرے پاس دراصل اُسے تسلّی دینے کی کوئی صورت نہ تھی۔

اگلے روز میں نے کینن ہال جانے کا ارادہ کیا۔ اس کا مقصد کیور سے دو دو باتیں کرنا تھا۔ جب میں اپنی گھوڑا گاڑی سے اُتر کر اُن کوارٹروں کی طرف چلا جن میں نوکر رہتے تھے، تو میں نے کیور کو دیکھا کہ صحن میں کھڑا لکڑیاں چیر رہا ہے۔ جونہی اُس کی میری آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری آمد سے خوش نہیں ہوا، بلکہ نہایت بیزاری سے جلدی جلدی کلہاڑا چلانے

لگا۔ میں چند لمحے اس کے پاس کھڑا رہا اور جب اس نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی، تب میں نے ڈھیٹ بن کر کہا:

"کیور، میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی، فرمایئے؟" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں مسٹر ہورک کا نہ صرف پرانا دوست ہوں، بلکہ ان کا ذاتی معالج بھی ہوں۔ آج کل مسٹر ہورک ذہنی طور پر بہت زیادہ پریشان ہیں اور مجھے اُن کی جسمانی صحت کی طرف سے بھی خطرہ لاحق ہوتا جا رہا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ مسٹر ہورک ہی سے دریافت کیجیے۔"

"گزشتہ تین ماہ سے مسٹر ہورک کینن ہال میں کسی بدرُوح کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کا ذکر انہوں نے مجھ سے کیا ہے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں نے کسی بدرُوح کو نہیں دیکھا اور نہ مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی ہے۔" کیور نے غرّا کر کہا۔

"مگر مسٹر ہورک نے یہ تمام حالات تمہیں بتائے تو ہیں۔"

"میں معافی چاہتا ہوں جناب، مزید گفتگو کرنے سے قاصر ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے کلہاڑا کندھے پر رکھا اور تیزی سے دوسری طرف چلا گیا۔ اس کے اس گستاخانہ رویّے سے مجھے بے حد صدمہ ہوا، مگر میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

"دیکھو کیور، تمہارا یہ رویّہ ناقابلِ برداشت ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "کیا تمہیں اپنے آقا کے دوست اور معالج سے اسی انداز میں گفتگو کرنی چاہیے تھی؟ بہتر یہ ہے کہ تم حالات کو ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر خدانخواستہ مسٹر ہورک کو کچھ نقصان پہنچا تو تم بھی محفوظ نہ رہو گے۔"

"ڈاکٹر صاحب، آپ مجھ سے اس موضوع پر کچھ نہ کہیے ورنہ میں مزید گستاخی پر مجبور ہو جاؤں گا۔" کیور نے جھلا کر کہا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ میں خون کے گھونٹ پیتا ہوا چلا آیا۔ اگر میں کیور کی اس بدتمیزی کی خبر ہورک کو دیتا تو وہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا، تاہم میں نے منہ بند رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

چند روز بعد میں صبح صبح کینن ہال کی طرف گیا۔ گھوڑا گاڑی سے اُتر کر وسیع لان میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک جانب ہورک اوندھے منہ پڑا دکھائی دیا۔ نرم گیلی زمین پر اس کے جُوتوں کے نشان بھی عقب میں دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ میں نے اُسے اپنے کوچبان کی مدد سے اٹھایا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ نبض بے حد سُست رفتار سے چل رہی تھی۔ اتنے میں کینن ہال کے کئی نوکر بھی آ گئے اور وہ اپنے آقا کو اٹھا کر بڑے کمرے میں لے گئے۔ چند لمحے بعد ہورک نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ برسوں کا مریض نظر آتا تھا۔ ایسا مریض جس کے جسم سے خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اُس نے اشارے سے سب نوکروں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ جب کمرہ خالی ہو گیا تو اُس نے ہلکی آواز میں کہا:

"ڈاکٹر، میں نے کل رات اُسے پھر دیکھا۔ میں اپنی خواب گاہ میں گیا اور بستر پر لیٹ کر کمبل اوڑھا ہی تھا کہ معاً دروازہ زور سے کھلا اور ٹام کھڑا دکھائی دیا۔ موم بتی کی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ سنگِ مرمر کی طرح سفید، مگر بے جان نظر آتا تھا۔ اُس کی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور ان سے ناقابلِ بیان نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا تھا۔ دہشت سے میری چیخ نکل گئی۔ پھر میں نے سیڑھیوں میں کسی کے اُترنے کی آواز سُنی۔ میں بستر سے نکلا اور سوچے سمجھے بغیر سیڑھیوں کی طرف

گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس وقت مجھے بالکل احساس نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ جب میں لان میں آیا تو کچھ فاصلے پر ایک سایہ سا نظر آیا۔ میں اس کی طرف لپکا، مگر ٹھوکر کھا کر گرا۔ اس کے بعد اب ہوش آیا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ساری رات باہر لان میں بے ہوش پڑے رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کیوڈ کہاں ہے؟"

"وہ تو کل دوپہر سے کہیں گیا ہوا ہے۔ آج سہ پہر تک آ جائے گا۔"

دو گھنٹے بعد پتہ چلا کہ کیوڈ آ گیا ہے اور اس وقت اصطبل میں ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ منہ پھیر کر چلا گیا۔

اس حادثے کے بعد میں پھر کینن ہال نہ گیا۔ ہورک سے کبھی کبھار گاؤں میں ملاقات ہو جاتی۔ ٹام کی روح بدستور اسے پریشان کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہورک سوکھ کر کانٹا ہو رہا ہے۔ اس پر دیوانگی سی طاری رہنے لگی۔ اکثر شناساؤں کے قریب سے گزر جاتا اور انہیں نہ پہچانتا۔ پھر ٹام کی موت کے ٹھیک ایک سال بعد میں نے سنا کہ ہورک نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ وہ بالکل پاگل ہو چکا تھا۔

ہورک کے مرتے ہی کینن ہال کے ملازم ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ کیوڈ بھی جا چکا تھا۔ اس کے بعد کینن ہال کے دروازے بند کر دیے گئے اور آہستہ آہستہ لوگوں میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہونے لگیں۔ کینن ہال کو آسیب زدہ قرار دے دیا گیا۔

ہورک کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے اعصاب فولادی تھے۔ بھوت پریت پر اس کا قطعاً اعتقاد نہ تھا اور نہ وہ فریب نظر کا شکار ہو سکتا تھا۔ پھر یہ کیا بات تھی جس نے ہورک کو اس انجام پر پہنچایا؟ فرصت کے لمحات میں میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا، مگر سرا ہاتھ نہ آتا۔

ہورک کی موت پر چھ مہینے گزر گئے۔ ایک روز دوپہر کے وقت میں گھومتا پھرتا کینن ہال کی طرف جا نکلا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ میں عمارت کے چاروں طرف گھوما اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اصطبل کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ میں اندر گیا۔ ہر طرف گرد ہی گرد تھی اور مکڑیوں کے بڑے بڑے جالے تنے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کے بے کار ساز، لوہے کے نال اور لید کا انبار بھی لگا تھا۔ میں واپس آنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک سیڑھی پر گئی جو اصطبل کے ایک گوشے میں دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ بھلا یہاں سیڑھی کا کیا کام؟ میں محض تجسس کی تسکین کے لیے سیڑھی پر چڑھا کیا دیکھتا ہوں کہ اصطبل کی چھت کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی ہے۔ جب میں نے اس میں جھانکا تو ایک کرسی، ایک لوہے کا بوسیدہ پلنگ، چند میلے کپڑے، کچھ برتن اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے پڑے دکھائی دیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص اس کوٹھڑی میں رہتا رہا ہے۔ ایک گوشے میں سڑے ہوئے دودھ سے بھرا جگ بھی رکھا تھا۔ میں نے بہت دماغ لڑایا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کسی شخص کو یہاں چھپ کر رہنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔

چار سال بیت گئے۔ اس دوران میں مجھے نیوآرک ٹاؤن سے سو میل دور ایک گاؤں میں جانا پڑا۔ وہاں کوئی تقریب تھی۔ میں جس دوست کے گھر ٹھہرا تھا، ایکا ایکی اس کا بڈھا باپ چل بسا۔ میں جنازے کے ساتھ قبرستان تک گیا۔ ایک قبر کے قریب سے گزرتے ہوئے یک لخت میری نگاہ اس پتھر پر پڑی جو قبر پر لگا ہوا تھا۔ میرے قدم وہیں رک گئے اور پھر آنکھوں کے آگے سے پردہ ہٹ گیا۔ قبر کے اس پتھر نے ٹام کیوڈ کی روح اور ہورک کینن کی خودکشی کا راز

فاش کر دیا تھا۔

قبرستان سے واپس آکر میں نے لوگوں سے کیوَر کے بارے میں پوچھا کہ کوئی اسے جانتا ہے۔ تقریباً ہر شخص نے اقرار کیا کہ کیوَر کو کون نہیں جانتا۔ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا، مگر اب بہت دن سے نہ معلوم کہاں ہے۔ جب اس کی بیوی دو لڑکوں کو چھوڑ کر انتقال کر گئی تو کیوَر اپنے لڑکوں کو لے کر کہیں چلا گیا تھا۔ پھر عرصے بعد وہ اپنے ایک لڑکے کی میت لے کر گاؤں میں آیا اور اپنی بیوی کی قبر کے پاس دفنا دیا۔ اس لڑکے کے بارے میں اس نے گاؤں والوں کو بتایا کہ وہ ایک حادثے میں مر گیا تھا۔ چند روز گاؤں میں رہنے کے بعد وہ دوسرے لڑکے کو لے کر واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد پھر لڑکے سمیت واپس آیا اور بتایا کہ اس کا آقا خودکشی کر کے مر گیا ہے۔ سب نے افسوس کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ اب کیوَر یہیں رہے گا، لیکن وہ پھر کہیں چلا گیا اور اب تک لوٹ کر نہیں آیا۔"

اس مرحلے پر میں نے ڈاکٹر مارلین کی بات کاٹی اور کہا:

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیوَر کے گاؤں والوں نے کہا کہ وہ لڑکے کو لے کر واپس چلا گیا۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے جبکہ۔۔۔"

ڈاکٹر مارلین کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے کہا:

"آہ ۔۔۔ یہی تو اصل راز ہے۔ کینن ہال اور اس کے نواح میں رہنے والے لوگ یہی جانتے تھے کہ کیوَر دوسرے بیٹے ہنری کو اپنے گاؤں میں چھوڑ آیا ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہ تھی۔ ہنری بلاشبہ اپنے باپ کیوَر کے ساتھ گیا تھا، لیکن وہ زندہ نہیں تھا۔ بلکہ کیوَر اسے وہاں دفن کرنے گیا تھا اور وہ اسی لڑکے کی قبر تھی جسے میں نے دیکھا۔ پتھر پر ہنری کیوَر کا نام، عمر اور تاریخ وفات درج تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کینن ہال میں ہورک کے ہاتھوں جو لڑکا مارا گیا وہ ٹام نہیں ہنری تھا۔"

میں حیرت سے ڈاکٹر مارلین کا منہ تکنے لگا۔

"خدا کی پناہ۔" میں چلا اٹھا۔ "اس کے معنی یہ ہیں کہ۔۔۔"

"جی ہاں، اس کے معنی یہ ہیں کہ کیوَر نے نہایت عمدہ ناٹک رچایا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہورک نے جب لڑکے کو طمانچہ مارا اور وہ آتش دان میں جا گرا تو اس وقت ہورک نے لڑکے کی شکل نہ دیکھی تھی اور جب وہ مر گیا تب بھی ہورک اس کی صورت دیکھنے نہ پایا۔ جب اس نے کیوَر سے اس حادثے کا ذکر کیا اور وہ کمرے کے اندر گیا تو اس نے دیکھا کہ ہنری مرا پڑا ہے اور اس مختصر سے وقفے ہی میں کیوَر نے اپنے آقا سے انتقام لینے کی انوکھی تدبیر سوچ لی۔ اس نے باہر آکر ہورک کو بتایا کہ ٹام مر گیا۔ پھر وہ ہنری کی لاش لے کر اپنے گاؤں میں گیا اور ٹام کو بھی ساتھ لے گیا۔ کچھ عرصے بعد ٹام کو واپس لے آیا اور اسے اصطبل میں بنی ہوئی خفیہ کوٹھڑی میں چھپا دیا۔ پھر اس نے لڑکے کو سکھا پڑھا کر بدروح میں تبدیل کر دیا اور پورے ایک سال تک ہورک کو عذاب میں مبتلا کیے رکھا حتیٰ کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہوگیا۔ یہ ہے داستان کینن ہال کے آسیب کی جو چالیس برس سے گاؤں میں مشہور ہے۔"

خوف زدہ نرس نے دیکھا، میری بیوی پر دو ہری پرچھائیاں تھیں،
وہ چیخی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی،
ایک خونی تصویر کا شاخسانہ۔

خونی تصویر

ٹام ھڈ

میری چھوٹی بہن لیٹی میرے ساتھ رہتی تھی۔ شادی سے قبل گھر کی دیکھ بھال وہی کیا کرتی تھی۔ میری شادی کے بعد سے وہ میری بیوی کی عزیز ترین سہیلی بن گئی۔ پھر میرے بچے ہوئے تو وہ لیٹی سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کرتے۔ ہر قسم کا آرام و سکون میسر ہونے کے باوجود لیٹی کے چہرے پر سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔ اس سنجیدگی کے پس منظر میں ایک دردناک کہانی ہے جسے آپ محبت کی ناکامی کہہ سکتے ہیں یا ٹوٹے ہوئے دل کا المیہ۔ اسی غم نے اسے دنیا سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اب وہ حزن و ملال کا ایک حسین مجسمہ ہے۔

جارج میسن میری بیوی کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ سمندر میں ملاحی کی زندگی بسر کرنے میں گزرا تھا۔ اس کی اور لیٹی کی ملاقات میری شادی کے موقعے پر ہوئی اور دونوں ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے۔ جارج کے والد کی زندگی بھی سمندر میں گزری تھی اور قطب شمالی و جنوبی کی مہم پر جانے والے ملاحوں

کی مہم کا بانی وہی تھا لیکن ناکام رہا۔ جارج نے اس ناکام مہم کو سَر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کا یہ شوق فطری تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹیم پائینرز (Pioneer) نامی جہاز پر قطب شمالی کی مہم پر روانہ ہونے والی تھی۔ جارج بھی اس میں شامل تھا۔

لیٹی کو جارج کے اس ارادے سے بالکل اتفاق نہیں تھا لیکن جارج نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ اتنی دور نہیں جائیں گے کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔ چنانچہ لیٹی دل پر پتھر رکھ کے خاموش ہو گئی لیکن وہ مطمئن نظر نہ آتی تھی۔ وہ بالکل نہ چاہتی تھی کہ جارج اتنے طویل عرصے کے لیے اس سے جدا ہو اور اس قدر پُرخطر مہم پہ جائے۔ اس کے چہرے پر اُداسی کے بادل چھا جایا کرتے تھے یہ اُداسی اب اس کی زندگی کا جز بن گئی ہے۔

میرا چھوٹا بھائی ہیری ان دنوں مصوری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ تمام مصوروں کی طرح اس کے ذہن میں بھی فنی نظریات پروان چڑھ رہے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ جارج کے چہرے میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک فن کار کی توجہ کا مرکز بن سکتی ہیں اور جن کو تخلیق کرنے میں ایک فن کار مسرت محسوس کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے شب و روز کی محنت کے بعد جارج کی ایک قدِ آدم تصویر بنائی۔ تصویر بہت جاذبِ نظر تھی اور ہیری کی فن کارانہ صلاحیتوں کی عکاسی کرتی تھی تصویر کا پس منظر بہت گہرا اور تاریک تھا۔ اس کی وجہ سے جارج کا سرخ و سپید چہرہ تصویر میں بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ جیسے وہ تاریکیوں میں سے اچانک سامنے نکل آیا ہو۔ تصویر میں جارج کا صرف ایک ہاتھ نظر آتا تھا جسے اس نے تلوار کے قبضے پر رکھا ہوا تھا۔ جارج اس تصویر کو دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ وہ اس تصویر میں ملاح کی بجائے فوج کا کمانڈر معلوم ہوتا ہے۔ تصویر لیٹی کو بہت پسند تھی۔ اس نے اس پر نفیس فریم چڑھوانے کے بعد کھانے کے کمرے میں آویزاں کروا دی جہاں وہ ہماری نظروں کے سامنے رہتی۔

جارج کے رخصت ہونے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ پائینر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھا اور ملاح صرف حکم کے منتظر تھے۔ جارج کی دوستی جہاز کے ڈاکٹر ونسٹ گریو سے ہو گئی۔

ایک روز جارج نے مجھ سے اپنے اس نئے دوست کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔ بے چارہ بالکل تنہا ہے۔ میرے علاوہ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

اور ایک روز جارج ڈاکٹر گریو کو میرے گھر لے آیا۔ اس کے بعد بھی وہ ایک دو بار کھانے پہ ہمارے گھر آیا۔ سچ پوچھئے تو میں اس سے مل کر ذرا بھی خوش نہیں ہوا بلکہ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ڈاکٹر گریو کو اپنے گھر آنے کی اجازت دی۔ وہ دراز قد اور زرد رُو نوجوان تھا اس کے چہرے سے ایک عجیب قسم کی درشتی جھلکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیوانیت کی چمک تھی۔ بہر حال یہ شخص مجھے بالکل پسند نہ آیا۔

سب سے زیادہ ناگوار بات یہ تھی کہ وہ ضرورت سے زیادہ لیٹی کی سمت متوجہ نظر آتا تھا۔ اس کا اس حد تک لیٹی میں دلچسپی لینا مجھے قطعاً پسند نہ تھا۔ وہ ہر وقت لیٹی کے پیچھے لگا رہتا اور بالکل بے تکلفانہ انداز میں اس سے گفتگو کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ خود جارج کو بھی اس کی یہ حرکت پسند نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی وہ دوستی کے خیال سے خاموش رہتا تھا۔ لیٹی کو بھی اس کا یہ رومانی انداز اچھا نہ لگتا تھا لیکن ڈاکٹر کو ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

وہ بے حد خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ میں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ جارج کی قدِ آدم تصویر کو دیکھ کر وہ مضطرب ہو جایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب اس نے پہلی مرتبہ تصویر کو دیکھا تو اس کے چہرے پر اضطراب کا نمایاں تاثر آ گیا تھا۔ پھر میں نے خاص طور پر دیکھا جیسے وہ تصویر سے نظریں چرا رہا ہو۔ اس پر اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور جب ڈنر کا وقت آیا تو اتفاق سے اسے تصویر کے بالکل مقابل جگہ ملی۔ وہ ذرا سا ہچکچایا لیکن کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر بیٹھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

'یہ ۔۔۔ یہ تصویر بہت عجیب ہے'! ۔۔۔ اس نے کہا۔
'معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ میں اس تصویر کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا۔'
'تصویر میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ مسٹر گریو' میں نے

کہا۔ معلوم نہیں آپ کیا محسوس کر رہے ہیں:

مجھے مصوّری سے کوئی لگاؤ نہیں ہے: اس نے بے چینی سے کہا۔ یہ تصویر کچھ اس طرح گھورتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ میں اس کی نظروں کی تاب نہیں لا سکتا۔ مصوّری کے متعلق یہ احساس مجھے وراثت میں ملا ہے۔ میری ماں نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی اور جب میں پیدا ہوا تو سنا ہے کہ ماں کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی جب اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی اور جنونی کیفیت میں افاقہ ہوا تو اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ سامنے لگی ہوئی میرے نانا کی تصویر کو کہیں ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ وہ ہر لمحہ اسے خوفناک انداز میں گھورتی رہتی تھی۔ یہ بات آپ کو کچھ عجیب سی معلوم ہوگی اور آپ اسے واہمہ قرار دیں گے۔ لیکن میں نے فطری طور پر وہی طبیعت پائی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اس تصویر کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں — وہ اپنا صحیح نفسیاتی تجزیہ کر رہا تھا جو میرے لیے قابلِ فہم تھا۔

ہم نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر ہمارے ہاں آئے لیکن ایک روز وہ بن بلائے آگیا۔ اس روز کے بعد وہ ہر روز کسی نہ کسی وقت آنکلتا اب وہ جارج سے بھی زیادہ میرے گھر آنے لگا تھا۔ کیونکہ جارج کو اپنے فرائض کی انجام دہی سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد آ ٹپکتا۔ لیٹی اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے سے اس سے ضرور ملاقات کر لیتا۔ عام طور پر وہ جارج کی طرف سے کوئی نہ کوئی فرضی پیغام لے کر آتا تھا۔ اس طرح اس کی رسائی لیٹی تک آسان ہو جاتی تھی۔

جارج کے جہاز کی روانگی سے ایک روز قبل لیٹی بہت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آئی اور مجھے بتایا کہ ڈاکٹر گریو نے اس سے اظہارِ محبت کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اس کی منگنی کے متعلق جانتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی محبت کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو گی لیٹی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے بہت سختی سے ڈاکٹر کو ڈانٹ دیا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے ڈھٹائی سے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے مایوسی کے سوا کچھ نہ دو گی۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اظہارِ محبت میں کوئی حرج نہیں سمجھا کیونکہ مستقبل میں بہت سے ایسے واقعات پیش آ سکتے ہیں جن سے تمہارا اور جارج کا رشتہ منقطع ہو سکتا ہے۔ اور اس وقت مجھے امید ہے کہ تم اس شخص کو فراموش نہیں کرو گی جس نے اپنے دل میں تمہاری محبت کی شمع روشن کر لی ہے۔

میں غصے کے عالم میں اس ذلیل شخص سے باز پرس کے لیے اٹھا لیکن لیٹی نے بتایا کہ وہ جا چکا ہے اور میں نے صاف صاف اسے منع کر دیا ہے کہ اب وہ کبھی ہمارے گھر میں قدم نہ رکھے۔ دراصل وہ معاملے کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر جارج کو اس کا علم ہوا تو بات بڑھ جائے گی اور معلوم نہیں کیا ہو جائے۔

جہاز کی روانگی کے دن ڈاکٹر گریو ہمارے گھر نہ آیا۔ جارج شام ہی سے ہمارے گھر آگیا تھا اور صبح تک ہمارے ہاں ہی رہا۔ صبح ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس کو الوداع کہنے کے بعد جب میں گھر آیا تو بے چاری لیٹی ایک صوفے پر پڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔ کمرے میں دھندلکا سا چھایا ہوا تھا۔ میری نظر نادانستہ طور پر سامنے لگی ہوئی جارج کی تصویر پر جا پڑی اور مجھے اس کا چہرہ عجیب پُراسرار انداز میں لیٹی کو گھورتے ہوئے محسوس ہوا۔ کسی نامعلوم جذبے کے تحت میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور تصویر کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ تصویر بھیگی سی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ لیٹی کے آنسوؤں کی نمی ہو گی میں اس کی محبت کی دیوانگی کو خوب جانتا تھا۔

تھوڑے دنوں بعد ایک روز میں ہیری سے بات کر رہا تھا کہ لیٹی کس حد تک جارج سے محبت کرتی ہے۔ اس ضمن میں میں نے اس واقعے کا بھی ذکر کیا۔ لیٹی نے قسم کھا کر کہا کہ وہ جارج کی تصویر کے قریب بھی نہیں گئی اور نہ اس کا آنسو تصویر پر گرا ہے۔

"دھندلکے کی وجہ سے رنگ کی چمک کو تم نے نمی سمجھ لیا ہو گا: ہیری نے کہا اور بات ٹال دی لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ بات ہرگز نہ تھی۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اتنا واضح اور نمایاں تھا کہ کسی غلطی

کا امکان بھی نہ تھا۔

"پائنیر" جہاز اپنے مسافروں کو لے کر قطب شمالی کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد لیٹی کو جارج کے دو خط ملے۔ دوسرے خط میں جارج نے لکھا تھا کہ اب وہ شاید ہی کوئی خط لکھ سکے۔ کیونکہ وہ قطب شمالی کے اس ویران علاقے میں داخل ہو چکے ہیں جہاں رسل و رسائل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور جس جگہ اب تک سیاحوں اور مہم جوؤں کے قدم نہیں پہنچے۔ وہ سب اس خطرناک مہم پر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک نئی منزل کی جستجو ان کو مسلسل آگے بڑھنے پر اکسا رہی تھی۔ وہ سب خوش و خرم تھے اور ڈاکٹر گریو بھی آزادی کے ساتھ ان کی دلچسپیوں میں شریک تھا کیونکہ جہاز کی روانگی کے بعد سے اب تک صرف ایک شخص بیمار ہوا تھا۔

اس کے بعد ایک طویل خاموشی طاری رہی اور پورا سال گزر گیا۔ بے چاری لیٹی کے لیے ہر لمحہ صبر آزما تھا۔ ایک مرتبہ اخبار کے ذریعے اس مہم کی خبر معلوم ہوئی وہ بدستور کامیابی سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے اور اب اس بحری علاقے میں پہنچ چکے تھے جہاں ہر سمت برف ہی برف تھی۔ بڑھنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے جہاز کو لنگر انداز کر دیا۔

ایک اداس شام کو ہم کھانے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ لیٹی ایک صوفے کی پشت سے سر ٹکائے کسی سوچ میں غرق تھی۔ میں اس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ میری کھڑکی کے پاس کھڑا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا میں میز کے پاس بیٹھا لیمپ کی روشنی میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ اچانک کمرے میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ہوا کا ایک یخ جھونکا کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے بالکل ساکت و جامد تھے لیکن موت کی سی سرد لہر کمرے میں پھیل گئی۔ صرف ایک لمحے کے لیے میں اور لیٹی دونوں ایک ساتھ کپکپا اٹھے۔ اس نے میری سمت دیکھا "کیسی سخت سردی ہو گئی تھی۔ میں تو کانپ اٹھی تھی۔" اس نے کہا "ہاں سرد ہوا کی لہر سی آگئی تھی" میں نے جواب دیا "جیسے یہ جھونکا سیدھا جارج کے پاس سے آیا ہو" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "وہ بے چارہ تو برفانی ہواؤں میں گھرا ہوا ہوگا۔"

اسی لمحہ میری نظر نادانستہ طور پر جارج کی تصویر کی جانب اٹھ گئی اور پھر جو کچھ میں نے دیکھا، اس نے مجھے دم بخود کر دیا اور خوف سے ایک بار پھر میرا دل کانپ اٹھا۔ کمرے میں ایک لیمپ روشن تھا لیکن اس کی روشنی سے پورا کمرہ روشن نہیں تھا۔ میری نظر جارج کی تصویر پر پڑی اور میں نے ایک عجیب بھیانک منظر دیکھا۔ تصویر میں ایک حیرت انگیز تبدیلی ہوئی میں نے بالکل نمایاں طور پر اس تبدیلی کو دیکھا۔ اتنا نمایاں اور واضح کہ کسی غلطی یا واہمے کا قطعاً امکان نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ تصویر میں جارج کے سر کی جگہ اچانک ایک کھوپڑی نے لے لی ہے۔ ہڈیوں کی خالی اور بھیانک کھوپڑی کو میں نے غور سے دیکھا لیکن یہ میرا واہمہ نہیں تھا۔ میں صاف طور پر اس کی آنکھوں کی جگہ دو سوراخ دیکھ رہا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے دانت خوفناک طور پر چمک رہے تھے۔ وہ صاف طور پر بلا گوشت پوست کی ایک کھوپڑی تھی۔ گالوں کی جگہ صرف چند ہڈیاں تھیں ——— موت کا چہرہ تھا ——— بھیانک موت کا ——!

میں حیرت زدہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تصویر کی سمت بڑھا لیکن جوں ہی میں قریب پہنچا۔ شدید سرد ہوا کی ایک لہر محسوس ہوئی۔ میں کانپ گیا۔ جب میں تصویر کے عین مقابل پہنچا تو وہ کھوپڑی غائب ہو چکی تھی اور جارج کا چہرہ حسب معمول موجود تھا۔

"آہ ——— جارج ———" میں نے اسی عالم میں کہا۔

لیٹی چونک پڑی۔ میرے لہجے نے اسے ڈرا دیا۔ "کیا۔ کیا مطلب ہے؟ کیا تم نے کچھ سنا؟ اوہ! رابرٹ خدا کے لیے مجھے سچ سچ بتاؤ!" وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔

"نہیں میری عزیز بہن نہیں، کوئی ایسی بات نہیں۔ ویسے ہی جارج کی تنہائی اور مصیبت کا خیال آگیا تھا۔ سردی کی اس لہر نے مجھے اس کی یاد دلا دی۔"

"سردی لگی——؟" ہیری نے مڑتے ہوئے چونک کر پوچھا۔ "بیری؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو—— اس جیسی گرم شام میں سردی؟ تمہیں وہم تو نہیں ہو گیا؟"

"میں نے اور لیٹی نے ایک یا دو منٹ قبل سردی کی ایک تیز لہر محسوس کی تھی، کیا تم کو احساس نہیں ہوا——؟"

"بالکل نہیں، حالانکہ میں کھڑکی کے پاس کھڑا تھا" ہیری نے کہا۔ "اگر سردی کی کوئی لہر آتی بھی تو پہلے مجھے اس کا احساس ہونا چاہیئے تھا۔"

بات عجیب تھی۔ بلاشبہ ذرا دیر پہلے کمرے میں ایک لمحہ کی کپکپا دینے والی سردی کی شدید لہر دوڑ گئی تھی۔ حالانکہ ہوا بند تھی۔ مجھے یقین سا ہونے لگا جیسے وہ کوئی آسیبی لہر ہو اور قطب شمالی سے آئی ہو۔

"آج کون سی تاریخ ہے ہیری——؟" میں نے پوچھا۔

"آج—— آج ۱۲ فروری ہے—— لیکن کیوں؟"

جب لیٹی کمرے سے نکل گئی تو میں نے ہیری کو بتایا کہ میں نے کیا محسوس کیا اور کس طرح وہ بھیانک کھوپڑی مجھے نظر آئی میں نے اس سے کہا کہ آج کی تاریخ اور دن نوٹ کر لے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ غریب جارج کو کوئی ہولناک حادثہ پیش آیا ہے۔

"تم کہتے ہو تو اپنی نوٹ بک میں لکھے لیتا ہوں رابرٹ، نہیں سچ پوچھو تو تم اور لیٹی مجھے واہمے کے مریض نظر آتے ہو۔ تم دونوں کا ہاضمہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا، اسی لیے تم دونوں کو سردی محسوس ہوتی ہوگی اور وہ کھوپڑی محض تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں۔"

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور بات کو ٹال دیا لیکن ہم دونوں نے اپنی اپنی نوٹ بک میں وہ تاریخ درج کر لی۔ لیٹی اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میری بیوی آ گئی: "تم لوگ کھڑکیاں کھول کر مت بیٹھا کرو" میری بیوی نے کہا "اس میں شک نہیں کہ آج کل موسم گرم ہے۔ مگر بعض اوقات ہوا کے سرد جھونکے آ جاتے ہیں۔ لیٹی کو شاید سردی لگ گئی ہے۔ وہ بری طرح کانپ رہی ہے۔"

میں نے اسے کچھ بھی نہ بتایا۔ مگر رات کو جب ہم اپنے کمرے میں اپنے بستروں پر دراز ہو گئے تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اپنی بیوی کو بتا دیا کہ میں نے کیا دیکھا تھا اور یہ کہ مجھے کس بات کا خدشہ ہے۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ بعد میں مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا کہ کیوں اسے یہ باتیں بتائیں۔

دوسری صبح لیٹی کی طبیعت ٹھیک ہو چکی تھی۔ میں نے اور میری بیوی نے گذشتہ شب کے واقعات کا اس کے سامنے بالکل تذکرہ نہیں کیا۔ چند روز بعد وہ واقعہ ذہن سے تقریباً اتر گیا۔ البتہ اس دن سے میں کسی بری خبر سننے کا منتظر تھا۔ میرے خدشات درست نکلے وہ منحوس خبر آ ہی گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی اور ہیری اندر داخل ہوا۔ اتنی صبح ہیری کبھی نہیں آتا تھا۔ اس لیے مجھے تعجب ہوا اس کا چہرہ زرد اور وہ گھبرایا ہوا سا تھا۔

"لیٹی کہاں ہے؟" اس نے پوچھا اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا۔ اس نے پھر پوچھا "آج کل تم کون سا اخبار پڑھتے ہو؟"

"ڈیلی نیوز—— لیکن کیوں؟"

"شکر ہے خدا کا—— لو پڑھو!"

اس نے جیب سے ایک مڑا تڑا اخبار نکالا اور میری سمت بڑھا کر سرورق کی ایک خبر کی طرف اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ کیا خبر ہو گی جوں ہی اس نے لیٹی کا نام لیا تھا میں سب سمجھ گیا تھا۔

خبر تھی—— "قطب شمالی کی مہم پر جانے والے جہاز "پائنیر" کے ایک افسر کو ہولناک حادثہ" تفصیل میں لکھا تھا—— "مہم پر جانے والا جہاز برفانی بحری علاقے میں گھرا ہوا ہے اور فی الحال اس کے آگے جانے کی کوئی امید نہیں۔ اشیاء خوردنی اور ضروریات کی چیزوں کی کمی کے باعث جہاز عنقریب واپس ہونے والا ہے اور مہم ملتوی کر دی گئی ہے۔ اسی اثنا میں بدقسمتی سے ایک ہولناک حادثہ پیش آ گیا۔ جہاز کا ایک نوعمر اور ہر دلعزیز افسر جارج مین برف پر شکار کھیلتے ہوئے موت کی نذر ہو گیا۔ وہ جہاز کے ڈاکٹر کے ہمراہ سفید

ریچرڈ کا شکار کھیلنے نکلا تھا۔

"شکر ہے کہ ڈیلی نیوز میں یہ خبر نہیں چھپی" میری نے کہا۔

"لیکن پھر بھی تم بہت محتاط رہو۔ یہ خبر لیثی تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ وہ اچانک جارج کی موت کے صدمے کی تاب نہ لا سکے گی حالانکہ اس بے چاری کو ایک نہ ایک دن یہ المناک خبر ضرور سننا ہے لیکن اس کے لیے اسے رفتہ رفتہ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔"

ہم دونوں نے پُرنم آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"لیکن اسے یہ اندوہناک خبر بہر حال سنانا ہی ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

میں نے اپنی بیوی کو بلایا اور اسے بھی اس المناک خبر سے مطلع کیا۔ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی۔ "لیکن میں کس طرح لیثی کو یہ منحوس خبر سناؤں؟ آہ مجھ میں اتنی ہمت ......"

"ہش — !" میری نے جلدی سے اس کا بازو دباتے ہوئے دروازے کی سمت اشارہ کیا — میں نے گھوم کر دیکھا لیثی سامنے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید تھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کرب و غم کا اتھاہ سمندر موجزن تھا۔ وہ دم بخود کھڑی ہمیں گھور رہی تھی۔ نہ معلوم کب سے وہ ہماری بے خبری میں وہاں کھڑی تھی۔ ہم ایک دم ساکت ہو گئے۔ وہ سب کچھ سن چکی تھی اور جب ہم اس کی سمت بڑھے تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہم سب کو ایک طرف کر دیا اور خاموشی کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے زینے طے کرتی اوپر چلی گئی۔ میری بیوی اس کے پیچھے بھاگی اور جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو لیثی فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔

ڈاکٹر کو فوری طور پر بلایا گیا۔ وہ ہوش میں آ گئی لیکن غم نے اسے تھوڑی ہی دیر میں بے حد کمزور کر دیا تھا۔ اس کا علاج ہم میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔ جارج اس کو زندگی کی راہوں پر تنہا بھٹکنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ جارج کی موت نے اس سے زندگی کا ہر احساس چھین لیا تھا۔ وہ زندہ تھی لیکن اس کی روح مر چکی تھی

اس کی مسرتوں کا چمن خاکستر ہو چکا تھا۔ اس کی مسکراہٹ چھن چکی تھی۔ تقریباً ایک ماہ بعد وہ اس قابل ہو سکی کہ نیچے والی منزل تک آ سکے۔ انہی دنوں میں نے ایک اخبار میں جہاز "پائنیر" کی واپسی کی خبر پڑھی لیکن اب یہ خبر ہمارے لیے کسی مسرت کا باعث نہ تھی اس لیے میں نے گھر پر کسی سے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ یوں بھی لیثی اس خبر سے غم زدہ ہونے کے علاوہ اور کیا کرتی اور میں اس کے دکھتے ہوئے دل کے زخموں کو تازہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

ایک روز میں کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی مجھے کسی نے پکارا۔ آواز کچھ مانوس سی معلوم ہوتی تھی۔ اچانک میری نظریں جارج کی تصویر پر پڑیں تو میں سہم گیا —

اف میرے خدا — میں خواب دیکھ رہا تھا یا یہ حقیقت تھی۔ جیسا کہ میں شروع میں بتا چکا ہوں کہ تصویر میں جارج کا ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھا ہوا تھا اور اب میں نے دیکھا کہ اس کی کلمہ کی انگلی میری جانب اٹھی ہوئی تھی جیسے خبردار کر رہی ہو۔ میں نے غور سے اسے دیکھا کہ یہ واہمہ تو نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ تصویر میں جارج کے چہرے پر تازہ اور سرخ خون کے دو قطرے چمک رہے تھے۔ میں اٹھ کر تصویر کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی یہ منظر معدوم ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ اٹھی ہوئی انگلی ایک بڑی اور سفید مکھی میں تبدیل ہو گئی جو تصویر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سرخ قطرے خون کے نہیں تھے بلکہ خون کی طرح کسی رقیق مادے کے قطرے تھے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ قطرے کہاں سے آئے ہیں۔

مکھی بری طرح تڑپ رہی تھی اس لیے میں نے اسے پکڑ لیا اور مینٹل پیس سے ایک گلاس اٹھا کر اس پر رکھ دیا۔ اتنے میں میرا ملازم ایک کارڈ لیے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے کارڈ دیکھا اس پر لکھا تھا — "ڈاکٹر ولسن کریز۔"

"میں نے انہیں ہال میں بٹھا دیا ہے۔" ملازم نے کہا۔

او خدا کا شکر ہے کہ لیثی گھر میں موجود نہیں ہے۔ میں نے سوچا

اور پھر [illegible] کھانا انہیں یہاں لے آؤ ---- اور دیکھو اگر تمہاری مالکہ ادھر [illegible] آجائیں تو ان سے کہنا کہ میں ایک صاحب سے کاروباری [illegible] میں مصروف ہوں۔ اس لیے وہ اس کمرے میں نہ آئیں۔

[illegible] نے ڈاکٹر گریگ کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے دیوار کے [illegible] تصویر دیکھی ہی تھی کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ اس تصویر کو ڈھانپ دیجئے تب میں اندر آؤں گا [illegible] اپنی وحشت پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے [illegible] کی تصویر دیکھ کر مجھے اب روحانی تکلیف ہوتی ہے۔

[illegible] اس کی وحشت کا راز سمجھ چکا تھا۔ میں نے میز سے میز پوش [illegible] تصویر پر ڈال دیا اور تب ڈاکٹر گریگ اندر داخل ہوا۔ وہ بہت [illegible] نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے [illegible] اندر کو دھنس گئے تھے۔ اس کے چہرے سے ایک [illegible] کی وحشت اور ہراس ٹپک رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ رہ رہ کر [illegible] اور ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے کسی شخص سے خوفزدہ ہو یا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اچانک پیچھے سے حملہ کر دے گا۔ [illegible] نے کبھی اسے پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا اور اب تو [illegible] ناپسندیدگی شدید نفرت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میں اس سے گفتگو کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے اس [illegible] سے ملنا کوئی خوشی نہیں ہوئی اور یہ کہ اب وہ آئندہ میرے [illegible] کی زحمت گوارا نہ کرے۔ میں صرف اس قدر اجازت دے رہا ہوں کہ جارج کی موت کے متعلق تمام واقعات سنا دے لیکن [illegible] حالت میں بھی اپنی بہن سے ملنے کی اجازت نہیں دوں گا۔

[illegible] نے خاموشی سے میری باتوں کو سنا اور پھر ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ تھوڑی دیر تک وہ خلا میں گھورتا رہا۔ پھر اس نے بتایا [illegible] کا منحوس دن تھا جارج اور وہ سفید ریچھ کے شکار پر نکلے ہوئے تھے کہ دور ایک برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی پر انہیں [illegible] ایک جوڑا نظر آیا۔ وہ اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ پہاڑی کی دوسری سمت ایک گہری کھائی تھی۔ برف کی وجہ سے پھسلن بہت تھی۔ اوپر پہنچ کر جارج ریچھ کا نشانہ لینے کے لیے ڈھلوان کی سمت اترنے لگا۔ میں نے چیخ کر اسے منع کیا اور اسے خبردار کیا کہ ڈھلوان پر اترنا خطرناک ہے۔ وہ میری آواز پر چونک کر رکا اور واپس مڑنے لگا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ چکنی ڈھلوان سے لڑھک گیا۔ میں خوف سے چیخ مار کر اس کی سمت لپکا اور فوراً اپنا کوٹ اتار کر بندوق سے باندھ کر اس کی سمت بڑھایا لیکن اتنی دیر میں وہ بہت نیچے جا چکا تھا اور میری پہنچ سے باہر تھا۔ اس کے بچاؤ کی اس وقت اور کوئی صورت بھی نہ تھی۔ جارج نے چلا کر مجھے الوداع کہی اور کہا کہ میں آپ اور للی تک اس کا آخری سلام پہنچا دوں۔ ...

ڈاکٹر کی آواز لرز اٹھی۔ اس نے کہا۔ اور دوسرے لمحے سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔ جارج تیزی سے گہرائیوں کی طرف پھسلتے ہوئے ایک بار پھر مجھے نظر آیا ---- اور پھر موت کی اس گہری کھائی میں روپوش ہو گیا ---

ڈاکٹر کا چہرہ بھیانک طور پر زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں جیسے باہر کو ابل آئیں۔ وہ اچھل کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری پشت پر کسی کو اشارہ کیا اور پھر اچانک ایک خوفناک چیخ مار کر وہ فرش پر گر پڑا جیسے کسی نے اسے گولی مار دی ہو۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے سفید سفید جھاگ بہہ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے پلٹ کر اپنی پشت کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ جارج کی تصویر پر سے میز پوش سرک کر نیچے گر پڑا تھا۔ اور جارج کی آنکھیں بے ہوش ڈاکٹر کو گھور رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان آنکھوں میں اچانک تیز سرخی نمودار ہو گئی تھی۔ میں نے ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ عین اسی وقت خوش قسمتی سے میری بیوی آ گئی۔ میں نے مختصراً اسے سب واقعہ بتایا۔ ملازم کے آنے پر ہم تینوں نے مل کر بے ہوش ڈاکٹر کو صوفے پر لٹا دیا۔ اس کا جسم ذرا ذرا دیر کے وقفے کے بعد کانپ اٹھتا تھا جیسے اس پر خوف و ہراس کا

شدید لرزہ طاری ہو۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے بتایا کہ کچھ عرصے سے اس پر اس قسم کے دورے پڑتے ہیں اور اسی کے باعث اس کی صحت بے حد خراب ہو گئی ہے۔ اس نے بہت بے چینی کے ساتھ دریافت کیا کہ دوران بے ہوشی اس نے کوئی خاص بات یا حرکت تو نہیں کی تھی؟ اور جب میں نے یقین دلایا تو اس نے معافی مانگی کہ اس کے دورے کی وجہ سے ہم سب کو اس قدر زحمت برداشت کرنی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ معاً اس کی نظر مینٹل پیس پر رکھے ہوئے گلاس پر پڑی جس میں میں نے جارج کی تصویر سے وہ سفید مکھی پکڑ کر ڈال دی تھی۔

"او ہو تو میری آمد سے قبل بھی پائنیر جہاز سے کوئی یہاں آ چکا ہے؟" اس نے اضطراب کے ساتھ کہا۔

"نہیں تو — یہاں تم سے پہلے اور کوئی نہیں آیا —" میں نے حیرت سے کہا۔

"تو پھر یہ مکھی کہاں سے آئی؟ یہ دنیا کے اس حصے میں کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔ صرف قطب شمالی کی آخری حدوں میں ایسی مکھیاں ہوتی ہیں — یہ آپ کو کہاں سے ملی ہے؟"

"یہ تو میں نے اس کمرے میں سے پکڑی تھی" میں نے دانستہ طور پر جارج کی تصویر کا ذکر نہ کیا۔

"مطلب ہے — کہ یہاں [illegible] بارش ہوتی ہوگی؟"

"کیا مطلب —" جب میں [illegible] دیکھا۔

"یہ مکھیاں بڑی عجیب ہوتی ہیں" [illegible] نے کہا "ان کے جسم سے خون کی طرح ایک رقیق مادہ رستا رہتا ہے۔ قطب شمالی کے بعض برفانی علاقوں میں اکثر دور دور تک ایسے سرخ قطرے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سفید سفید برف پر خون کی بارش ہوئی ہو۔ حالانکہ وہ اس مکھی کے پیٹ سے رستا ہوا مادہ ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے دیکھا تو گلاس کی تہہ میں بھی متعدد سرخ قطرے چمک رہے تھے۔ میں یوں ہی حالیہ واقعہ کے

آگے آگے دیکھئے

- ۱۰۰ سال پہلے کی عورت حرم سرا کی اُونچی دیواروں کے پیچھے چھپی ہوتی تھی۔
- ۷۵ سال پہلے کی عورت بھرپور برقعے میں ملبوس تھی۔
- ۵۰ سال پہلے کی عورت اس برقعے میں ملبوس تھی جس کے نقاب پر ایسی جالی تھی جس میں اس کا چہرہ بدلی میں چھپے چاند کی طرح جھلکتا تھا۔
- ۲۵ سال پہلے کی عورت اس برقعے میں ملبوس تھی جس کا نقاب اُٹھا ہوا ہوتا تھا۔
- ۱۰ سال سے عورت صرف شلوار قمیص دوپٹے اور ساڑھی میں ملبوس ہے۔
- دس سال سے عورت "دوپٹے" کی بجائے صرف "ایک پٹہ" اوڑھ رہی ہے۔

اب آگے کی منزلوں کو "چشم تصور" سے دیکھئے گا۔

"میں دندان ساز کا پیشہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

متعلق سوچتا تھا سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا میں نے ڈاکٹر کو گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا جب وہ سڑک پر آیا تو اچانک مجھے ایک بہت عجیب بات نظر آئی۔ میں نے جلدی سے ہیری کو پکارا۔ وہ فوراً ہی میرے پاس آگیا۔

"کیا بات ہے رابرٹ؟"

"تم ایک مصور ہو مجھے بتاؤ کہ اس جاتے ہوئے شخص میں تمہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آرہی ہے؟"

"نہیں کچھ نہیں تو ــــ" ہیری نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر فوراً ہی اس کا لہجہ تبدیل ہوگیا۔ "ہاں ــــ ہاں ــــ میرے خدا یہ کیا ــــ اس کی دو پرچھائیاں ہیں ــــ"

اور پھر مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر کیوں چونک چونک کر ادھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا۔ بظاہر اس کے آس پاس کوئی نظر نہیں آتا تھا لیکن پھر بھی اس کے برابر کسی اور کی پرچھائیں روشنی میں برابر دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ میں اور ہیری حیرت زدہ اسے دیکھتے رہے جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو میں نے ہیری کو تاکید کی کہ آج کے واقعہ کے متعلق کسی سے کوئی ذکر نہ کرے۔

اس واقعہ کے ہفتہ بھر بعد ایک روز جب میں ہیری کے سٹوڈیو سے گھر واپس پہنچا تو گھر کے سب افراد کو عجب پریشانی کے عالم میں دیکھا۔ لیٹی نے میرے استفسار پر مجھے بتایا کہ وہ تنہا کھانے کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر گریو بلا دستک دیئے اندر داخل ہوا۔ لیٹی نے دیکھا کہ وہ جارج کی تصویر سے نظریں چرا رہا تھا اور اس کے بجائے اس کے سامنے بیٹھنے کے وہ جارج کی تصویر کے نیچے رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ لیٹی نے اسے فوراً باہر نکل جانے کے لیے کہا لیکن اس نے کوئی توجہ کیے بغیر اظہارِ محبت شروع کر دیا۔ اتنے میں جارج کی تصویر دیوار پر سے اس زور سے ڈاکٹر کے سر پر گری کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ لیٹی نے ملازموں کی مدد سے اسے اوپر میرے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ جس نے زخم دیکھنے کے بعد بتایا کہ زخم گہرا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ ڈاکٹر گریو کو دماغی بخار کیوں کر ہوگیا ہے۔ جب لیٹی نے بتایا کہ وہ حال ہی میں قطب شمالی کی مہم سے واپس آیا ہے تو ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا کہ ممکن ہے وہاں کی صعوبتوں نے اس کے دماغ کو کمزور کر دیا ہو۔

میں نے فوری طور پر ڈاکٹر گریو کی تیمارداری کے لیے ایک نرس کو مقرر کر دیا۔ اسی رات کو نصف شب کا واقعہ ہے کہ ایک بھیانک چیخ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں بھاگا بھاگا ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا۔ لیٹی مجھ سے پہلے پہنچ کر فرش پر بے ہوش پڑی ہوئی نرس کو اٹھا رہی تھی۔ ڈاکٹر مسہری پر پڑا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ نرس نے ہوش میں آنے کے بعد بتایا کہ ڈاکٹر گریو اچانک جنون کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ایسی خوفناک اور بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا کہ نرس جا کر لیٹی کو بلا لائی اور تب ان کی نظر ایک سائے پر پڑی جو مسہری پر تھا۔ خوف زدہ نرس نے جب دیکھا کہ مسہری پر دوہری پرچھائیاں ہیں تو وہ چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔ لیکن لیٹی نے ہذیان میں بکتے ہوئے ڈاکٹر کے الفاظ سن لیے جو اعترافِ جرم سے کم نہیں تھے۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھا ہوا مسلسل کسی کو گھور رہا تھا اور خوف و دہشت سے لرزتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تم جانتے ہو میں نے جان بوجھ کر جرم نہیں کیا تھا۔ مجھ پر اچانک دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میں کسی صورت میں بھی لیٹی کی محبت کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا تھا ــــ آہ! اس کا معصوم چہرہ، اس کے حسن اور اس کی محبت نے میرے دل پر ایک جنونی کیفیت طاری کر دی تھی ورنہ میں کبھی تمہیں اس پہاڑی پر سے دھکا نہ دیتا۔ میں ہر قیمت پر لیٹی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس وہ اب بھی مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اسے شاید معلوم ہے کہ میں نے تمہیں قتل کیا ہے۔"

یہ واقعہ لیٹی مجھے اپنے کمرے میں سنا رہی تھی کہ اچانک نرس جو ہوش میں آنے کے بعد دوبارہ ڈاکٹر کی دیکھ بھال کر رہی تھی بھاگی ہوئی آئی: "ڈاکٹر گریو کہیں چلا گیا ہے۔ وہ جنون کے عالم میں اٹھا اور بھاگ گیا۔" ہم نے ڈاکٹر کو بہت تلاش کیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا ــــ البتہ دو دن بعد اس کی لاش دریا سے برآمد ہوئی۔